کلام اقبالؒ کے

اعلام و مشاہیر

مصنف
ڈاکٹر سیّد شبیر احمد بخاری

کلام اقبالؒ کے
اعلام و مشاہیر

مصنف
ڈاکٹر سیّد شبیر احمد بخاری

© جملہ حقوق محفوظ۔

نام کتاب	:	کلام اقبال کے اعلام ومشاہیر
مصنف	:	ڈاکٹر سید شبیر احمد بخاری
باراول	:	فروری 2008ء
تعداد	:	500
قیمت	:	450/=
کمپیوٹر کتابت	:	**UCC** کمپیوٹرس، مندرباغ گاؤکدل سرینگر 9419492247,9906491276
سرورق	:	
کتاب ملنے کا پتہ	:	❁ بمنہ ہاوسنگ کالونی، سرینگر، مکان نمبر: ❁ سادات منزل سادات اسٹریٹ لعلپورہ بیروہ۔

فہرست مضامین

دیباچہ	پروفیسر آغا اشرف علی	۵
پیش لفظ	سید شبیر احمد اندرابی	۸

باب اول: اردو زبان وادب کے اعلام ومشاہیر:

۱/	اقبالؔ اور غالبؔ	07
۲/	اقبال اور شبلیؔ وحالیؔ	19
۳/	اقبال اور داغؔ دہلوی	32
۴/	اقبال اور اکبرالہ آبادی	43
۵/	اقبال اور سر عبدالقادر	62
۶/	اقبال اور سید میر حسن	70

باب دوم: فارسی زبان وادب کے اعلام ومشاہیر:

۱/	اقبال اور غنی کاشمیری	81
۲/	اقبال اور حافظ شیرازی	95
۳/	اقبال اور حکیم سنائی	118
۴/	اقبال اور شیخ سعدی شیرازی	136
۵/	اقبال اور مولانا جلال الدین رومی	151
۶/	اقبال اور مرزا عبدالقادر بیدل	164

باب سوم: تاریخ فلسفہ کے اعلام ومشاہیر:

۱/ اقبال اور سید جمال الدین افغانی 174

۲/ اقبال اور امام غزالی 184

۳/ اقبال اور سعید حلیم پاشا 196

۴/ اقبال اور ٹیپو سلطان 205

۵/ اقبال اور نادر شاہ 215

باب چہارم: مذہب کے اعلام ومشاہیر:

۱/ اقبال رسالت مآب میں 225

۲/ اقبال اور میر سید علی ہمدانی 241

۳/ اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیری 252

۴/ اقبال اور گورونانک 268

باب پنجم: کلام اقبال کے مغربی اور دیگر اعلام ومشاہیر:

۱/ کارل مارکس 278

۲/ حکیم نطشے 292

۳/ لینن 303

۴/ مسولینی 313

۵/ آرنلڈ 325

حواشی 337

کتابیات 381

❀❀❀

دیباچہ

مجھے بے حد خوشی ہے کہ اقبال انسٹی ٹیوٹ کے زیرِ نگرانی اعلیٰ سطح پر ریسرچ کی جارہی ہے۔ سید شبیر احمد نے ایک نہایت ہی دلچسپ موضوع چُنا ہے اور اس کتاب کو پڑھ کر پہلی بار مجھے کئی علماء اور مفکرین سے شناسائی حاصل ہوئی۔ اس خوبصورت کام سے میرے مرحوم دوست پروفیسر محمد امین اندرابی صاحب کی قابلیت اور پہنچ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ صاحب موصوف اس کام کو جاری رکھیں گے اور جو نئی راہیں انہوں نے نکالی ہیں، اُن پر مزید غور وفکر کرینگے۔ خود مجھے پہلی بار یہ اندازہ ہوا کہ ایسی محنت کرنے سے کتنی نئی کھڑکیاں اور غالباً کتنے دروازے کھُل جاتے ہیں۔ میں تہہ دِل سے شبیر صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مجھے یہ عزت بخشی کہ گو علامہ اقبالؒ پر میری نظر سرسری اور سطحی ہی ہے مگر آج کون ہے جس کو ان سے والہانہ عقیدت اور دلچسپی نہ ہو۔ خدا سے دعا ہے کہ آپ کا زورِ قلم اور جوہر دکھائے۔ آمین۔

پروفیسر آغا اشرف علی

صوفیہ نشان راجباغ سرینگر کشمیر

پیش لفظ

علامہ اقبال کے فکروفن پر اس قدر کام ہوا ہے کہ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا پہلو بچا ہو جس پر ماہرین اقبالیات نے توجہ نہ کی ہو۔ تاہم اب بھی کچھ ایسے پہلو ہیں جن پر کام کرنے کی گنجائش باقی ہے۔ اسی نوعیت کا ایک موضوع ''کلام اقبال کے اعلام ومشاہیر'' بھی ہے۔ یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے مگر اپنے اساتذہ اور ماہرین اقبالیات کے مشورے پر اس مقالے میں اورایک باب کا اضافہ کر کے کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں جس سے نہ صرف اس موضوع پر اگر چہ چند ایک متفرق مضامین ضرور لکھے گئے ہیں جن میں اقبال اور مشاہیر (مرتبہ طاہر تونسوی) کے مضامین کا ذکر بھی کیا جا سکتا ہے تاہم اس کتاب میں تمام مشاہیر کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے۔

''کلام اقبال کے اعلام ومشاہیر'' جیسے موضوع کو اقبالیات کے مطالعے میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ ان اعلام ومشاہیر کے بارے میں تفصیلات حاصل کرنے میں کلام اقبال کے طالب علموں کو کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ بدقسمتی سے ابھی تک کوئی اقبال انسائیکلوپیڈیا بھی مرتب نہیں ہوا ہے البتہ ملک حسن اختر کا دائرہ معارف اقبال اگر چہ دستیاب ہے تاہم اس کے اختصار کے باعث اس کی افادیت بہت ہی محدود ہے۔

اقبال کے کلام میں بہت سی عظیم المرتبت شخصیات کا ذکر ملتا ہے ان شخصیات کا تعلق زبان وادب، تاریخ، فلسفہ، مذہب اور دیگر شعبوں سے رہا ہے۔ علامہ نے ان شخصیات کا ذکر کسی نہ کسی وجہ سے اپنے کلام میں کیا

ہے۔ علامہ اقبال کچھ شخصیات سے بہت متاثر ہوئے۔ بعض شخصیات سے اقبال کے گہرے مراسم رہے ہیں۔ کئی بلند قامت شخصیات کی غیر معمولی شعری صلاحیتوں علم وفضل اور نا قابل فراموش خدمات کے پیش نظر علامہ نے انہیں اپنی نظموں میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی شخصیات کے سانحہء ارتحال پر انہوں نے پر درد مرثیے لکھے ہیں۔ اور بعض پر قطعات تاریخ بھی کہے ہیں۔ بعض ایسی شخصیات کا ذکر بھی کلام اقبال میں ملتا ہے جنہوں نے اقبال کی شخصیت کے تعمیر وتشکیل میں ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ غرض ان شخصیات کو اقبال نے اپنی شاعری، خطوط اور دیگر نثری تحریروں میں وہ مقام عطا کیا ہے جسکے وہ یقیناً مستحق ہیں۔

ان اعلام ومشاہیر کو پانچ مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

پہلا باب: اردو زبان وادب کے اعلام ومشاہیر: اردو زبان وادب کے اعلام مشاہیر میں غالبؔ، شبلیؔ وحالیؔ، داغؔ، سرعبدالقادرؔ، اکبرالہٰ آبادی اور سید میر حسنؔ کا ذکر کیا گیا ہے۔ اقبال نے غالبؔ کی عظمت بیان کرتے ہوئے ان کے اعجازِ سخن کا اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح نظم شبلیؔ وحالیؔ میں دونوں بزرگ شخصیات کا ذکر نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اقبال نے اپنے استادِ مشفق سید میر حسنؔ اور داغؔ دہلویؔ کا ذکر بھی بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ اکبرالہ آبادیؔ اور اقبالؔ کے درمیان لکھے گئے خطوط سے دونوں کے درمیانی روابط اور اقبال کی اس عقیدت کا ذکر ملتا ہے جو اقبال اکبرالہ آبادیؔ سے رکھتے تھے۔ سرعبدالقادر اقبالؔ کے بزرگترین معاصرین میں شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا ذکر اقبالؔ نے 'بانگ دِرا کی نظم'' سرعبدالقادرؔ کے نام'' میں نہایت ہی عقیدت سے کیا ہے۔

دوسرا باب: فارسی زبان وادب کے مشاہیر: دوسرے باب میں فارسی زبان وادب کے جن اعلام ومشاہیر کا ذکر کیا گیا ہے ان میں حکیم سنائیؔ، غنی کاشمیریؔ، شیخ سعدی شیرازیؔ، جلال الدینؔ رومی، عبدالقادر بیدلؔ اور حافظ شیرازیؔ شامل ہیں۔ چنانچہ حافظ شیرازیؔ کے فن کی اقبالؔ بڑی قدر کرتے تھے۔ غنی کاشمیری سے وہ متاثر تھے۔ شیخ سعدیؔ اور عبدالقادر بیدلؔ کے علاوہ حکیم سنائیؔ کا ذکر بھی نہایت ہی احترام اور عقیدت سے ملتا ہے۔ پیر رومی کو اقبالؔ اپنا مرُشد تصوّر کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؔ نے جاوید نامہ میں افلاک کی سیر پیر رومی کی رہنمائی میں ہی کی ہے۔ ان شخصیات کا ذکر اقبالؔ کے فارسی اور اُردو کلام میں کافی عقیدت سے ملتا ہے۔

تیسرا باب: تاریخ اور فلسفہ کے مشاہیر: تیسرے باب میں جن اعلام ومشاہیر کا ذکر کیا گیا ہے ان کا تعلق تاریخ اور فلسفہ سے ہے ان میں سید جمال الدین افغانی، امام غزالیؔ، سعید حلیم پاشا اور ٹیپو سلطان شہید کی عظیم المرتبت شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے۔

چوتھا باب: مذہبی اعلام ومشاہیر: مذہبی اعلام ومشاہیر میں اقبال کے یہاں عقیدت اور احترام کی انتہا بارگاہِ رسالتمآبؐ میں ہی ملتی ہے۔ حضور اکرم ﷺ کی مقدس ذات سے اقبال کو بے پناہ عقیدت اور والہانہ عشق تھا۔ اس وجہ سے اقبال کے تمام مجموعوں میں اس عقیدت اور والہانہ عشق کا اظہار ملتا ہے۔ اس باب میں جن دیگر عظیم شخصیات کا ذکر کیا گیا ہے ان میں میر سید علی ہمدانیؒ، مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے علاوہ سکھ مذہب کے بانی گرونانک بھی شامل ہیں۔ میر سید علی ہمدانی کو اقبال نے جنت الفردوس میں دکھا کر ان کی عظمت بیان کی ہے۔ اسی طرح مولانا انور شاہ کا ذکر بھی اقبال

کے خطوط میں نہایت ہی احترام سے ملتا ہے۔ گرونا نک کے تصورِ توحید کو اقبال نے اپنی شاعری میں پیش کر کے انکی عظمت بیان کی ہے۔

پانچواں باب: کلام اقبال کے مغربی و دیگر اعلام و مشاہیر: اس باب میں جن اعلام و مشاہیر کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں کارل مارکس، حکیم نطشے، مسولینی اور پروفیسر ٹامس آرنلڈ شامل ہیں۔ علامہ اقبال نے ان عظیم شخصیات کا ذکر کر کے اُن کے مرتبے کا تعیّن کیا ہے۔ اقبال نے مارکسؔ، لیننؔ اور حکیم نطشےؔ کے فلسفے کا ذکر کرنے کے علاوہ مسولینؔی پر بھی نظمیں لکھیں ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے اُستاد مشفق تھامس آرنلڈ کا ذکر بھی نہایت عقیدت اور احترام سے کیا ہے۔

اس باب کے بعد حواشی میں حوالہ جات کو درج کیا گیا ہے۔ اس مقالے کو مکمل کرنے کے دوران جن کتابوں اور رسائل سے استفادہ کیا گیا ان کو کتابیات کے تحت آخر پر درج کیا گیا ہے۔

''کلام اقبال کے اعلام و مشاہیر'' کے اس موضوع کو میں نے سات سال پہلے اپنے پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالے کے لیے منتخب کیا ہے اور یہ مقالہ میں نے اپنے استادِ محترم پروفیسر محمد امین اندرابی کی نگرانی میں لکھا ہے۔ جب کشمیر یونیورسٹی کو یہ مقالہ پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے میں نے پیش کیا، تب سے میرے دوستوں، میرے اساتذہ کی خواہش رہی کہ اس مقالے کو شائع کیا جائے۔ مگر اپنی ذاتی مجبوریوں اور مصروفیات کی وجہ سے آج تک میں اس کو شائع نہ کر سکا۔

شائع کرنے سے پہلے میں نے اس مقالے میں نظر ثانی کی اور اس کے

علاوہ اس میں چند اساتذہ خاص کر جواہر لعل یونیورسٹی کے پروفیسر محترم ڈاکٹر شارب ردولوی صاحب کے مشورے پر ایک اور باب کا اضافہ کیا گیا۔ کلام اقبال کے مغربی و دیگر اعلام ومشاہیر عنوان کے تحت یہ باب اس مقالے میں درج کیا ہے۔ اس مقالے میں کتابت اور دوسری قسم کی جو غلطیاں رہ گئیں تھیں ان کو دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ تاہم پھر بھی اگر کہیں کوئی کوتاہی یا غلطی رہی ہوگی اس کو آئندہ دور کرنے کی بھی کوشش کی جائے گی۔

اس مقالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مجھے کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ تحقیق کا کام بڑا ہی دِقت طلب کام ہے اور زیرِ نظر موضوع کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے زیادہ سے زیادہ وقت کی ضرورت تھی لیکن ایک مخصوص اور مقررہ وقت میں اس کی تکمیل میرے لیے عدم اطمینان کا باعث ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ نامساعد حالات کی وجہ سے میری تشویش میں روز بروز اضافہ ہوتا رہا مگر اپنی ہمت، محنت اور اپنے اساتذہ کرام کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی بدولت میں نے اپنے کام کو اس مرحلے تک پہنچایا۔ کوئی بھی شخص تحقیق کے معاملے میں مکمل ہونے کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اس لیے اس مقالے میں کوتاہیاں اور خامیاں رہ گئی ہونگی۔ جہاں تک اس مقالے کے لیے مواد کا سوال ہے، زیادہ تر مواد مجھے اقبال انسٹی ٹیوٹ کی سیمینار لائبریری اور کشمیر یونیورسٹی کی اقبال لائبریری سے ہی دستیاب ہوا۔ ریاست سے باہر بھی کچھ علم دوست حضرات نے میری مدد فرمائی جن کا میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔

میں اپنے نگران پروفیسر محمد امین اندرابی کا تہہ دِل سے ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی نگرانی میں مجھ سے یہ کام کرایا۔ اُن کی صحبت میں رہ کر میں نے اُن میں ایک مکمل اور مشفق استاد پایا۔ میرے کام کو مکمل کرنے میں انہوں نے بڑی دلچسپی لی۔

میں اپنے محترم اساتذہ پروفیسر بشیر احمد نحوی اور محترم تسکینہ فاضل کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے نہ صرف میری مدد کی بلکہ میری نگرانی بھی کرتے رہے۔ ان کی مدد سے میرے مشکل راہ آسان ہوگئی۔ میں اقبال انسٹی ٹیوٹ کے باقی تدریسی اور غیر تدریسی عملے خاص کر عبدالحمید اور عابد حسین قادری کے علاوہ عبداللہ خاور صاحب کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں۔ خاور صاحب نے لائبریری سے مجھے کتابیں فراہم کیں اور میرے کام میں میری بھرپور مدد فرمائی۔

میں جواہر لعل یونیورسٹی کے پروفیسر محترم ڈاکٹر شارب ردولوی صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اس مقالے کی چن کوتاہیوں اور کمزوریوں کو دور کرنے میں مشورہ دیا اور مقالہ کو شائع کرنے میں میری حوصلہ افزائی کی۔ اس کے علاوہ کشمیر یونیورسٹی سے وابستہ یا یونیورسٹی سے باہر جن حضرات نے کسی نہ کسی طرح میری حوصلہ افزائی کی ان کا بھی میں شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ان اساتذہ کرام میں وادی کے مشہور ومعروف ماہرِ تعلیمات آغا اشرف علی صاحب کے علاوہ شعبۂ اردو کے پروفیسر قدوس جاوید صاحب، ڈاکٹر نذیر احمد ملک م، ڈاکٹر مجید مُضمر، شعبہ انگریزی کے پروفیسر غلام رسول ملک، کشمیری کے پروفیسر مرغوب بانہالی صاحب اور پروفیسر عبدالواحد قریشی Dean Acadamic بھی شامل ہیں۔

میں اپنے والدین اور محترمہ رفعت رومی کا بھی شکر گزار ہوں کہ ان کو میری وجہ سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ میرے اس کام کو مکمل کرنے میں برابر شریک ہیں۔

سو حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔

سید شبیر احمد

اردو زبان وادب کے اعلام ومشاہیر

۱/۱ اقبالؔ اور غالبؔ
۱/۲ اقبال اور شبلیؔ و حالیؔ
۱/۳ اقبال اور داغؔ دہلوی
۱/۴ اقبال اور اکبر الہ آبادی
۱/۵ اقبال اور سر عبدالقادر
۱/۶ اقبال اور سید میر حسن

علامہ اقبالؒ اور مرزا اسداللہ خان غالبؔ

مرزا اسداللہ خان غالب اُردو زبان و ادب کی ایک عظیم المرشخصیت گزری ہے۔ان کا اصلی نام مرزا اسداللہ بیگ خان تھا۔مرزا نوشہ عرف اور نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خان نظام جنگ خطاب باپ کا نام مرزا عبداللہ بیگ تھا۔جن کی شادی آگرہ میں مرزا غلام حسین خان کی بیٹی عزت النساء بیگم سے ہوئی۔ان ہی کے بطن سے غالب پیدا ہوئے۔مرزا غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ عیسوی) کو بمقام آگرہ پیدا ہوئے (۱)۔بچپن میں یتیم ہوئے اور چچا نصراللہ خان نے پرورش کی جب غالبؔ آٹھ سال کے ہوئے تو چچا بھی فوت ہوئے اور نواب احمد بخش نے مرزا کے خاندان کے لئے انگریزوں سے وظیفہ مقرر کرا دیا۔یہی وجہ ہے کہ ساری عمر ان کے ثناخواں رہے۔مرزا نے ابتدائی تعلیم آگرہ کے مشہور عالم مولوی محمد معظم سے حاصل کی۔خوش قسمتی سے ۱۸۱۱ء میں جب ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی ملا عبدالصمد نامی ایک ایرانی عالم جو نو مسلم تھا بسلسلہ سیر و سیاحت وارد آگرہ ہوا۔غالب نے دو سال تک اس سے تعلیم حاصل کی مولانا الطاف حسین حالی لکھتے ہیں:

> ''اگرچہ کبھی کبھی مرزا کی زبان سے یہ بھی سنا گیا ہے کہ مجھ کو مبداءِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔عبدالصمد ایک فرضی نام ہے چونکہ لوگ مجھے بے استاد کہتے تھے اس لئے ان کا منہ بند کرنے کے لئے میں نے ایک فرضی نام گھڑ لیا مگر اس میں شک نہیں کہ عبدالصمد فی الواقع ایک فارسی نژاد آدمی تھا اور مرزا نے اس سے کم و بیش فارسی زبان سیکھی تھی۔'' (۲)

مرزا کی شاعری کے بارے میں مولانا حالی لکھتے ہیں:

"مرزا کی شاعری اکتسابی نہ تھی بلکہ ان کی حالت پر غور کرنے سے
صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ملکہ ان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا تھا۔
انہوں نے جیسا کہ اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں تصریح کی ہے۔
گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔" (۳)

مرزا کی شادی ۱۳ر سال کی عمر میں نواب احمد بخش خان کے چھوٹے بھائی نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی امراؤ بیگم سے ہوئی اور ۱۸۱۲ء میں انہوں نے اپنے آبائی وطن کو خیر باد کہکر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ مرزا کا کوئی ذاتی مکان نہ تھا وہ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے اور آخر عمر حکیم محمود خان کے مکان کے قریب رہتے تھے۔

اگر چہ فراخدالی کی وجہ سے وہ ہمیشہ تنگ دست تھے مگر معاش کی طرف سے وہ کبھی محتاج نہیں رہے۔

غالبؔ کی شاعری اُردو ادب میں ایک بلند مقام رکھتی ہے انکی اُردو شاعری فارسی کی طرح اول اول میں بیدل وغیرہ کے رنگ میں تھی۔ چونکہ وہ طرزِ عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ اس وجہ سے ان کے احباب نے ان کو مجبور کیا اور آخر ان کو اپنا رنگ تبدیل کرنا پڑا۔ اگر چہ اس رنگ کے چھوڑ دینے پر بھی ان کی شاعری نہایت بلیغ رہی مگر پھر بھی وہ پہلے کے مقابلے میں بہت آسان ہوگئی۔ معنی آفرینی، حسن بیان، لطافت خیال، ندرتِ بیان غالبؔ کی خاص خصوصیات میں شامل ہیں۔

غالبؔ کی اہم تصانیف میں دیوان اُردو، اُردوئے معلیٰ، عود ہندی، لطائف غیبی، تیغ تیز، قاطع برہان، درفش کاویانی، سبد چین، دشنوئے، پنچ

آہنگ، مہر نیمروز، کلیات نظم فارسی شامل ہیں۔

مرزا غالبؔ نے ۳ رذی قعدہ ۱۲۸۵ھ بمطابق ۱۵ رفروری ۱۸۶۹ء کو وفات پائی۔ نواب الٰہی بخش معروف کے خاندانی قبرستان بستی نظام الدین میں دفن ہوئے۔ (۴)

مرزا غالبؔ نے نہ صرف اُردو ادب اور شاعری میں کمال حاصل کیا بلکہ فارسی شاعری میں بھی وہ ایک انفرادیت کے مالک ہیں اگرچہ غالبؔ اُردو شاعری ہی کی وجہ سے مشہور ہوئے مگر خود انہیں اپنی فارسی شاعری پر ناز تھا:

فارسی بین تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است

دیگر مشاہیر کی طرح علامہ اقبالؔ نے غالبؔ کی عظمت کا اعتراف اپنے اُردو اور فارسی کلام میں کیا ہے جسکی وجہ اقبالؔ کی غالب مرحوم سے عقیدت اور احترام ہی ہوسکتی ہے۔ علامہ اقبالؔ نے ''بانگ دار'' میں ''مرزا غالبؔ'' کے عنوان سے ایک طویل نظم لکھکر ان کی شعری خوبیوں کو سراہا ہے۔ اور ان کی عظمت کا بھی اعتراف کیا ہے۔ علامہ اقبالؔ کو کلام غالب اتنا پسند تھا کہ بقولِ صابر کلوری سفر میں ان کے ساتھ دو کتابیں رہا کرتی تھیں اور وہ ہمیشہ اپنے بستر پر یہ دو کتابیں رکھا کرتے تھے ایک مثنوی مولانا روم اور دوسری دیوانِ غالب۔ (۵)

اقبالؔ کو جہاں غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف رہا ہے وہاں وہ غالب کی شاعری کے فکری عناصر کے بھی قائل تھے چنانچہ وہ غالب کی شاعری کو جدید شاعری کا پیش خیمہ تصوّر کرتے تھے اور ان کی مجتہدانہ

عظمت کے قائل تھے۔ اقبالؔ کا اپنا کارنامہ بھی اس ضمن میں کافی وقیع ہے انہوں نے فلسفے کے دقیق پیچیدہ اور خشک مسائل کو شعر و ادب کا موضوع بنا کر تازہ اور شگفتہ بنا دیا۔ اور اس معاملے میں کم از کم اُردو کی حد تک وہ صرف غالبؔ ہی سے رہنمائی حاصل کر سکتے تھے۔ اس بات کو ڈاکٹر عبدالحق یوں بیان کرتے ہیں:

''غالبؔ صحیح معنوں میں اقبالؔ کے پیش رو ہیں۔ فکر و اسلوب کی یہی میراث تھی، جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبالؔ نے بڑی عمارت تیار کی اور زبان و اسلوب کو اوج ثریا پر پہنچا دیا۔ اُردو کے تمام شاعروں میں صرف غالبؔ ہی اقبالؔ کی رہنمائی کر سکے۔'' (۶)

علامہ اقبالؔ غالب کی اُردو شاعری کے علاوہ ان کی فارسی شاعری سے بھی خاصے متاثر تھے اور غالباً اس سے مستفید بھی ہوئے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ غالبؔ کے فارسی کلام کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''میری رائے میں مرزا غالبؔ کا فارسی کلام شاید مسلمانان ہند کی جانب سے وہ واحد پیشکش ہے جس سے ملت کے عام ادبی سرمائے میں کوئی مستقل اضافہ ہوا ہے۔ غالبؔ یقیناً ان شعراء میں سے ہیں جن کا ذہن اور تخیل انہیں مذہب اور قومیت کے تنگ حدود سے بالاتر مقام عطا کرتا ہے غالبؔ شناسی کا حق ادا ہونا باقی ہے۔'' (۷)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''بیدل اور غالبؔ نے مجھے یہ سکھایا کہ مغربی شاعری کی اقدار اپنے اندر سمو لینے کے باوجود اپنے جذبے اور اظہار میں مشرقیت کی روح کیسے زندہ رکھ سکوں۔'' (۸)

غالبؔ پر علامہ کی پرُ درد نظم میں علامہ اقبالؔ غالبؔ کے اسلوب اور پیرائیہ بیان کی دلکشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شاہد مضمون تصدّق ہے تیرے انداز پر
خندہ زن ہے غنچہء دلی گل شیراز پر
آہ! تو اُجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے
گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا خوابیدہ ہے

یہاں شیراز کے عظیم شعراء سعدیؔ، حافظؔ اور عرفیؔ سے بھی غالبؔ کو بلند مقام عطا کیا گیا ہے اور اگر کوئی شاعر غالب کے برابر ہے تو وہ گوئٹے ہے جو گلشن ویمر میں خوابیدہ ہے۔ اس نظم کے تجزیہ میں ایک اہم پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:

''غالبؔ کی اہمیت اقبالؔ کی نظر میں اسلئے بھی ہے کہ غالبؔ ایک تہذیب کا نمائندہ اور ایک عظیم فطری روایت کا وارث و ترجمان بلکہ آخری وارث و ترجمان تھا جس کے بعد جہاں آباد یعنی دہلی کے بام و در سراپا نالہء خاموش بن گئے گویا غالبؔ کی قدر و قیمت اس لئے بھی ہے کہ وہ ان تہذیبی و فکری قدروں کا شناسا اور معیار شناس تھا۔ جن کی معیار شناسی خود اقبالؔ کے فکر و فن کا امتیاز خاص ہے۔'' (۹)

اقبالؔ کے دل میں غالبؔ کی عظمت کا احساس ہمیشہ قائم رہا۔ ''بانگ دار'' میں غالب کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اس ضمن مین ڈاکٹر سید عبداللہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''ابتدائی حالت میں اقبالؔ کو غالب کی شاعری میں معنی کے بڑے

بڑے طلسمات نظر آئے۔ ان کا اظہار ان کی نظم ''مرزا غالب'' (مطبوعہ بانگ دار) سے ہوتا ہے جس کے ہر شعر میں اقبالؔ کو غالبؔ شناسی اور غالب پسندی کا واضح ثبوت مہیا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اقبالؔ کے دل میں غالبؔ کے افکار کی عزت کسی رسم عام یا روش عام کی بناء پر نہ تھی بلکہ اس سبب سے تھی کہ انہیں غالب کی شاعری میں ایک ایسا بڑا افنکار نظر آیا جس کے فن کے بعض پہلو خود ان کے اپنے رجحانات ہم رنگ تھے۔ انہیں مرزا غالبؔ کی شخصیت اور فن میں اپنی ہی طبعی اور ذہنی خصوصیات کی جھلک نظر آتی۔'' (۱۰)

اقبالؔ، مرزا غالبؔ کے تخیل کی پرواز اور ان کی فکر کی بلندی کے معترف تھے۔ چنانچہ غالبؔ کے کلام میں اس وصف کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

فکر انسان پر تیری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تا کجا
تھا سراپا روح تو بزم سخن پیکر تیرا
زیب محفل بھی رہا محفل سے پنہاں بھی رہا

غالبؔ اور اقبالؔ کے مماثلتی پہلو کا ذکر کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''غالبؔ کی شاعری کو اقبالؔ کی منزل اول قرار دیا جاسکتا ہے...... غالبؔ کی شاعری کو اقبالؔ کی شاعری سے وہی نسبت ہے جو نمود سحر کو طلوع آفتاب سے ہوتی ہے۔'' (۱۱)

قوت متخیلہ کے علاوہ قدرت نے غالبؔ کو شوخی تحریر اور غور و فکر کی طاقت دی ہے اور یہی وجہ ہے کہ غالب اپنے کلام میں نئے نئے مضامین باندھنے میں

مہارت رکھتے ہیں اوران کی شوخی اورتحریر سے کلام میں زندگی پائی جاتی ہے۔

زندگی مضمر ہے تیری شوخی تحریر میں
تاب گویائی سے جنبش ہے لب تصویر میں
محفل ہستی تیری بربط سے سرمایہ دار
جسطرح ندی کے نغموں سے سکوت کوہسار

غالبؔ کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبالؔ نے ان کے تخیل، محاکات اور اندازِ بیان کی دلکشی کا ذکر کیا ہے۔ کلام غالب میں شیرینی اس قدر نظر آتی ہے کہ غالبؔ کے مقابلے میں حافظ اور سعدی کا رنگ پھیکا نظر آتا ہے۔ غالبؔ کے اعجازِ سخن کا اعتراف اس طرح کیا گیا ہے:

نطق کو سو ناز ہیں تیرے لب اعجاز پر
محو حیرت ہے ثریا رفعت پرواز پر

غالبؔ کوخراج عقیدت ادا کرتے ہوئے علامہ ایک موثر انداز میں لکھتے ہیں:

ہائے! اب کیا ہو گئی ہندوستان کی سرزمین
آہ! اے نظارہ آموز نگاہ نکتہ چین

علامہ اقبالؔ نے اُردو زبان وادب کی ان عظیم شخصیات کی کمی کو بُری طرح محسوس کیا اور ایسی شخصیات کا ہونا لازمی قرار دیتے ہیں:

گیسوئے اُردو ابھی منتِ پزیر شانہ ہے
شمع یہ سودائی دل سوزی پروانہ ہے

علامہؔ نے اس نظم میں مرزا غالب کی زندگی اور سرزمین دہلی پر پُر درد انداز میں اپنے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ غالب کی عظمت کے اعتراف

کے ساتھ ساتھ وہ سرزمین دہلی سے یوں مخاطب ہیں:

اے جہاں آباد اے گہوارہ علم و ہنر
ہیں سراپا نالۂ خاموش تیرے بام و در
ذرے ذرے میں تیرے خوابیدہ ہیں شمس و قمر
یوں تو پوشیدہ ہیں تیرے خاک میں لاکھوں گہر

دہلی ہمیشہ سے علم و ہنر کا مرکز رہی ہے اور اس میں بہت ساری عظیم شخصیات وفن ہیں۔ علاؔمہ نے اس مرثیہ میں نہ صرف غالبؔ پر بلکہ دلی کی سرزمین پر بھی مرثیہ خوانی کی ہے۔ اس لحاظ سے حالی کا مرثیہ حکیم محمود خان بھی کافی اہمیت کا حامل ہے جسمیں حاؔلی نے حکیم محمود خان پر لکھے گئے مرثیہ میں پوری قوم کا ماتم کیا ہے۔ یہ مرثیہ بظاہر تو حکیم محمود خان پر لکھا گیا ہے مگر حقیقت میں یہ مرثیہ قوم کی تہذیب وثقافت اور دہلی کی عظمت رفتہ کا مرثیہ ہے۔

ظاہر اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا نوحہ ہے ساری قوم کا
پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کے نہ سم
کوئی یاں رنگین ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کی اقبال کا ماتم رہا

مذکورہ مرثیہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر نصرت اندرابی رقمطراز ہیں:

''حالؔی کا مرثیہ حکیم محمود خان بھی اس لحاظ سے اہم ہے۔ اسمیں حالؔی نے دلی کی عظمت کو تاریخی اور سماجی تناظر میں پیش کیا ہے۔ حکیم محمود خان کی موت کو موضوع بنا کر وہ مسلمانوں کے نشیب و فراز کی کہانی ترکی سے لے کر سمرقند اور بخارا سے لیکر دلی تک پھیلا دیتے ہیں۔ یہ مرثیہ ایک شخص کا مرثیہ نہیں بلکہ مغل تہذیب اور دلی کی عظمت رفتہ کا مرثیہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالؔی قومی مرثیہ گو تھے چنانچہ شخصی مرثیوں میں کبھی ذاتی درد و غم کے ساتھ قومی زیاں اور محرومی کا احساس شامل ہوتا ہے۔ مرثیہ محمود خان کا بیشتر حصّہ دلی کی عظمت رفتہ کا مرثیہ ہے۔'' (۱۲)

اقبالؔ نے بھی حالؔی کی طرح دلی کی سرزمین پر مرثیہ کہتے وقت غالب کی عظمت کا اظہار کیا ہے۔ علامہ دلی کی سرزمین کو مخاطب ہو کر کہتے ہیں:

دفن تجھ میں کوئی فخر روز گار ایسا بھی ہے
تجھ میں پنہاں کوئی موتی آبدار ایسا بھی ہے

ان سوالوں میں دراصل غالبؔ کی عظمت کا اعتراف ہے اور ان کے تیئں خلوص و عقیدت کا راز پوشیدہ ہے۔

اقبالؔ نے غالبؔ کی عظمت کا اعتراف نہ صرف اپنے اُردو کلام میں کیا ہے بلکہ فارسی کلام میں بھی کیا ہے اس بارے میں احسن عبدالشکور لکھتے ہیں:

''پیام مشرق '' میں مرزا غالبؔ کو رومی بائرن اور بروَننگ کی صف میں ایک منفرد مقام دیا ہے۔ یہ عقیدت مندی آخری دور کے کلام میں بھی موجود ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں غالبؔ کو ان مضطرب روحوں کے ساتھ دکھایا ہے جو مقام کی پابند نہیں ہوسکیں اور جن کے سوز دوام نے انہیں گردش جاودان کا خوگر بنا دیا ہے۔'' (۱۳)

علامہ اقبالؔ نے غالبؔ کا ذکر ابتداء سے آخر تک کافی احترام سے کیا ہے۔ ''جاوید نامہ'' میں فلک مشتری پر اقبالؔ کی ملاقات غالبؔ، منصور حلاج اور قرۃ العین سے ہوتی ہے۔ اس بات کا ذکر علامہؔ یوں کرتے ہیں:

غالبؔ و حلاج و خاتون عجم
شور ہا افگندہ در جان حرم
اس نواہا روح را بخشد ثبات
گرمی او از درون کائنات

علامہؔ اسی نظم میں ان تینوں ارواح جلیلہ کا ذکر یوں کرتے ہیں:

پیش خود دیدم سہ روح پا کباز
آتش اندر سینہ شاں گیتی گداز!
در بر شان حلہ ہائے لالہ گوں
چہرہ ہا رخشندہ از سوز دروں!
در تب و تاب زہنگام است
از شراب نغمہ ہائے خویش مست!

ان اشعار اور ''جاوید نامہ'' میں غالبؔ کے متعلق دوسرے اشعار ان سے سوال و جواب اور ان کی ایک فارسی غزل کے منتخب اشعار کی نقل سے واضح ہوتا ہے کہ اُردو شعراء میں اقبال سب سے زیادہ غالبؔ سے متاثر تھے۔ (۱۴)

''شعراء'' موضوع کے تحت ''پیام مشرق'' میں بھی علامہ اقبالؔ نے جہاں برونگ، بائرن اور رومی کا ذکر کیا ہے وہاں غالبؔ کو ایک منفرد مقام عطا کر کے ان کی عظمت ظاہر کی ہے۔ یہ ان کے تئیں علامہؔ کی

خاص عقیدت کا اظہار ہے چنانچہ زندگی کو پُر کیف بنانے کے سوال کے جوابات ان حضرات نے اس طرح دیے ہیں:

براوننگ

بے پشت بود بادہ سرِ جوش زندگی
آب از خضر بگیرم و در ساغر افگنم

بائرن

از منت خضر نتوان کرد سینہ داغ
آب از جگر بگیرم و در ساغر افگنم

غالبؔ

"تا بادہ تلخ تر شود سینہ ریش تر
بگدازم آبگینہ و در ساغر افگنم"

رومی

آمیزش کجا گہر پاک او کجا
از تاک بادہ گیرم و در ساغر افگنم (۱۵)

❀❀❀

علامہ اقبالؔ اور مولانا حالؔی و مولانا شبلؔی

مولانا الطاف حسین حالؔی اپنے بیان کے مطابق تقریباً ۱۸۳۷ء میں پانی پت میں پیدا ہوئے[1]۔قیام دہلی کے زمانے میں مرزا اسداللہ خاںؔ کی خدمت میں اکثر حاضر ہونے موقع ملا۔اوران کے بعض قصیدے انہیں سے سبقاً پڑھتے رہے اور جب حالؔی نے اپنی چند اُردو فارسی غزلیں بنظر اصلاح پیش کیں تو غالبؔ نے کہا اگر چہ میں کسی کو فکر شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے۔(۲)

حالؔی نہایت مخلص اور دردمند مسلمان تھے۔ انہوں نے سرسیدؔ کی فرمائش پر ۱۸۷۹ء میں مسدس لکھا۔ اور یہ کافی مقبول اور مشہور ہوا۔ ۱۸۸۴ء میں حیات سعدی اور ۱۸۹۳ء میں مقدمہ شعروشاعری شائع ہوئی۔یادگارِ غالب ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی جو غالبؔ کے کلام اور سوانح

عمری پر تبصرہ ہے۔ یادگارِ غالب نے غالبؔ کی عظمت اور منزلت لوگوں کے دلوں میں بٹھادی اور ان کے کلام کے مختلف پہلوؤں پر اس خوبی سے تبصرہ کیا کہ اشعار کی ظاہری اور باطنی خوبیاں واضح ہوگئیں۔ان کی تصویر اس طرح کھینچی کہ ان کی شخصیت جیتی جاگتی سامنے آگئی۔

حالیؔ کی سب سے بڑی تصنیف حیات جاوید ۱۹۰۱ء میں شائع ہوئی اسمیں سرسیدؔ کے حالات زندگی اور کارناموں کا ذکر ہی نہیں ملتا بلکہ ایک اعتبار سے یہ مسلمانوں کی تقریباً ایک صدی کی تہذیبی تاریخ ہےاس میں اس زمانے کی معاشرت، تعلیم، مذہب، سیاسیات اور زبان وغیرہ کے مسائل زیر بحث آگئے ہیں۔ اُردو میں سوانح نگاری پر اس پایہ کی کوئی کتاب اب تک نہیں لکھی گئی۔ (۳)

حالیؔ نے مرثیے بھی لکھے جن میں غالبؔ اور حکیم محمود خاںؔ کے مرثیے کافی اہم ہیں۔مرثیے کے علاوہ غزل میں بھی ایک خاص مقام حاصل کر لیا۔غزل کو انہوں نے حقیقت سے ہم آہنگ کیا۔اسے سنجیدہ لہجہ دیا اور قومی و اجتماعی شاعری کی بنیاد رکھی (۴)۔جدید اُردو نثر میں بھی حالیؔ کا ایک بڑا مقام ہے۔بقولِ نواب عماد الملک مولوی (سید حسین بلگرامی)

> ’’ہماری زبانوں میں نثر تھی ہی نہیں وہ ایک قسم کی شاعری اور نیم شاعری تھی۔حالیؔ نے سب سے پہلے متین اور حقیقت کی ترجمان نثر کی بُنیاد ڈالی جو ہر قسم کے علمی و ادبی اور تنقیدی مضامین ادا کرنے کے لئے موزوں ہے۔‘‘ (۵)

۱۹۰۴ء میں حالؔی کو شمس العماء کا خطاب ملا اور ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو اس دُنیا سے رخصت ہوئے۔(۶)

مولانا حالؔی کے علاوہ مولانا شبلی نعمانؔی بھی اُردو زبان و ادب کی ایک عظیم شخصیت گزری ہے۔ شبلؔی ایک ہی وقت منطقی، فلسفی، مورخ، متکلم، ادیب، شاعر، نقاد، انشا پرداز مصنف لیکچرر، استاد، مدیر، سیاستدان اور عالم دین تھے۔ ابتدائی تحریروں میں مولانا شبلؔی ہی لکھتے تھے بعد کو صرف شبلؔی کر دیا اور نام کے ساتھ نعمانی لکھنے لگے۔(۷)

مولانا شبلی کی ولادت ذیقعدہ ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں عین اس ہنگامہ خیز زمانہ میں ہوئی جس دن اعظم گڑھ کے باغیوں کی ایک جماعت نے ڈسٹرکٹ جیل کے پھاٹک کو توڑ ڈالا اور بہت سے قیدیوں کو نکال لے گئے۔(۸)

مولانا کے والد کا نام شیخ حبیب اللہ تھا وہ الہ آباد ہائی کورٹ میں وکیل تھے اور اس پیشہ میں ان کو ایسا فروغ ہوا کہ ضلع کے چوٹی کے وکیلوں میں سمجھے جاتے تھے۔(۹)

شبلی اپنے تمام بھائیوں میں بڑے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت قدیم طرز پر ہوئی۔ اساتذہ میں سب سے زیادہ مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی اور فیض الحسن سہارنپوری سے متاثر ہوئے۔

شبلی کی زندگی کے اہم واقعات میں اعظم گڑھ میں ایک نیشنل سکول کا قیام (۱۸۸۳ء) ندوۃ العلماء کی تحریک اور ترقی، حیدر آباد میں قیام ۱۹۰۱ء

اور سر رشتہ علوم وفنون اور انجمن ترقی اردو کی نظامت جنوری ۱۹۰۳ء، دارالعلوم ندوۃ کی معتمدی ۱۹۰۵ء تا ۱۹۱۳ء الندوہ یعنی ندوۃ العلماء کے رسالے کی ادارت ۱۹۰۴ء تا ۱۹۱۲ء، تمغہ مجیدی کا حاصل ہونا۔ پاؤں کے زخمی ہونے کا حادثہ ۱۷ مئی ۱۹۰۷ء قانون وقف علی الاولاد کی تجویز و ترتیب اور دوسری بہت سے تعلیمی اور سیاسی کاموں کے علاوہ دارالمصنفین کی تجویز جس کے اکثر مراحل طے ہو چکے تھے (۱۰) کہ آخر ۱۸ نومبر ۱۹۱۴ء مطابق ۲۸ ذی الحجہ ۱۳۳۲ھ کی صبح کو ساڑھے پانچ بجے بروزِ چہار شنبہ روح نے آخری سانس لی۔ عزیزوں اور شاگردوں میں جو پاس کھڑے تھے کہرام برپا ہو گیا۔ (۱۱)

۱۹۰۴ء سے ۱۹۱۴ء تک کا زمانہ اگرچہ شبلی کے خاص اطمینان کا زمانہ نہ تھا مگر تصنیفی لحاظ سے یہ دور کافی اہم تھا۔ اس دور میں انہوں نے فارسی شاعری کی ایک مبسوط تاریخ شعر العجم کے نام سے پانچ جلدوں میں مرتب کی۔

اردو نثر میں شبلی کو بلند مقام حاصل ہے ان کی نثر میں دبستان سرسید کی نثر کی اکثر خصوصیات پائی جاتی ہیں [مثلاً سادگی، بے تکلفی، بے ساختہ پن، استدلال، منطقیت وغیرہ] مگر ان کے نثری اسلوب کی اہمیت دراصل ان کے چند انفرادی خصائص کے سبب ہے۔ ان کی تحریروں میں بڑا اعتماد علی النفس اور وثوق و یقین پایا جاتا ہے۔ اعجاز ان کی نثر کا وصف خاص ہے مگر انکی عبارتوں کے علمی وقار اور فاضلانہ رعب داب سے قاری

پر بڑا اثر ہوتا ہے ان کے کلام میں جوش بھی پایا جاتا ہے۔ انکی نثر میں ان کی کئی صورتیں موجود ہیں۔ ان میں اہم استعارے کا استعمال ہے جن کے ذریعے ان کے بیان میں مبالغے کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ (۱۲)

سر سید کی طرح ان کا امتیاز خاص یہ ہے کہ انہوں نے کتابیں بھی لکھیں جن میں بیشتر مستقل قدر و قیمت کی مالک ہیں۔ مگر رفقاء کی ایک ایسی جماعت بھی پیدا کی جو شبلی اکادمی یا دارالمصنفین (اعظم گڑھ) کے نام سے آج تک تصنیف و تالیف میں مصروف ہے اور ایک علمی مجلّہ (معارف) کی اشاعت کے علاوہ ہر سال معیاری کتابیں لکھ کر اردو ادب کے ذخیرے کو مالا مال کر رہی ہیں۔

علامہ اقبالؒ نے مولانا حالی اور شبلی دونوں عظیم المرتبت شخصیات کا ذکر اپنی شاعری اور نثر میں بڑی عقیدت کے ساتھ کیا ہے۔ دونوں شخصیات نے اپنی گراں قدر خدمات کی بناء پر اردو ادب اور شاعری میں ایک منفرد مقام حاصل کیا۔ دونوں کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

> ''مولانا شبلی اگر اور کچھ بھی نہ لکھتے تو تنہا سیرۃ النبی ﷺ ان کو ابدالآباد تک زندہ رکھ سکتی۔ مسدس مدوجزر اسلام بھی اکیلی مولانا حالی کو حیات جاوید بخشنے کے لیے کافی تھی'' (۱۳)

حالی اور شبلی دونوں نے اقبال کی شاعری کے ابتدائی دور میں انکی اقبال مندی اور کمال فن کا اعتراف کیا۔ دونوں نے جس کام کی ابتداء کی،

اقبال نے اسے آگے بڑھایا اور آگے بڑھتے بڑھتے دونوں بزرگ ہستیوں کو خراج عقیدت پیش کیا اور انکی عظمت کا بھی اعتراف کیا۔ علامہ نے ان دونوں شخصیات پر ایک پُر درد مرثیہ لکھ کر دونوں کے مرتبے کا تعیّن کیا ہے۔ دونوں شخصیات کے انتقال سے جو نا قابلِ تلافی نقصان ہوا ہے ، علامہ اس پر گہرے تاسف کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کی موت کا صدمہ قوم کے لیے بار گراں ہے۔ مسلمان قوم ایسی ایک ساخت کی وجہ سے بلند اور عظیم ہے اور کچھ شخصیتیں قوم کو آگے بڑھانے اور اس کی صحیح رہنمائی کرنے میں اپنی ہر ممکن کوشش برائے کار لاتی ہیں اور جب اس نوع کی شخصیات قوم کو داغِ مفارقت دے جاتی ہیں تو قوم کو ان کی کمی کا شدید احساس ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو بے سہارا سمجھنے لگتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمان قوم جدید فلسفے اور علوم جدید کی موجد ہے اور مختلف تہذیبیں اس قوم کی بدولت بنی ہیں۔ مگر اس وقت قوم رو بہ زوال ہے کیونکہ زندگی کے ہر شعبے میں ضعف اس لئے پڑا ہے کہ تمام بزرگ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں۔ ان میں حالی اور شبلی قابلِ ذکر ہیں اور اگر کوئی شخص قوم کی اصلاح کر سکتا تھا وہ بھی ان بزرگ ہستیوں کا ماتم کر رہا ہے۔

خاموش ہو گئے چمنستان کے راز دار
سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہلِ گلستان
حالی بھی ہو گیا سوئے فردوس رہ نورد

علامہ ان دونوں شخصیات سے بے حد متاثر تھے۔ دونوں علامہ کے خیالات کی سراہنا کرتے تھے ۔ حالی نے علامہ کی شاعری کی تعریف ۱۹۰۴ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے انیسویں سالانہ اجلاس میں کی۔ یہ یکم اپریل تک اسلامیہ کالج لاہور کے وسیع صحن میں منعقد ہوا۔ اور اس اجلاس میں بہت سی شخصیات کے علاوہ الطاف حسین حالی، سر عبدالقادر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اکابر موجود تھے۔ جب علامہ نے ''تصویر درد'' نظم پڑھ کر سنائی تو مولانا حالی نے علامہ کے کسی شعر کو پسند فرمایا اور علامہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے حالی نے انجمن کو دس روپے کا نوٹ دیا۔ اس سے انجمن کو کافی فائدہ ہوا۔ جب مولانا حالی کے نظم پڑھنے کی باری آئی تو ضعف پیری کی وجہ سے ان کی آواز سامعین تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ تو علامہ نے یہ نظم پڑھ کر سنائی اور اس نظم سے پہلے یہ رباعی پڑھ کر سنائی۔

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشور شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے میرے لب پر کلامِ حالی [۱۴]

علامہ اقبال حالی اور شبلی کے قدر داں تھے کیونکہ دونوں کا مقصد قوم کی بھلائی اور بہی خواہی تھا۔ حالی نے مدو جزر اسلام میں مسلمانوں کی ترقی اور تنزل کے اسباب بیان کئے ہیں۔ حالی نے جدید شاعری کو، جس کی بنیاد آزاد نے ڈالی تھی، اپنی جنبش قلم سے مستقل اور نمایاں

شکل دیدی۔ حالی نے مسدس کو یاس اور غم پر ختم کیا مگر اقبال نے قوم کو نئی امیدیں عطا کیں اور مسلمانوں کو اپنی عظمت رفتہ کا احساس دلایا۔ اس ضمن میں سلیم اختر کہتے ہیں:

"مولانا الطاف حسین حالی کے مسدس اور اقبال کے شکوہ اور جوابِ شکوہ کا ژرف نگاہی سے جائزہ لینے پر اساسی نوعیت کی ایک بات واضح ہوتی ہے ۔حالی اور اقبال دونوں نے مسلمانوں کو گذشتہ عظمت کا احساس کرانے کی کوشش تو کی لیکن حالی نے یاس اور ناامیدی پر مسدس ختم کی جبکہ اقبال "جواب شکوہ" میں رجائیت پر مبنی رویہ اپنائے ہیں۔ اس میں ان دونوں کے مخصوص تاریخی حالات اور سیاسی تناظر کا بہت دخل ہے۔ [۱۵]

علامہ اور حالی دونوں کی یہ کوشش رہی ہے کہ قوم کو بیدار کر کے دنیا پر سبقت لے جانے کی تلقین کی جائے۔ دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ حالی سرسید کے حامیوں میں تھے مگر اقبال کی آنکھیں مغرب کی چکا چوند روشنی سے کبھی خیرہ نہ ہوسکیں۔انہوں نے پہلے مغرب کے سومنات پر حملہ کیااور اس کے بعد قوم کو یاس اور ناامیدی کی جگہ امید کا پیغام دیا۔

شاعر کی نوا ہو یا مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

حالی اور قبال میں زماں و مکاں کا بہت فرق ہے۔ دونوں قوم کے بہی خواہیں۔ جس جدید شاعری کی بنیاد حالی نے ڈالی، اقبال نے اسے آگے بڑھایا۔ دونوں کے مزاج میں مماثلت کے پہلو بھی ملتے ہیں:

"دونوں کو اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کا شدید

احساس تھا۔ دونوں قوم کی حالت پر ماتم کناں رہے۔ دونوں نے مسلمانوں کی بہبود کے خواب دیکھے''[16]

علامہ نے اردو شاعری کو آگے بڑھایا اور بہت آگے بڑھ گئے۔ حالی نے جہاں اپنی شاعری کا اختتام کیا، اقبال نے وہیں سے اس کی ابتداء کی۔

''اقبال کی غزل گوئی حالی کی اصلاحی کوششوں سے بہت آگے بڑھ گئی اور پیغامبری کے منصب پر فائز ہوئی''[17]

حالی نے غزل میں حقیقی زندگی کی عکاسی کر کے غزل میں نئی راہیں پیدا کر دیں۔ اور آگے چل کر یہی مقصد اقبال نے انتہائی درجہ تک پہنچا کر اس کو آسمان کی بلندیوں کے ساتھ چھونے کی بات کہی۔ اقبال کے سامنے حالی کی دی ہوئی ایک راہ تھی جس کی وجہ سے وہ آگے بڑھے۔ اسی بناء پر علامہ نے حالی کے لیے مرثیہ کہکر ان کے مرتبے کا تعین کیا ہے۔

علامہ نے حالی کا ذکر مندرجہ ذیل اشعار میں کیا ہے۔ یہ اشعار ۲۶ / اکتوبر ۱۹۳۵ء کو حالی کی صد سالہ برسی کے موقعے پر نواب صاحب بھوپال کی موجودگی میں پڑھے گئے اور اب تک کسی کتاب میں درج نہیں ہیں۔

مزاج ناقہ مانند عرفی نیک می بینم
چو محمل را گراں بینم حدی را تیر تر می خواں
حمید اللہ خان اے ملک و ملت را فروغ از تو
زِ الطاف تو موج لالہ خیزد از خیابانم

طواف مرقد حالی سزد ارباب معنی را
نوائے او بجانہا افگند شورے کہ می دانم
بیا تا فقر و شاہی در حضور او بہم سازم
تو بر خاکش گہر افشاں و من برگ گُل افشانم

ایک دوسرے موقعہ پر سے متعلق مندرجہ ذیل قطعہ کہا تھا:

آں لالہ صحرا کہ خزاں دیدو بفسیرد
سیدد گر او را نمے از اشک سحر داد
حالی ز نواہائے جگر سوز دنیا سود
تا لالۂ شبنم زدہ را داغ جگر داد

۲۴ر جون ۱۹۳۵ء [۱۸]

حالی کے ساتھ شبلی نعمانی کا ذکر بھی یوں عقیدت اور احترام کے ساتھ ملتا ہے۔

علامہ نے مرحوم کے مزار کے لیے یہ تاریخی جملہ تجویز کیا

''امام الندوالانژاد شبلی طاب نژاہ'' [۱۹]

علامہ شبلی بھی اقبال کی کافی قدر کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا ایک اجلاس مولانا شاہ سلیمان پھلواری کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں اقبال کی گلپوشی کی رسم مولانا شبلی نے انجام دی تھی۔ اسی خوشگوار فریضے کو ادا کرتے ہوئے مولانا شبلی فرماتے ہیں:

''یہ رسم کوئی معمولی رسم نہیں، اور اس کو محض تفریح نہ تصور کرنا چاہیے۔ ہم

مسلمانوں کا یہ شعار رہا ہے کہ ہم جس قدر قوم کی دی ہوئی عزت اور خطابات کی قدر کرتے ہیں اتنی کسی اور عزت کی شہرت ہمارے ناموں کے ساتھ نہیں ہوتی۔ محقق طوسی وغیرہ کو ان کے زمانے کے سلاطین نے بڑے بڑے خطابات دئے۔ لیکن آج سوائے کتابوں کے اوراق کے کسی کی زبان پر نہ چڑھ سکے۔ لیکن قوم کی طرف سے محقق کا جو خطاب دیا گیا ہے۔ وہ آج زبان زد خاص و عام ہے۔ جو عزت آج قوم کی طرف سے ڈاکٹر اقبال کو دی جاتی ہے وہ ان کے لئے بڑی عزت اور فخر کی بات ہے اور حقیقت میں وہ اس کے مستحق ہیں'' [۲۰]

اقبال کی پہلی کتاب علم الاقتصاد کا مسودہ علامہ شبلی کی نظر سے گزرا تھا مگر ہم ان کی اصلاحات کی پوری کیفیت سے آگاہ نہیں۔ [۲۱]

اقبال شبلی کی شعر العجم کے بے حد مداح تھے۔ چنانچہ ظہور الدین مہجور کے نام ایک مکتوب میں انہوں نے لکھا کہ شعر العجم کے انداز میں کشمیر میں شعراء فارسی کی تاریخ لکھی جائے۔ [۲۲]

مولانا شبلی کی سیرت النبیؐ کے بارے میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

رات کو سیرت نبوی کا مطالعہ رہتا ہے۔ مولانا مرحوم نے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے جس کا صلہ دربار نبوی ﷺ سے عطا ہوگا۔ [۲۳]

علامہ اقبال مولانا شبلی کے علم وفضل کے معترف تھے۔ چنانچہ ایک مکتوب میں مولانا سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد آپ استاذ الکل ہیں'' [۲۴]

ایک اور جگہ شبلی مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے علامہ اقبال لکھتے ہیں:

''اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل

تاریخ لکھی جائے ۔ اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں ان سے ایسی
کتاب لکھنے کی درخواست کرتا''[۲۵]

علامہ اقبال حالی اور شبلی دونوں بزرگ ہستیوں کے کافی قدرداں تھے۔ اس لحاظ سے ان دونوں شخصیات کا ذکر کافی احترام سے ملتا ہے۔'بانگِ درا' میں 'حالی وشبلی' نظم میں علامہ نے اس عقیدت اور احترام کا ذکر یوں کیا ہے:

مسلم سے ایک روز یہ اقبال نے کہا
دیوان جزو کل میں ہے تیرا وجود فرد
تیرے سرود رفتہ کے نغمے علوم نو
تہذیب تیرے قافلہ ہائے کہن کی گرد
پتھر ہے اس کے واسطے موجِ نسیم بھی
نازک بہت ہے آئینہ آبروئے مرد
مردان کار ڈھونڈ کے اسباب حادثات
کرتے ہیں چارہ ستم چرغ لاجورد
پوچھ ان سے جو چمن کے ہیں دیرینہ راز دار
کیونکر ہوئی خزاں تیرے گلشن سے ہم نبرد
مسلم میرے کلام سے بیتاب ہوگیا
غماز ہوگئی غم پنہاں کی آہ سرد
کہنے لگا دیکھ تو کیفیت خزاں
اوراق ہوگئے شجر زندگی کے زرد

خاموش ہوگئے چمنستان کے راز دار
سرمایہ گداز تھی جن کی نوائے درد
شبلی کو رو رہے تھے ابھی اہل گلستان
حالی بھی ہوگیا سوئے فردوس رہ نورد
اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغبان
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد [۲۶]

حالی اور شبلی کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے قوم کا حال بیان کیا ہے اور سوالیہ نشانات میں قوم کی پستی کی وجہ دریافت کی ہے جو قوم پہلے ہر شعبے میں بلندیوں کو چھو رہی تھی اس کے زوال کے اسباب دریافت کئے گئے ہیں۔ قوم کی عظیم المرتبت شخصیات (حالی اور شبلی) کی موت سے قوم کا صدمہ بیان کیا گیا ہے۔

اقبال کو داغ پر لکھے گئے مرثیہ میں ایک امید کی کرن حالی کی شخصیت میں موجود نظر آتی تھی اور کہا تھا ؎

اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

مگر اب حالی کی موت سے اردو ادب میں ایسا خلا پیدا ہوا ہے جو کبھی پُر نہیں ہوگا اور جو امیدیں حالی اور شبلی سے وابستہ تھیں وہ اب ختم ہوگئیں ہیں۔

علامہ اقبالؒ اور داغ دہلوی

داغؔ تخلص، نواب مرزا خان نام، دہلی کے محلّہ چاندنی چوک میں ۲۵ر مئی ۱۸۳۱ء (۱۲ر ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ) کو بدھ کے دن دو بجے پیدا ہوئے۔[1]

اصلی نام ابراہیم تھا۔شادی کے بعد احباب نے نواب مرزا سے ان کو ملقب کیا اور آگے چل کر اسی نام سے مشہور ہوئے۔[2]

[والدہ کا نام وزیر بیگم عرف چھوٹی بیگم تھا جو محمد یوسف کشمیری سادہ کار کی بیٹی تھی[3]۔داغؔ کے والد کا نام شمس الدین خان تھا۔داغ کے والد کے انتقال کے بعد ان کی پرورش ان کی خالہ عمدہ نے کی۔

۱۸۴۰ء میں وہ اپنی خالہ کے ہمراہ رامپور چلے گئے جہاں انہوں نے مولوی غیاث الدین مؤلف غیاث اللغات سے فارسی پڑھی۔۱۸۴۴ء میں ان کی والدہ سے ابوظفر بہادر شاہ کے بیٹے اور ولی عہد مرزا محمد سلطان فخر الملک (میرزا فخرو) نے عقد کرلیا۔نواب میرزا جن کی عمر اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی، قلعہ دہلی میں چلے آئے اور وہیں انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔انہوں نے مروجہ فارسی کتابیں پڑھی اور سعید محمد پنجہ کش (م ۱۸۵۷ء) اور میرزا عبداللہ بیگ سے خوش نویسی سیکھی۔علاوہ ازیں

انہوں نے شہسواری اور مختلف ہتھیاروں کے استعمال میں بھی مہارت حاصل کی۔ سب سے بڑھ کر یہ قلعے میں سکونت کے باعث وہ اپنے زمانے کے مشہور شعراء سے متعارف ہو گئے۔ جو قلعہ معلّٰی کے شاعروں میں شریک ہوتے تھے۔ اس ماحول میں ان کے فطری میلان نے جلا پائی۔ وہ اوائل عمر ہی میں اردو غزلیں کہنے لگے۔ جب شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ نے انہیں اپنی شاگردی میں لیا تو ان کی شعری صلاحیتیں پوری طرح چمک اٹھی تھی۔ ذوقؔ سے تلمذ کا سلسلہ ۱۸۴۴ء سے ۱۹۵۴ء تک جاری رہا۔ اس دوران داغ قلعہ اور شہر کے مشاعروں میں حصہ لیتے رہتے۔ فخر الملک کی وفات (۱۰/جولائی ۱۸۵۶ء) کے بعد وہ قلعے کو چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ اس کے دس ماہ بعد ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا جس کے بعد داغ اپنے اہل و عیال سمیت ایک بار پھر رامپور پہنچ گئے جہاں یوسف حسین خان نے انہیں مہمان رکھا۔[۶]

۱۸۷۲ء — ۱۸۷۳ء میں داغ نے فریضۂ حج بھی ادا کیا۔ ۱۸۸۷ء میں ملازمت کرنے کے بعد داغ رامپور سے دہلی آئے اور پھر یہاں سے حیدرآباد پہنچے۔

جمادی الآخر ۱۳۰۸ھ مطابق ۶/فروری ۱۸۹۱ء وہ نظام محبوب علی خان کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۳۰۹ھ مطابق ۱۸۹۱ء اور حیدرآباد آنے کی تاریخ سے لے کر ۴۵۰ روپیہ ماہانہ سکہ ریاستی تنخواہ مقرر ہوئی جو ۱۳۱۲ھ /۱۸۹۴ء میں بڑھا کر ایک ہزار روپیہ کر دی گی۔ ۱۸۹۴ء میں نظام کی

طرف سے انہیں بلبل ہندوستان، جہاں استاد، ناظم یار جنگ، دبیر الملک فصیح الملک، نواب میرزا خان کے خطابات ملے۔ دستخط میں وہ اپنا نام فصیح الملک داغ دہلوی لکھا کرتے تھے[۵]۔

حیدر آباد میں آپ کو یہ صدمہ اٹھانا پڑا کہ آپ کی رفیق حیات ۱۸۹۷ء مطابق ۱۳۱۰ھ میں رحلت کر گئی[۶] پھر داغ کی صحت خراب ہو گئی اور روز بروز بگڑتی گئی۔ آخر فالج کا دورہ پڑا، اطباء کی تدابیر ناکام رہیں اور ۱۴/فروری ۱۹۰۵ء بمطابق ۹/ذی الحج ۱۳۰۲ھ کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اپنے بارے میں خود کہہ چکے تھے۔

آج راہی جہاں سے داغ ہوا　　خانۂ عشق بے چراغ ہوا[۷]

داغ کے دیوان یہ ہیں: گلزار داغ ۱۲۹۶ھ/ ۱۸۷۹ء آفتابِ داغ، لکھنو ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء یادگار داغ جو ۱۳۱۰ھ سے لیکر ان کے سالِ وفات ۱۳۲۲ھ تک کے کلام پر مشتمل ہے۔ مہتاب داغ حیدر آباد دکن ۱۳۱۰ۃ/۱۸۹۳ء[۸] اس کے علاوہ ان کے مکتوبات میں انشائے داغ دہلی ۱۹۴۱ طبع احسن مارہروی، زبان داغ ان کے ذاتی خطوط لکھنو ۱۹۵۱ء احسن مارہوری، بزم داغ لکھنو ۱۹۵۶ء کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔[۹]

داغ اپنی زبان کی پاکیزگی اور دلفریبی کلام کی روانی اور بے ساختگی اور اسلوب کی سادگی و نفاست کے لیے مشہور ہیں۔ یہ سب صفات غزل کے لئے بالخصوص موزوں ہیں۔ واردات حسن و عشق اور دیگر تجربات زندگی کا وہ جس فنکارانہ اور حقیقت پسندانہ انداز سے اظہار کرتے تھے

اس کا اثر سامعین پر براہِ راست اور بڑا گہرا ہوتا ہے۔ان کا طرز بیان ایسا شیرین اور دلکش ہے کہ اس کی مثال اردو شاعری میں بہت کم نظر آتی ہے وہ اپنے خیالات وجذبات کو جس انوکھے ڈرامائی اور بے باکانہ انداز سے جامۂ الفاظ پہناتے تھے اس کی نظیر دوسرے شعراء کے ہاں شاذ ہی ملتی ہے۔(۱۰)

علاقہ اقبال نے داغؔ کا ذکر اپنے کلام میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ علامہ اقبال داغؔ دہلوی کے شاگردوں میں تھے۔یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال زندگی بھر داغ کے مداح رہے اور ان کی شاعری پر نازاں بھی رہے۔علامہ اقبال نے شروع شروع میں داغ سے اصلاح لینی شروع کی۔ان دنوں داغ حیدرآباد دکن کے دربار سے منسلک تھے۔چند غزلوں میں معمولی سی اصلاح کے بعد داغ نے انہیں کہہ دیا کہ ان کا کلام اصلاح سے بے نیاز ہے۔ چنانچہ داغ سے براہِ راست تلمذ زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔داغ کو بھی اس بات کا فخر تھا کہ اقبال بھی ان کے شاگردوں مین شامل ہیں۔عبدالقادر سروری لکھتے ہیں:

”اقبال بھی ابتدائی غزل گوئی کے زمانے میں ان (داغ) کے رنگ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مراسلت کے ذریعہ ان کی شاگردی اختیار کرلی۔اس چیز کا اثر صرف ایک رسمی واقعے کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اقبال کی ابتدائی غزلوں کو بنانے اور انکی زبان کو درست کرنے میں یہ تعلق بے حد کارگر ثابت ہوا۔ابتدائی غزلوں کی زبان میں وہ داغ کی سلاست اور اسلوب میں ایسی ندرت کو جگہ دینا چہاتے ہیں جس سے داغ کی شاعری ممتاز ہے .... اقبال کی طبیعت بچپن سے سنجیدہ

واقع ہوئی تھی۔ داغ کی شاعری کا اثر ان کے دل سے بہت جلد دور ہوگیا۔ کیونکہ زبان کی چاشنی سے ہٹ کر مضامین کے تکرار کے سوا اس شاعری میں کیا تھا جو اس فلسفی شاعر کی توجہ کو الجھائے رکھتا'' (۱۱)

اقبال کو داغ سے تلمذ حاصل تھا اور وہ اس بات پر فخر کرتے ہیں:

نسیم و تشنہ ہی اقبال کچھ نازاں نہیں اس پر
مجھے بھی فخر ہے شاگردی داغ سخندان کا

داغ اور اقبال کے ان تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے سر عبدالقادر دیباچہ ''بانگ درا'' میں لکھتے ہیں:

''۔۔۔ جناب داغ پہچان گئے کہ پنجاب کے ایک دور افتادہ ضلع کا یہ طالب علم کوئی معمولی غزل گو نہیں۔ انہوں نے جلدی کہہ دیا کہ کلام میں اصلاح کی گنجائش بہت کم ہے اور سلسلہ تلمذ بہت دیر قائم نہ رہ سکا۔ البتہ اس کی یاد دونوں طرف رہ گئی۔ داغ کا نام اردو شاعری میں ایسا پایہ رکھتا ہے کہ اقبال کے دل میں داغ سے اسی غائبانہ تعلق کی بھی قدر ہے اور اقبال نے داغ کی زندگی ہی میں قبول عام کا وہ درجہ حاصل کرلیا تھا کہ داغ مرحوم اس بات پر فخر کرتے تھے کہ اقبال بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے کلام کی انہوں نے اصلاح کی'' (۱۲)

داغ بجا طور پر اس مقام کے مستحق ہیں جو علامہ نے ''بانگ درا'' میں انہیں عطا کیا ہے۔ چنانچہ علامہ جیسے بلند پایہ شاعر اور فلسفہ کو بھی اس بات کا صحیح احساس تھا کہ ان کی عظمت میں جناب داغ کا بھی ہاتھ تھا۔

جناب داغ کی اقبال یہ ساری کرامت ہے
تیرے جیسے کو کر ڈالا سخندان بھی سخنور بھی

''بانگ درا'' میں داغ پر لکھی گئی اس نظم میں علامہ اقبال نے داغ کے مرتبے کا تعین کیا ہے۔اس نظم میں علامہ اقبال نے اپنے ایک خاص نقطہ نگاہ سے داغ کی شخصیت اوران کے فن کا اعتراف کیا ہے۔اورانکی رحلت سے اردو شاعری میں پیدا ہوئے خلا کو محسوس کیا ہےاوراس بات کی کمی پر افسوس کا اظہار کیا ہے کہ داغ کی بدولت اردو شاعری میں جو خوبیاں موجودتھیں وہ اب اردو شاعری کونصیب نہیں ہوسکتیں۔داغ کا ذکر کرنے کے ساتھ علامہ نے اور بھی دیگر شعراء کا ذکراس نظم میں کیا ہے۔

''یہ نظم مخزن (اپریل ۱۹۰۵ء) کے یادگارِداغ نمبر میں شائع ہوئی تھی اس کے چار بند تھے۔نظر ثانی کے وقت آخری بند کو دوحصوں میں تقسیم کر کے پانچ بند بنائے گئے۔باقی نظم میں بھی کافی ترمیم وتنسیخ ہوئی جو شعرحذف کئے گئے وہ یہ ہیں:

جوہر رنگین نوائی پا چکا جس دم کمال
پھر نہ ہوسکتی تھی ممکن میر و مرزا کی مثال
کر دیا قدرت نے پیدا ایک دونوں کا نظیر
داغ یعنی وصل فکر میرزا درد میر
شعر کا کاشانہ لیکن آج پھر ویران ہوا
دیدہ ، خوں بار پھر منت کش درماں ہوا
کم نہیں محشر سے کچھ ایسی صدا کی خامشی
آہ! دلسوزی تو تھی گو نکتہ آموزی نہ تھی

مخزن اپریل ۱۹۰۵ء(۱۳)

مندرجہ بالا حصہ پر تبصرہ کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''جب نظم کو'بانگ درا'' میں شامل کرنے کا وقت آیا اور اقبال نے اس نظم میں مندرجہ خیالات پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچے ہوں گے کہ دو شعر میری عقیدت کا نتیجہ ہیں اور ان میں مبالغہ کا وہی عیب موجود ہے جسے ''غلو'' کہتے ہیں اور جو داغ کی شاعری کا طرۂ امتیاز سہی لیکن اقبال کی شاعری میں حلقۂ بیرون در کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اقبال کو اس حقیقت تک پہنچنے میں دیر نہ لگی کہ داغ کا کلام مرزا غالب کی فکر اور میر تقی میر کے سوز و گداز کا مقام اتصال نہیں ہے نہ تو داغ میں ''مرغ تخیل کی رسائی ہے'' اور نہ میر تقی میر والی کیفیت گداز اس لئے انہوں نے دونوں شعر اپنی نظم سے خارج کر دئے۔ (۱۴)

داغ کی شاعری میں متعدد خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ کو ان کے یہاں ایک اور غیر معمولی خوبی نظر آتی ہے جو دوسرے شعراء کے یہاں ناپید ہے اور وہ ہے عشق کی حقیقی تصویر کشی:

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون
اٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

یہی وہ کمال فن ہے جو علامہ کے نزدیک کسی اور شخص میں موجود نہیں۔ یہ مرثیہ علامہ نے داغ کے انتقال پر ۱۹۰۵ء میں لکھا اور غم و اندوہ کا اظہار یوں کیا ہے:

چل بسا داغ آہ میت اس کی زیب دوش ہے
آخری شاعر جہاں آباد کا خاموش ہے

اب کہاں وہ بانکپن وہ شوخیِ طرزِ بیان
آگ تھی کافور پیری میں جوانی کی نہاں
اب صبا سے کون پوچھے گا سکوت گُل کا راز
کون سمجھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز
تھی حقیقت سے نہ غفلت فکر کی پرواز میں
آنکھ طائر کی نشیمن پر رہی پرواز میں
تھی زبان داغ پر جو آرزو ہر دل میں ہے
لیلیٰ معنی وہاں بے پردہ یاں محمل میں ہے
اشک کے دانے زمین شعر میں بوتا ہوں میں
تو بھی روئے خاک دلی داغ کو روتا ہوں میں

علامہ فکر مند ہیں کہ اب اردو زبان ان عظیم شخصیتوں سے محروم ہوگئی ہے ان میں غالب، میر مہدی مجروح، امیر مینائی اور داغ جیسی بلند پایہ شخصیات شامل ہیں:

اے جہاں آباد اے سرمایہ بزم سخن
ہو گیا پھر آج پامال خزاں تیرا چمن
وہ گل رنگین تیرا رخصت مثال بو ہوا
آہ! خالی داغ سے کاشانۂ اردو ہوا
اٹھ گئے ساقی جو تھے میخانہ خالی رہ گیا
یادگارِ بزم دہلی ایک حالی رہ گیا

داغ کی شاعری میں بانکپن، شوخی، جذبات نگاری، دلکشی اور جاذبیت کا ذکر کرتے ہوئے نہایت بلیغ انداز میں اشارے کئے ہیں۔ داغ کی شاعرانہ خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے رحلتِ داغ پر لکھا ہوا یہ رقت انگیز مرثیہ اقبال کے کمالِ فن کا آئینہ دار معلوم ہوتا ہے۔ آخری بند میں علامہ نے دنیا کی ناپائیداری اور بے ثباتی کا اظہار کیا ہے۔ یہاں علامہ نے بہار اورخزان کی علامتوں سے زندگی اور موت کی حقیقت کو واضح کر دیا ہے۔

آرزو کو خوں رُلواتی ہے بیدار اجل
مارتا ہے تیر تاریکی میں صیادِ اجل
کھل نہیں سکتی شکایت کے لیے لیکن زبان
ہے خزان کا رنگ بھی وجہ قیامِ گلستان
ایک ہی قانون عالم گیر کے ہیں سب اسیر
بوئے گل کا باغ میں گل چیں کا دنیا سے سفر

آخری بند میں قانون قدرت کی حقیقت کو بیان کیا گیا ہے ہر شے کو موت کا پیالہ پینا ہے زندگی کے بعد موت لازمی امر ہے "کُلّ نفسٍ ذائقة الموت" اسی حقیقت کو یہاں واضح کر دیا گیا ہے۔اس قانون عالم گیر کی وجہ سے داغ کی رحلت بھی ہوئی۔

داغ کی تاریخ وفات ۲۹/ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ بمطابق ۱۹۰۵ء کو ہوئی۔ علامہ نے مادہ تاریخ کہا۔نواب مرزا داغ (۱۳۲۲ھ)۔ یہ مادہ متعدد اصحاب کو سوجھا۔حیرت شاہ جہانپوری نے یوں نظم کیا:

کیا شان کرم دیکھ حیرت بلبل کو خدا نے کیا دیا داغ
دریا کو گہر فلک کو انجم جنت کو نواب میرزا داغ [۱۵]

داغ کی عظمت کا اعتراف اقبال نے نہ صرف اپنی شاعری میں کیا ہے بلکہ اس کا اظہار نثر میں بھی ملتا ہے۔ چنانچہ اقبال نے احسن مارہروی کے نام ایک خط میں امیر مینائی کی تصویر کے ساتھ ساتھ داغ کی تصویر فراہم کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔

''دونوں رسالے پہنچے۔ سبحان اللہ۔ نواب صاحب کی غزل کیا مزے کی ہے۔ افسوس ہے کہ اب تک میں نے آپ کے گلدستے کو کوئی غزل نہیں بھیجی۔ انشاء اللہ امتحان کے بعد باقاعدہ ارسال کیا کروں گا۔ ایک تکلیف دیتا ہوں اگر آپ کے پاس استاد ذی حضرت داغؔ کی تصویر ہو تو ارسال فرمایئے گا۔ بہت ممنوں رہوں گا۔ اگر آپ کے پاس نہ ہو تو مطلع فرمایئے گا کہ کہاں سے مل سکتا ہے۔ میں نے دنیا کے تمام بڑے شاعروں کے فوٹو جمع کرنے شروع کئے ہیں۔ چنانچہ انگریزی، جرمنی اور فرنچ شعراء کے فوٹوؤں کے لئے امریکہ لکھا ہے۔ غالباً کسی نہ کسی استاد بھائی کے پاس تو حضرت کا فوٹو ضرور ہوگا۔ اگر آپ کو معلوم ہو تو از راہ عنایت جلد مطلع فرمائیں۔ حضرت امیر مینائی کے فوٹو بھی ضرورت ہے۔ والسلام'' (۱۶)

اقبال کے اس خط پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد امین اندرابی لکھتے ہیں:

''ان کا سب سے پرانا خط جواب تک دستیاب ہوا ہے، ۲۸رفروری ۱۸۹۹ء کا ہے جو احسن مارہروی کے نام لکھا گیا ہے۔ اس وقت اقبال

طالب علم تھے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو اس وقت بھی ادب سے لگاؤ تھا اور شعر بھی کہتے تھے اور پھر یہ بھی کہ داغ دہلوی کی شاعری سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ انکی پیروی بھی کرتے تھے"۔ (۱۷)

غرض علامہ اقبال اپنے استاد داغ دہلوی کو کافی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی نظم اور نثر دونوں میں داغ کا ذکر عقیدت سے ملتا ہے۔

علامہ اقبالؒ اور اکبر الہ آبادی

لسان العصر سید اکبر حسین رضوی، اکبر الہ آبادی کے نام سے معروف ہیں۔ سید اکبر حسین ۱۶ ر نومبر ۱۸۴۶ء مطابق شوال المکرّم ۱۲۶۱ھ کو موضع بارہ ضلع الہ آباد میں پیدا ہوئے۔ اکبر کی دادی نے جو نہایت روشن ضمیر اور روشن دماغ تھیں خواب میں دیکھا کہ اس بچے کا نام اکبر حسین رکھا جائے اور زچہ نے بھی دیکھا کہ ایک چاند میری گود میں آ گیا[1] اکبر کے والد کا نام سید تفضیل حسین عرف چھوٹے میاں تھا۔ وہ صوفی منش اور درویش صفت بزرگ تھے۔

ابتدائی تعلیم مدارس اور سرکاری اسکولوں میں پائی۔ بچپن سے آخری ایام میں زندگی میں ترقی کرتے گئے۔ شروع میں معمولی ملازمتیں کیں۔ ۱۸۷۲ء میں وکالت کا امتحان پاس کیا اور کچھ مدت تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۸۰ء میں جج اور بعد میں سیشن جج ہو گئے۔ ۱۹۰۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوکر ہمہ تن علمی مشاغل میں مصروف رہے۔ ۱۸۹۸ء میں آپ کو خان بہادر کا خطاب دیا گیا۔ (۲)

۱۹۰۹ء کو اکبر کی آنکھ کا اوپریشن ہوا اور ۵ ر جون ۱۹۱۳ء کو اکبر کے بیٹے ہاشم کا انتقال ہوا۔ اس بات کا اکبر کو کافی صدمہ ہوا اور ان کی صحت کافی

متاثر ہوئی۔اس سے پہلے ان کی بیوی بھی اس دنیا سے چل بسی تھی۔ان صدموں سے اکبر کی صحت خراب ہوتی رہی اور وہ مسلسل بیمار اور پریشان رہےاور آخر کار ۹ محرم ۱۳۴۰ھ بمطابق ۱۹۲۱ء تین بجے دن کو لسان العصر نے داعی اجل کو لبیک کہی۔(۳)

بیماری کے دنوں میں موت کو اکثر یاد کرتے تھے۔رفیق اعلیٰ سے ملنے کی ایک تڑپ تھی۔

سر جھکا کر یاد کر لیتا ہوں اپنی موت کو
حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار میں

مگر ان کی دلی آرزو تھی کہ کوئی ایسا کام کر جائیں جس سے دنیا انہیں بھلا نہ سکے۔وہ خدا سے اس کی توفیق مانگتے رہتے تھے۔

دعا ہے کہ مر کر بھی رہ جاؤں کچھ
وگرنہ یونہی مر کے رہ جاؤں گا[۴]

اکبرالہ آبادی ایک بلند پایہ شاعر تھے۔وہ قوم کی بلندی اور ترقی کے خواہاں تھے۔انہوں نے قوم اور ملک کو بیدار کرنے کی کافی کوشش کی اور بقول محمد عبداللہ قریشی:

''انہوں نے خیالات کی حریت اور فکر کی آزادی کا ایک خاص رنگ اختیار کر کے اپنے اشعار سے خوب کام لیا۔ان کی شاعری مغربی تہذیب کے خلاف ایک زبردست احتجاج تھی۔وہ بے غرض مصلح تھے اور اس حیثیت سے عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔اور اب تک یاد کئے جاتے ہیں''(۵)

علامہ اقبال نے دیگر مشاہیر کی طرح اکبرالہ آبادی کا بھی ذکر اپنے کلام اور خطوط میں نہایت ہی عقیدت اور احترام سے کیا ہے۔سر عبدلقادر اس بارے میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان کے علمی دنیا میں جتنے بھی نامور اس زمانے میں موجود تھے مثلاً شبلی مرحوم، مولانا حالی مرحوم، اکبر مرحوم سب سے اقبال کی ملاقات اور خط وکتابت رہی۔'' (٦)

اکبراور اقبال کے روابط کے بارے میں غلام حسن ذوالفقار لکھتے ہیں:

''اکبر اور اقبال کے روابط کی ابتداء کب اور کیسے ہوئی اس سلسلے کی ابتدائی کڑیوں کا ملنا اب ذرا مشکل ہے۔ غالبًا دونوں فنکار ایک دوسرے کے کلام کے ذریعے غائبانہ طور پر پہلے متعارف ہوئے''۔(٧)

اکبراور اقبال کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے خطوط کی کافی قدر کرتے تھے اور ایک دوسرے سے ملنے کے آرزومند تھے۔ دونوں کے خطوط سے ان کے باہمی تعلقات کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ خیال کیا جاتا ہے کہ دونوں نے ایک دوسرے کو کافی خطوط لکھے ہوں گے مگر دونوں شخصیات کے درمیان لکھے گئے بہت کم خطوط اب تک دستیاب ہیں۔

علامہ اقبال نے اکبر کے نام جو خطوط لکھے ہیں انمیں سولہ خطوط شیخ عطاءاللہ کے مرتب کئے ہوئے مجموعہ خطوط اقبال نامہ حصہ دوم میں شامل ہیں۔ان خطوط میں علامہ اقبال نے اکبرالہ آبادی کو اس نگاہ سے دیکھا

ہے جس نگاہ سے کوئی مرید اپنے پیر کو دیکھے۔[8] یہاں وہ اکبر کو اپنا پیرو مرشد[9] کے علاوہ مرشد معنوی[10] تصور کرتے ہیں اور کبھی موقع ملتا ہے تو دل کا دُکھڑا اکبر کے پاس روتے ہیں۔(۱۱)

''دونوں کی مراسلت سے صرف چند خط ہم تک پہنچ سکے ہیں اور وہ بھی ۱۹۱۱ء سے ۱۹۲۰ء تک کے درمیانی عرصے کے البتہ ۱۹۱۰ء کے ایک انگریزی لیکچر میں ان کا ذکر ملتا ہے جو آغاز سرما میں اقبال نے اسٹریچی ہال ایم اے او کالج علی گڑھ میں دیا تھا۔ مولانا ظفر علی خان نے اس کا اردو ترجمہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر کے عنوان سے مارچ اپریل ۱۹۱۱ء کے پنجاب ریویو میں شائع کیا پھر مئی ۱۹۱۱ء میں برکت علی اسلامیہ ہال لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھ کر سنایا جو خاص اسی مقصد کے لیے منعقد ہوا تھا اور جس میں علامہ اقبال خود بھی موجود تھے اور بتایا کہ برعظیم کی اسلامی اور معاشرتی زندگی بالخصوص تعلیم یافتہ پود کی ذہنی بیداری میں حضرت اکبر کے اثرات خاصے نمایاں ہیں'' (۱۲)

اقبال اکبرالہ آبادی کا ذکر ایک جگہ یوں کرتے ہیں:

''جناب مولانائے اکبرالہ آبادی جنہیں موزوں طور پر ''لسان العصر'' کا خطاب دیا گیا ہے اپنے بذلہ سنجانہ پیرائے میں ان قوتوں کی ماہئیت کے احساس کو چھپائے ہوئے ہیں جو آج کل کے مسلمانوں پر اپنا عمل کررہی ہیں۔ ان کے کلام کے ظریفانہ لہجے پر نہ جائیے۔ ان کے شباب آور قہقہے ان کے آنسوؤں کے پردہ دار ہیں۔ وہ اپنے نہاں خانۂ صنعت میں اس وقت تک آپ کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے جب تک آپ ان کا مال خریدنے کے لیے ذوق سلیم کے دام اپنی جیب

میں ڈال کر نہ آئیں‘‘ (۱۳)

یہاں اس لیکچر میں علامہ نے پہلی بار اکبر الہ آبادی کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد علامہ اور اکبر کے یہاں کافی خطوط ملتے ہیں۔اقبال اکبر کے ان خطوط کی کافی قدر کرتے تھے اور انہیں محفوظ رکھتے تھے۔

’’آپ کے خطوط، جو سب میرے پاس محفوظ ہیں بار بار پڑھا کرتا ہوں اور تنہائی میں یہی خاموش کاغذ میرے ندیم ہوتے ہیں‘‘ (۱۴)

اور ایک جگہ لکھتے ہیں:

’’آپ کے خطوط سے مجھے نہایت فائدہ ہوتا ہے اور مزید غور و فکر کی راہ کھلتی ہے۔اسی واسطے میں ان خطوط کو محفوظ رکھتا ہوں کہ یہ تحریریں نہایت بیش قیمت ہیں اور بہت سے لوگوں کو ان سے فائدہ پہنچنے کی توقع ہے‘‘ (۱۵)

علامہ اور اکبر کے لکھے گئے ان خطوط سے نہ صرف ان کے باہمی تعلقات کی خبر ملتی ہے بلکہ ان کے خطوط میں مختلف مضامین ملتے ہیں۔ خیریت و مزاج پرسی، علالت پر اظہار تردد، شوقِ ملاقات اور متوقع ملاقات پر اپنی خوشی اور خوش نصیبی کا اظہار، لاہور آنے کی دعوت، موسم کی کیفیت اعزہ و احباب کی یاد اور ان کے اُنس و لطف کا ذکر و خیر۔ لاہور میں انفلوئنزا کی وبا کا ذکر اپنے سیاحت اور سفر کا حال اپنی اور اکبر کی ہم رنگی اور ہم مذاقی کا اعتراف۔اس نوع کے دوستانہ اور محبانہ کوائف۔مثلاً لاہور میں ہمدم و ہمراز کے نہ ہونے کی شکایت اپنے ہم خیالوں کی نایابی اور اپنی تنہائی کا رونا لاہور میں ضرورت اسلامی سے لوگوں کی ناواقفیت، پنجاب میں صحیح قسم کے علماء اور صحیح اسلامی

سیرت رکھنے والے نوجوانوں کا فقدان ،صوفیا کی ابتر حالت اور جمود پر افسوس ،ترکوں کی فتح ،دہلی دربار ،گاندھی جی کا خاموش مقابلہ ،کلکتے کا فساد ،پنجاب کا مارشل لاء ،لاہور کی مخدوش حالت وغیرہ۔(۱۶)

علامہ اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔اس مثنوی کی تعریف کرنے کے باوجود بھی بقول محمد عبداللہ قریشی [۱۷] اکبر کو اقبال کے مضامین مثلاً خودی، تصوف اور حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقید کے متعلق غلط فہمی پیدا ہوگئی تھی اور انہوں نے اسی بناء پر مثنوی کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تھا۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ

''اقبال بادۂ سخن کو چھوڑ کر محتسب فلسفہ کا درہ اٹھائیں بہ عوض اس کے ہم رندان بے سامان کے ساقی بنے رہیں۔ ہمارے سروں پر تیغ بکف آئیں، ہم کو ان سے محبت ہے''۔(۱۸)

اس غلط فہمی کا سب سے زیادہ شکار خواجہ حسن نظامی ہوئے۔اس بارے میں علامہ کو وہ اپنا حریف قرار دیتے ہیں۔علامہ کو اخبار اور رسائل میں بھی بدنام کرنے کی کوشش ہوئی۔اس بارے میں اکبرالہ آبادی کو لکھتے ہیں:

''خواجہ صاحب نے خواہ مخواہ مشہور کر دیا ہے کہ میں صوفیا کرام سے بدظن ہوں''(۱۹)

پھر اس بات کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خواجہ حافظ کے دیوان کے مطالعے سے میکشی بڑھ گئی ہے۔ حالانکہ ''اسرار خودی'' میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید ہے جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر (popular) ہے۔خواجہ

حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہیں نہ ان کی شخصیت سے''۔(۲۰)

علامہ اقبال اکبرالہ آبادی کو مذکورہ مثنوی کو پورا پڑھنے کی تلقین کرتے ہیں تاکہ اکبرایک مسلمان (اقبال) پر بدظنی کرنے سے محفوظ رہے۔(۲۱)

دونوں کے درمیان تعلقات سدھر جاتے ہیں۔ دونوں کے درمیان غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ اکبر دوسرے احباب و اقارب کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔خواجہ حسن نظامی اور اقبال کے درمیان اکبر مصالحت کی بھی کوشش کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اکبر خواجہ صاحب کو ۱۵ر جولائی ۱۹۱۶ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے ''اسرارِخودی'' کے دیباچے میں شری کرشن جی کو قابلِ تعریف ادب کے ساتھ یاد کیا ہے اور ان کی تعلیم کو برقرار رکھا ہے''(۲۲)

۱۹۱۲ء کے اوائل میں اراکین انجمن حمایت اسلام لاہور کے اصرار پر علامہ اقبال نے حضرت اکبر کو انجمن کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی۔اکبر نے معذوری کا اظہار کیا تھا۔لیکن خواجہ حسن نظامی کو لکھا:

''انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں وہ مجھے اصرار و شوق کے ساتھ مدعو کرتے ہیں۔میری اسیری و معذوری کے حالات سے وہ آگاہ نہیں۔ خدامسبب الاسباب ہے۔شاید نجات پاسکوں''۔(۲۳)

مذکورہ اجلاس ۱۹راپریل ۱۹۱۲ء کو اسلامیہ کالج ریلوے روڑ لاہور کے وسیع

گراونڈ میں منعقد ہوا تھا علامہ نے اپنی مشہور نظم ’’شمع و شاعر‘‘ اس اجلاس میں پڑھ کر سنائی۔ یہ نظم کافی مقبول ہوئی۔ روزنامہ زمیندار نے ۱۱/ اپریل ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں اس پر تعریفی شذرہ لکھا اور اس کے چند بند شائع کئے۔ حضرت اکبر نے یہ دیکھ کر ۱۳/ اپریل ۱۹۱۲ء کو مندرجہ ذیل خط مدیر زمیندار کے نام لکھا جو ۱۹/ جون ۱۹۱۲ء کے شمارے میں شائع ہوا۔

ڈاکٹر اقبال صاحب کی نظم کے دو تین بند جو زمیندار میں چھپے ہیں، میں نے دیکھے وہ نظم اس کی مستحق ہے کہ اس کی مدح کی جائے۔ یہ رباعی پیش کرتا ہوں:

اس نظم کا نقطہ نقطہ ہے منبع نور
یہ حرف سے ہے تجلی حق کا ظہور
اوج ملکوت کا ہے عالم ہر لفظ
ہر بیت اقبال کی ہے بیت المعمور [۲۴]

نظم ’’شمع و شاعر‘‘ بانگ درا میں موجود ہے نظر ثانی کے وقت اقبال نے ساتویں بند کا یہ شعر قلمزد کر دیا۔

ملک ہاتھوں سے گیا، ملت کی آنکھیں کھل گئیں
سرمہ چشم دشت میں گرد رم آہو ہوا [۲۵]

۱۹۱۲ء کے اواخر میں اکبر اور اقبال کے مشترک دوست مرزا سلطان احمد نے جو ان دنوں ریاست بہاولپور میں مشیر مال تھے، اپنی تصنیف فنون لطیفہ اکبر کی خدمت میں پیش کی۔ اس میں شاعری، موسیقی، فن تعمیر اور

سنگ تراشی پر نہایت جامعیت سے بحث کرنے کے علاوہ اکبر اور اقبال کے اشعار کی تعریف کی گئی تھی۔ یہ کتاب انہوں نے اقبال کے نام ان الفاظ کے ساتھ معنون کی۔

آداب ایشیائی اقوام کے مطابق تحفہ، ہدیہ اور نذرانہ دینے کے واسطے پہلے سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس رواج کی پابندی سے مجھے حضرت ڈاکٹر محمد اقبال ایم۔اے بالقابہ سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس خلوص اور اس روز افزوں احترام اور محبت کے اعتبار سے جو حضرت اقبال کی نسبت میرے ناچیز دل میں ہے۔ میں یہ ادنیٰ نذر پیش کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔

> ''حضرت اقبال کی خداداد قابلیت، کشادہ دلی اور دوست نوازی سے امید کرنی چاہیے کہ مجھے شرف قبولیت سے ممتاز فرمایا جائے، احقر سلطان احمد ۲۶ رنومبر ۱۹۱۲ء'' (۲۶)

اکبر نے اس کتاب کی رسید دیتے ہوئے ۲۴ ردسمبر ۱۲ء کو مرزا صاحب کی خدمت میں لکھا:

> ''میں کیا اور میرے شعر کیا۔ آپ کے تحسین سے حوصلہ افزائی ہو جاتی ہے............ میں بہت خوش ہوا کہ آپ نے مکرمی ڈاکٹر اقبال کے نام پر اس کتاب کو معنون کیا۔ حضرت اقبال نے کیا بلند اور روشن طبیعت پائی ہے اور کیا طرز ادا ہے۔ کیا بلاغت ہے۔ مغربی لٹریچر کی تکمیل، اس پر یہ رنگ طبیعت کہ بیدل کا دل بھی صدقے ہو۔ ان کا یہ مصرعہ
>
> ''در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند''

میں کبھی نہیں بھولتا۔ میں انکی طرف سے بھی سپاس گزاری کرتا ہوں۔ اگر چہ اب تک مجھ کو ان سے ملنے کی مسرت حاصل نہیں ہوئی۔ عجیب قید میں ہوں اس موسم میں ناتوانی اجازتِ سفر نہیں دیتی۔ یہاں سردی تیز ہے۔ ہاشم کے اسکول میں مئی میں تعطیل ہوتی ہے۔ اس وقت گرمی کی شدت ہوتی ہے دیکھئے کب زیارت کا موقع ملتا ہے بہر کیف اس مطلع سے تسکین ہو جاتی ہے۔

آرزو دنیا میں کب نکلی اولوالابصار کی
چشم موسیٰ کو بھی حسرت رہ گئی دیدار کی[۲۷]

علامہ اقبال اور اکبر کی پہلی ملاقات جنوری ۱۹۱۳ء میں ہوئی۔ ایک خط میں اکبر مرزا سلطان احمد کو ۲۸ رجنوری ۱۹۱۳ء کو لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال صاحب نے بڑی زحمت اٹھائی۔ صرف چند گھنٹوں کے لئے مجھے ملنے کو الہ آباد تشریف لائے تھے۔ آپ صاحبوں کا کرم ہے ورنہ میری کیا ہستی:

چل بسے اسباب غفلت چشم عبرت رو چکی
میری ہستی تھی ہی کیا اور تھی جو کچھ وہ ہو چکی

ڈاکٹر اقبال صاحب بہ لحاظ جملہ حالات کے اس وقت اس حلقے میں آیات الٰہی میں سے ہیں۔ آپ نے بجا ان کی مدح کی ہے۔ وہ بھی ناز اں ہیں کہ آپ ایسے عالم، فلاسفر، نیک دل بزرگ کی خدمت میں نیاز حاصل ہے'' (۲۸)

۷ر ستمبر ۱۹۱۳ء کو دونوں کی دوسری ملاقات ہوئی جس کا ذکر اکبر مرزا سلطان احمد کے نام ۹ر ستمبر اور مولانا عبدالماجد دریا بادی کے نام ۱۰ر ستمبر ۱۹۱۲ء کو کیا۔

بنام سلطان احمد

''پرسوں آپ کے دوست اور مداح ڈاکٹر اقبال صاحب بھی بسلسلۂ کانپور مجھ سے ملنے کو تشریف لائے تھے'' (۲۹)

عبدالماجد دریا بادی کے نام

''کل ڈاکٹر اقبال صاحب جو مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے تھے دہلی گئے'' (۳۰)

۲۹ر فروری ۱۹۲۰ء کو اکبر اور اقبال کی تیسری ملاقات ہوئی۔ ۵ر مارچ اکبر نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا:

''۲۹ر فروری کو ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے۔ کسی مقدمے میں ضلع گیا کو گئے۔ مجھ سے ملنے کو اس طرف سے گزرے۔ تین دن رہے۔ ان میں میں نے بہت پولیٹیکل نشاط طبع پائی۔ دنیا بہ امید قائم'' (۳۱)

۱۷ر مارچ ۱۹۲۰ء کے ایک خط میں علامہ نے اکبر کے نام ایک خط میں یوں ذکر کیا:

''بڑی ضرورت ہے کہ ایک منشی کاغذ اور قلم دوات لے کر آپ کے پاس ہر وقت بیٹھے اور جو بات آپ فرمائیں اسے نوٹ کر لے۔ اگر میں الہ آباد میں قیام کرتا تو آپ کے لیے وہ کام کرتا جیسا باسویل (Boswell) نے ڈاکٹر جانسن Jhonson کے لئے کیا تھا'' (۳۲)

اکبر کی وفات کے بعد مختلف لوگوں نے دہلی، لکھنو اور لاہور سے مکاتیب اکبر کے مجموعے شائع کئے۔ اقبال بھی اکبر کے ان خطوط کا مجموعہ شائع کرنا چاہتے ہیں جو اکبر نے اقبال کو لکھے تھے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے مرزا سلطان احمد اپنے مرتبہ مکاتیب اکبر کے دیباچے میں تحریر کرتے ہیں:

''سنا گیا ہے کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال بھی یہ آرزو رکھتے تھے کہ حضرت اکبر کے جو خطوط ان کے نام کے ہیں ان کا انتخاب مع مقدمہ شائع کیا جائے۔ اگر ڈاکٹر صاحب ایسا کر سکیں تو وہ ادبی دنیا پر ایک بڑا احسان کریں گے۔ جیسا کہ مکاتیب اکبر خطوط اکبر دو مختلف مجموعے اس سے پہلے دہلی لکھنو میں شائع ہو چکے ہیں'' (۴۳)

اقبال اکبر کی زبان سے نکلنے والے ہر لفظ کی قدر کرتے تھے۔ وہ ان کے ہر لفظ کو پُر معنی اور مفید جانتے تھے ان کی خواہش تھی کہ ان کو جمع کر لینا چاہیے تا کہ آئندہ نسلیں فائدہ اٹھا سکیں۔ (۴۴)

حضرت اکبر کی روحانی تربیت سے فائدہ اٹھا کر ۱۹۱۴ء میں اقبال نے انجمن حمایت اسلام لاہور کے انیسویں سالانہ اجلاس میں چند ظریفانہ قطعات پڑھے۔ جو ''اکبری اقبال'' کے نام سے شائع ہوئے۔ ان میں چند ''بانگ درا'' میں شامل ہیں۔ باقی ترک کر دئے گئے۔ کچھ لوگوں نے اس پر اعتراضات کئے اور اقبال کو بُرا بھلا کہا۔ اس سلسلے میں اقبال نے ۱۶ر جولائی ۱۹۱۴ء کے خط میں اکبر کو لکھا:

''آپ کا نوازش نامہ ملا۔ جس کو پڑھ کر مسرت ہوئی۔ حضرت! میں آپ کو پیر و مرشد تصور کرتا ہوں۔ اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس

کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا مطلق رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ جب آپ سے ملاقات اور خط و کتابت نہ تھی اس وقت بھی میری ارادت اور عقیدت ایسی ہی تھی جیسی اب ہے اور جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی اگر ساری دنیا متفق اللسان ہو کر یہ کہے کہ اقبال پوچ گو ہے تو مجھے اس کا مطلق اثر نہ ہو گا کیونکہ شاعری سے میرا مقصد بقول حصول دولت و جاہ نہیں۔ محض صداقت ہے_____" (۳۵)

اکبر کو اکثر اقبال کا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ مرزا سلطان کے نام ۲۹ر ستمبر کو لکھتے ہیں___ معلوم نہیں حضرت اقبال آج کل کہاں اور کس سوچ میں ہیں میں بالفضل پرتاب گڈھ میں ہوں جہاں میاں عشرت ہیں۔ [۳۶]

اسی طرح سر عبدالقادر کے نام ۲۱ر مارچ ۱۹۲۱ء کو خط میں لکھتے ہیں:

"یہ تو فرمائیے ڈاکٹر اقبال صاحب کیا کرتے ہیں عرصے سے خط نہیں آیا۔" (۳۷)

۹ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اقبال کی والدہ فوت ہو گئیں اکبر نے تعزیت کرتے ہوئے ایک نظم لکھی اور یہ قطعہ تاریخ وفات لکھا جو آج بھی مرحومہ کی لوح مزار پر کندہ ہے۔

مادر مرحومہ، اقبال رفت
سوئے جنت زیں جہان بے ثبات
گفت اکبر بادل پر درد و غم
"رحلت مخدومہ" تاریخ وفات [۳۸]

علامہ اقبال نے ۲۵ر اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ایک خط میں حضرت اکبر کے دو اشعار کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

''نوازش نامہ ملا۔ دونوں اشعار لا جواب ہیں

فطرت کی زبان حسن کو سمجھو

سبحان اللہ! یہ طرز اور معنی آفرینی خاص آپ کے لیے ہے کوئی دوسرا یہاں مجال دم زدن نہیں رکھتا اور دوسرا شعر

غضب یہ ہے کہ کبھی محتسب بھی ہوتی ہے

کئی دفعہ پڑھ چکا ہوں اس کا لطف کم ہونے میں نہیں آتا کبھی موقع ہوتا ہے تو دل کا دکھڑا آپ کے پاس روتا ہوں۔ یہاں لاہور میں ضرورت اسلامی سے ایک متنفس بھی آگاہ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے اور خدا تعالیٰ نے مدد نہ کی تو آئندہ بیس سال نہایت خطرناک نظر آتے ہیں۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی۔ اب برائے نام علماء جو باقی ہیں وہ بھی جب تک کسی خانوادے میں بیعت نہ لیتے ہوں ہر دلعزیز نہیں ہو سکتے۔ اب اسلامی جماعت کا محض خدا پر بھروسہ ہے میں بھلا کیا کر سکتا ہوں صرف ایک بے چین اور مضطرب جاں رکھتا ہوں۔ یہ آرزو رہتی ہے کہ کوئی قابل نو جوان جو ذوق خداداد کے ساتھ قوت عمل بھی رکھتا ہو۔ مل جائے جس کے دل مین اپنا اضطراب منتقل کر دوں زیادہ کیا عرض کروں اللہ تعالیٰ آپ کا حامی و ناصر ہو''۔ (۳۹)

۲۷ رجنوری ۱۹۱۶ء کے خط میں اقبال نے حضرت اکبر کے اس شعر

وائے بر بستی اگر مقصود ہستی ہو چکا

کی تعریف کرتے ہوئے لکھا:

''نہایت خوب ہے سیدھے، آسان اور مختصر الفاظ میں حقائق بیان

کرنا آپ کا کمال ہے۔ عبدالماجد صاحب نے جو شعر آپ کا پسند کیا ہے نہایت خوب ہے۔ میں نے بھی اس مضمون کا ایک شعر لکھا تھا۔

گل تبسم کہہ رہا تھا زندگی کو مگر
شمع بولی گریۂ غم کے سوا کچھ بھی نہیں'' (۴۰)

۱۴ر ستمبر ۱۹۱۸ء کے خط میں علامہ اقبال اکبر کو لکھتے ہیں:

''ابھی تو مسلمانوں کو اور ان کے لٹریچر کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے ...... ایک نہایت مخلص نوجوان لاہور میں ہے۔ تاجر کتب ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ شکوہ اور جواب شکوہ کو پھر شائع کرنا چاہیے مگر مولانا اکبر دیباچہ لکھیں۔ میں نے آپ کی طرف سے ہر چند عذر کیا مگر وہ مُصر ہے ــــ تاہم اگر کسی روز طبیعت شگفتہ ہو اور آلام وافکار کا احساس شگفتگی طبیعت سے کم ہو گیا تو دس پندرہ سطور اس کی خاطر لکھ ڈالیں۔ یہ لڑکا آپ کا غائبانہ مرید ہے۔'' (۴۱)

اس خط کے جواب میں حضرت اکبر نے علامہ کو ۱۰ر اکتوبر ۱۹۱۸ء کو جو کچھ لکھا وہ بھی محفوظ ہے اور حاضر ہے دیکھئے اکبر کس مقام سے ارشاد ہدایت کا فریضہ ادا کر رہے ہیں۔

''پیارے ڈاکٹر صاحب! آپ کا آخری خط ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۸ء اس وقت سامنے ہے آج کس قدر حواس درست ہوئے۔ ایسی تکلیف اٹھائی بیان دشوار ہے۔ معلوم نہیں کس گناہ کی سزا ملی کہ دو دن دربار بند رہا یعنی نماز بہ حالت انتشار ادا ہوئی۔ قرآن پڑھوا کر سنا شدت درد سے ہوش پگھل رہا تھا۔ مسہل سے افاقہ ہے ناتوانی زیادہ ہے دنیا کم نظر آتی

ہے...... مجھ کو کیا خوشی ہو کہ ہندوستان میں صرف ایک شخص یعنی اقبال نے اس شعر کی داد دی:

جہاں بستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں
عقیدے، عقل عنصر سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

____ میں زیادہ نہ لکھ سکا۔ قوت نظم اس وقت نہیں ہے آئندہ جو ہو سکے بے تکلفانہ آپ کو لکھ دیا۔ خرافات ہو تو چشم پوشی کیجئے خدایت یاد باد''۔(۴۲)

اپنے پیر اور مرشد معنوی کے انتقال پر علامہ اقبال نے ایک پردرد مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ علامہ اقبال کے کلام ''پیام مشرق'' ۱۹۲۱ء کے ایڈیشن میں شامل تھا مگر بعد کے ایڈیشنوں میں حذف کر دیا گیا جس کی وجہ بقول مولف باقیات اقبال یہ ہو سکتی ہے کہ پیام مشرق میں علامہ کے پیش نظر زیادہ تر وہ مسائل تھے جن کا تعلق اقوام اور ملل کی موت اور زندگی سے تھا اور مرثیہ کی نوعیت ایک دوست کا نوحہ ہونے کی حیثیت سے صرف شخصی اور ذاتی تھی

دریغا کی رخت از جہاں اکبر — حیاتش بحق بود روشن دلیلے
سر ذروۂ طور معنی کلیمے — بہ بت خانہ دور حاضر خلیلے
نوای سر گاہ او کارواں را — اذان درای پیام رحیلے
زدل ہابرافگندہ ای لات وعزیٰ — بہ جاں ھانشایندہ ای سلسبیلے
دماغش ادب خوردۂ عشق و مستی — دلش پرورش دادۂ جبرئیلے [۴۳]

اکبر کی وفات پر اقبال نے مرثیہ کہا ہے اس سے جہاں اکبر کی فکری و فنی قدر و منزلت کا تعین ہوتا ہے وہاں اکبر اور اقبال کی ملی احساسات اور زاویۂ ہائے فکر و نظر کی یکجہتی کا ثبوت بھی ملتا ہے یہ مرثیہ فارسی میں ہے اور اقبال کے فارسی مجموعہ کلام پیام مشرق کے ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں شامل تھا۔[۴۴]

اکبر الہ آبادی کا انتقال ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ہوا۔ علامہ اقبال نے ۱۳ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ایک تعزیتی خط ان کے صاحبزادے سید عشرت حسین کو لکھا۔ اقبال نے اپنی بدنصیبی اور محرومی کا ذکر یوں کیا:

> ''ابھی زمیندار سے آپ کے والد بزرگوار (اور میرے مرشد معنوی) کے انتقال پر ملال کی خبر معلوم ہوئی۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ اس بات کا ہمیشہ قلق رہے کہ ان سے آخری ملاقات نہ ہو سکی۔ میں اور میرے ایک خاص دوست قصد کر رہے تھے کہ ذرا گرمی کم ہو جائے تو ان کی زیارت کے لیے الہ آباد کا سفر کریں۔ انہوں نے اپنے آخری خط میں مجھے لکھا بھی تھا کہ امسال ضرور ملنا ______ میری بدنصیبی ہے کہ ان کے آخری دیدار سے محروم رہا۔ ہندوستان اور بالخصوص مسلمانوں میں مرحوم کی شخصیت قریباً ہر حیثیت سے بے نظیر تھی۔
>
> اسلامی ادیبوں میں تو شاید آج تک ایسی نکتہ رس ہستی پیدا نہیں ہوئی اور مجھے یقین ہے کہ تمام ایشیاء میں کسی قوم کے ادبیات کو نصیب نہیں ہوئی۔ فطرت ایسی ہستیاں پیدا کرنے میں بخیل ہے۔ زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جا کے ایک اکبر ہاتھ آتا ہے''۔ (۴۵)
>
> کاش! اس انسان کا معنوی فیض اس بدقسمت ملک اور بدقسمت قوام

کے لیے کچھ عرصہ جاری رہتا۔ خدا تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میں نے ایک تار بھی آپ کو دیا ہے''۔ (۴۶)

مولانا گرامی کو اقبال نے ۱۶ر ستمبر ۱۹۲۱ء کو اس بارے میں اس طرح لکھا:

''آخر ما جیب تمنا تہی'' اس مصرع نے مجھے بے ہوش کر دیا۔ اکبر مرحوم بے نظیر آدمی تھے۔ وہ اپنے رنگ کے پہلے اور آخری شاعر تھے مگر شاعری کو چھوڑ کر ان کا پایہ روحانیات میں بھی کم بلند نہ تھا۔ اس بات کی خبر شاید ان کے عزیزوں کو بھی نہ تھی یوں تو کئی سالوں سے ان کے وقت کا بیشتر حصہ قرآن پڑھنے میں گزرتا تھا اور ان کی زندگی میں رفیق اعلیٰ سے ملنے کے لیے ایک تڑپ تھی مگر گزشتہ دو سال سے تو وہ موت کے بہت متمنی تھے کوئی خط ایسا مشکل سے ہوگا، جس میں انہوں نے اس خواہش کا اظہار نہ کیا ہو۔ ایک انگریزی مصنف لکھتا ہے کہ جوں جوں ہماری عمر بڑھتی ہے زندگی سے محبت زیادہ ہوتی جاتی ہے اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ طویل العمری سے عروس حیات سے ہمارا اختلاط بڑھتا رہتا ہے اور اختلاط کا نتیجہ انس ہے۔ بہر حال وجہ کچھ بھی ہو۔ میں نے تو یہ کلیہ صوفی اکبر مرحوم کی صورت میں صحیح نہ پایا۔ خدا ان کو غریق رحمت کرے۔ مسلمانان ہند کو اپنے اس نقصان کا پورا پورا احساس نہیں ہے''۔ (۴۷)

علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' میں بھی اکبر الٰہ آبادی کا ذکر یوں کیا ہے:

گرچہ تو زندانی، اسباب ہے   قلب کو لیکن ذرا آزاد رکھ
عقل کو تنقید سے فرصت نہیں   عشق پر اعمال کی بنیاد رکھ

اے مسلمان ہر گھڑی پیشِ نظر آیۂ لا یخلف المیعاد رکھ
یہ لسان العصر کا پیام ہے ان وعد اللہ حق یاد رکھ[۴۸]

علامہ اقبال اور سر عبد القادر

سر عبد القادر علامہ اقبال کے بزرگ ترین معاصرین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ وہ علامہ اقبال کے قریبی ساتھی تھے۔ علامہ کے کلام کو دنیا تک پہنچانے اور ان کو دنیا سے متعارف کرنے میں "مدیر مخزن" نے خاص کام انجام دیا۔ سر عبد القادر ۱۸۷۴ء میں پیدا ہوئے اور ۹ر فروری ۱۹۵۰ء میں وفات پائی۔ سر عبد القادر نے ۱۹۰۱ء میں اردو زبان کی خدمت کا جو بیڑہ اٹھایا اس کی خدمت میں اپنی کافی مصروفیات کے باوجود تقریباً نصف صدی تک اس کی اشاعت بڑی تندہی اور خلوص کے ساتھ کرتے رہے۔ اردو ادب میں سر عبد القادر کے نام اردو کے محسن کی حیثیت سے ہمیشہ یاد رہے گا۔(۱)

سر عبد القادر اور اقبال کو اردو زبان سے ایک خاص لگاؤ تھا۔ اس وجہ سے دونوں شخصیات میں ایک قسم کا تعلق پیدا ہوا جو کافی دیر تک قائم رہا۔ سر عبد القادر علامہ اقبال کو ان عظیم شخصیات میں شمار کرتے ہیں جنہوں نے اردو زبان کی ترقی کے لیے کافی محنت کی۔ چنانچہ اس بارے میں سر عبد القادر لکھتے ہیں:

کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہوگا جو اردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا۔ جس کی

بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا انداز بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادب اردو کے فروغ کا باعث ہوں گے مگر زبان اردو کی خوش اقبالی دیکھے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا۔ جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اردو داں دنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جن کی شہرت روم، ایران، فرنگستان تک پہنچ گئی ہے''۔(۲)

کلام اقبال کے پہلے مجموعے کا مقدمہ بہت سے لوگوں نے لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی مگر علامہ اقبال نے سر عبد القادر کو ہی سب لوگوں پر ترجیح دی۔ سر عبد القادر لکھتے ہیں:

''اقبال کا کلام جو وقتاً فوقتاً ۱۹۰۱ء سے لے کر آج تک رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوا اور انجمنوں میں پڑھا گیا اس مجموعے کی اشاعت کے بہت لوگ خواہاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے احباب بارہا تقاضا کرتے تھے کہ اردو کلام کا مجموعہ شائع کیا جائے مگر کئی وجوہات سے آج تک مجموعہ اردو شائع نہ ہو سکا۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر اب شائقین کلام اردو کی یہ دیرینہ آرزو برآئی اور اقبال کی اردو نظموں کا مجموعہ شائع ہوتا ہے جو دو سو نوے بانوے صفحات پر مشتمل ہے اور تین حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ اول ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں ہیں۔ حصہ دوم میں ۱۹۰۸ء تک کی نظمیں اور حصہ سوم میں ۱۹۰۸ء سے آج تک کا اردو کلام ہے۔''(۳)

سر عبد القادر علامہ سے پہلی ملاقات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''۱۹۰۱ء سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انہیں پہلی مرتبہ لاہور کے ایک مشاعرہ میں دیکھا۔ اس بزم میں ان کو ان کے کچھ ہم جماعت کھینچ

کر لے آئے اور انہوں نے کہہ سن کر ایک غزل پڑھوائی۔ اس وقت تک لاہور میں لوگ ان سے ناواقف تھے۔ چھوٹی سی غزل تھی سادہ سے الفاظ۔ زمین بھی مشکل نہ تھی مگر کلام میں شوخی اور بے ساختہ پن موجود تھا۔ بہت پسند کی گئی''۔(۴)

انہی دنوں ایک ادبی مجلس کا قیام عمل میں آیا۔ اس مجلس میں علامہ نے ایک نظم ''کوہ ہمالہ سے خطاب'' پڑھ کر سنائی۔ جس میں انگریزی خیالات، فارسی بندش اور وطن پرستی کا جذبہ کارفرما تھا۔ یہ نظم کافی مقبول ہوئی۔ ادب نواز حلقوں نے اس نظم کو شائع کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ اگرچہ علامہ اس کو شائع نہیں کرنا چاہتے تھے مگر سر عبدالقادر کے اصرار پر یہ نظم ''مخزن'' کے پہلے شمارے میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا شائع ہوئی۔ اس بارے میں سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

''میں نے اردو ادب کی ترقی کے لیے رسالہ ''مخزن'' جاری کرنے کا ارادہ کیا۔ اسی اثناء میں شیخ محمد اقبال سے میری دوستانہ ملاقات ہو چکی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ لیا کہ اس رسالے کے حصہ نظم کے لیے وہ نئے رنگ کی نظمیں مجھے دیا کریں گے۔ پہلا رسالہ شائع ہونے کو تھا میں ان کے پاس گیا اور میں نے ان سے کوئی نظم مانگی۔ انہوں نے کہا ابھی کوئی نظم تیار نہیں۔ میں نے کہا ''ہمالہ'' والی نظم دیجئے اور دوسرے مہینے کے لیے کوئی اور لکھیے۔ انہوں نے اس نظم کے دینے میں پس و پیش کی کیونکہ انہیں یہ خیال تھا کہ اس میں کچھ خامیاں ہیں مگر میں دیکھ چکا تھا کہ وہ بہت مقبول ہوئی اس لیے میں نے زبردستی ان سے وہ نظم لے لی اور مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں جو اپریل ۱۹۰۱ء میں نکلا

شائع کر دی۔ یہاں سے اقبال کی شاعری کا گویا پبلک طور پر آغاز ہوا اور ۱۹۰۵ء تک جو وہ ولایت گئے یہ سلسلہ جاری رہا''۔(۵)

علامہ اقبال کے کلام کی مختلف نظمیں مثلاً ترانۂ ہندی، جگنو، صبح کا ستارہ، ایک ہندوستانی لڑکی کا گیت، قومی زندگی اس رسالے میں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہیں۔ اس کے علاوہ مختلف خطوط اور اشتہارات اس رسالے کے ذریعہ لوگوں تک پہنچائے گئے۔ مختلف مضامین بھی اس رسالے کے ذریعہ منظر عام پر آئے۔ علم الاقتصاد دسمبر ۱۹۰۴ء میں شائع ہو کر تیار ہو چکی تھی۔ اس کے اشتہارات دسمبر ۱۹۰۴ء میں مدیر مخزن نے شائع کرائے۔

سفر یورپ کے دوران بھی علامہ اور سر عبدالقادر نے ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑا۔ یہاں اور بھی ان کے تعلقات مستحکم ہوئے۔ دونوں علامہ اور سر عبدالقادر یہاں بھی قوم کی خدمات انجام دیتے رہے۔ دونوں ایک دوسرے سے ملتے رہے اور مختلف موضوعات اور مسائل پر بحث اور تبادلہ خیال کرتے رہے۔ چنانچہ ایک دفعہ جب علامہ اقبال نے یہ فیصلہ کیا کہ شاعری کو ترک کر دیں گے تو سر عبدالقادر ہی کی وجہ سے علامہ نے یہ فیصلہ واپس لیا۔ چنانچہ اسی بات کا ذکر کرتے ہوئے سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

ایک دن محمد اقبال نے مجھ سے کہا کہ ان کا ارادہ مصمم ہو گیا ہے کہ وہ شاعری کو ترک کر دیں گے اور قسم کھا لیں کہ شعر نہیں کہیں گے اور جو وقت شاعری میں صرف ہوتا ہے وہ کسی خاص کام میں صرف کر دیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ان کی شاعری ایسی نہیں جسے ترک کیا جائے۔ بلکہ ان کے کلام میں وہ تاثیر ہے جس سے ممکن ہے کہ ہماری درماندہ

قوم اور ہمارے کم نصیب ملک کے امراض کا علاج ہو سکے۔ اس لیے ایسی خداداد طاقت کو بیکار کرنا درست نہ ہوگا۔ شیخ صاحب کچھ قائل ہوئے کچھ نہ ہوئے اور یہ قرار پائے کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر فیصلہ چھوڑا جائے اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب ترک شعر کے ارادے کو ترک کر دیں اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترک شعر اختیار کیا جائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق کیا اور یہ فیصلہ ہوا کہ علامہ کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں اور جو وہ وقت اس شغل کی نظر کر رہے ہیں وہ ان کے لیے بھی مفید ہے اور ان کے ملک و قوم کے لیے بھی مفید ہے۔" (۶)

جس طرح سے علامہ اقبال سر عبدالقادر کو عقیدت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اسی طرح سر عبدالقادر بھی علامہ کو کافی احترام کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ وہ علامہ کو سب سے بڑا شاعر مشرق اور فلسفی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ لندن کی لٹریری ایسوسی ایشن نے ایک دفعہ علامہ کے اعزاز میں والڈروف ہوٹل میں ایک شاندار پارٹی کا اہتمام کیا جس میں لگ بھگ چار سو افراد نے شرکت کی اور اس میں ہندوستان کی چیدہ چیدہ علمی اور سیاسی شخصیتوں نے شرکت کی۔ طعام کے بعد ایک اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت سر عبدالقادر نے کی اس افتتاحی تقریر میں علامہ کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے کہا:

"آج ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ سرزمین مشرق کا سب سے بڑا شاعر

اور فلسفی ہمارے درمیان موجود ہے جس کے اعزاز میں ہم سب یہاں جمع ہیں''۔(۷)

یورپ کے سفر کے دوران علامہ کی شاعری میں ایک تبدیلی رونما ہوئی وہ یہ تھی کہ علامہ نے اردو زبان کے بجائے فارسی کو وسیلہ اظہار بنایا۔سر عبد القادر لکھتے ہیں:

''بظاہر ایک چھوٹے سے واقعہ سے ان کی فارسی گوئی کی ابتداء ہوئی ہے۔ایک مرتبہ کسی دوست کے ہاں مدعو تھے جہاں ان سے فارسی شعر سنانے کی فرمائش ہوئی اور پوچھا کہ وہ فارسی اشعار بھی کہتے ہیں یا نہیں انہیں اعتراف کرنا پڑا کہ انہوں نے سوائے ایک آدھ شعر کبھی کہنے کے فارسی لکھنے کی کوشش نہیں کی مگر کچھ ایسا وقت تھا اور اس فرمائش نے ایسی تحریک ان کے دل میں پیدا کی کہ دعوت سے واپس آکر بستر پر لیٹے ہوئے باقی وقت وہ فارسی اشعار کہتے رہے اور صبح اٹھتے ہی مجھ سے ملے تو دو تازہ غزلیں فارسی میں تیار تھیں جو انہوں نے زبانی مجھے سنائیں۔ ان غزلوں کے کہنے سے انہیں اپنی فارسی گوئی کی قوت کا حال معلوم ہوا''۔(۸)

جن عظیم المرتبت شخصیات نے علامہ کو متاثر کیا یا پھر علامہ کے ان سے کسی طرح کے بھی مراسم رہے۔سر عبد القادر کی عظیم شخصیت بھی ان ہی شخصیات میں شامل ہے۔سر عبد القادر نے علامہ اقبال کو کافی متاثر کیا۔ اس لیے علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' میں ''سر عبد القادر کے نام'' ایک نظم لکھی ہے۔یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۸ء میں لکھی۔یہاں سر عبد القادر کو مخاطب ہو کر علامہ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم کی زندگی کے مقاصد سے آگاہ کرانا

ضروری ہے ان میں عشق رسول ﷺ کا جذبہ پھر سے زندہ کرنا ہے اور وقت کی قدر کرتے ہوئے قوم کو اپنے بزرگوں کے کارنامے یاد دلا کر جدوجہد کا سبق سکھانا ہے۔ علامہ اقبال نے سر عبد القادر کو ہی قوم کی خدمات میں شریک ہونے کے لیے ہی چنا ہے تاکہ دونوں علامہ اور سر عبد القادر ایک ساتھ مل کر قوم کی خدمات کا بیڑا اٹھا سکیں۔

اٹھ کہ ظلمت ہوئی پیدا افق خاور پر
بزم میں شعلہ نوائی سے اجا کر دیں
ایک فریاد ہے مانند سپند اپنی بساط
اسی ہنگامہ سے محفل تہہ و بالا کر دیں
اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق
سنگ امروز کو آئینہ فردا کر دیں
جلوۂ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تر از خون زلیخا کر دیں
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دے کر
قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں
رخت جاں بتکدہ چیں سے اٹھائیں اپنا
سب کو محو رُخ سعدی و سلیمیٰ کر دیں
دیکھ یثرب میں ہوا ناقہ لیلیٰ بے کار
قیس کو آرزوے نو سے شناسا کر دیں

بادہ دیرینہ ہو اور گرم ہو ایسا کہ گداز
جگر شیشہ و پیانہ و مینا کردیں
گرم رکھتا تھا ہمیں سردی مغرب میں جو داغ
چیر کر سینہ اسے وقف تماشا کردیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں
ہرچہ در دل گزرد وقف زباں دارد شمع
سوختن نیست خیالے کہ نہاں دارد شمع ()

اس کے علاوہ بھی علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' کی ایک غزل کے مقطع میں سر عبدالقادر کا ذکر یوں کیا ہے:

''مدیر مخزن سے کوئی اقبال جا کے میرا پیام کہہ دے
کہ کام جو کر رہی ہیں قومیں انہیں مذاق سخن نہیں ہے'' (۱۰)

۞۞۞

علامہ اقبال اور مولانا سید میر حسن سیالکوٹی

علامہ اقبال کی بلند پایہ شخصیت کی تعمیر وتشکیل میں ان کے والدین کے بعد ان کے اساتذہ کا بھی ہاتھ ہے۔ علامہ کو بچپن سے ہی نہایت قابل قدر اساتذہ ملے۔ ان استادوں میں شمس العلماء سید میر حسن کی عظیم المرتبت شخصیت بھی شامل ہے جنہوں نے علامہ کی زندگی کو چار چاند لگائے۔ ان ہی حضرات کی وجہ سے علامہ کو بچپن ہی میں ایک مستحکم بنیاد فراہم ہوئی اور وہ دنیا کی ایک عظیم شخصیت بن گئے۔

شمس العلماء مولانا سید میر حسن کی شخصیت نہایت ہی قابل قدر اور قابل احترام ہے ان حضرات کا ذکر علامہ نے اپنی شاعری کے علاوہ اپنے خطوط میں بھی کیا ہے۔ مولانا نے اپنی خاص مہارت سے اقبال کو اردو اور فارسی سکھائی جس کی وجہ سے علامہ نے ان دونوں زبانوں میں کمال حاصل کرلیا۔ علامہ کے والدین نہایت ہی نیک، دیندار اور مذہب پرست تھے۔ اس لیے علامہ کی تعلیم وتربیت بھی ایک خاص دینی ماحول میں ہی ہوئی۔ ملاحظہ ہو:

''اقبال ابھی چوتھی جماعت میں ہی پڑھتے تھے کہ ایک دن ان کے والد صبح سویرے مولوی میر حسن صاحب کے پہنچے اور کہنے لگے ''مولوی صاحب! میں سوچتا ہوں کہ اقبال آخر انگریزی کی تعلیم پا کر کیا کرے گا۔ اسے مذہب کی تعلیم کیوں نہ دی جائے جس سے اس کی عاقبت سدھر جائے اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہی اچھا ہے کہ اقبال اسکول جانے کے بجائے مسجد میں آپ سے دینیات پڑھ لیا کرے''۔(۱)

علامہ کو بھی اس بات کا اعتراف ہے کہ میر حسن نے ہی ابتداء میں ان کی صحیح تربیت کی ہے۔

''اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید میر حسن نے ڈالی اور جسے درمیان میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے۔(۲)

علامہ کی تعلیم و تربیت میں ان کے والدین نے کوئی کسر باقی نہ رکھی۔ دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ انہوں نے مروجہ تعلیم میں بھی کمال حاصل کر لیا۔ اس کا سہرا بھی میر حسن کے ہی سر جاتا ہے جن کے مشورے پر ہی علامہ اقبال کو اپنے والد نے مشن ہائی سکول میں داخل کروایا۔ مولانا سید میر حسن ایک قابل قدر، شفیق اور تجربہ کار استاد تھے۔ جن کی رہبری علامہ اقبال کو بھی نصیب ہوئی۔ سر عبدالقادر اس بارے میں لکھتے ہیں:

''سیالکوٹ میں ایک کالج ہے جس میں علماء نے سلف کی یادگار اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ایک بزرگ مولوی سید میر حسن صاحب علوم

مشرق کا درس دیتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے گورنمنٹ سے خطاب شمس العلماء بھی ملا ہے ان کی تعلیم کا یہ خاصہ ہے کہ جو کوئی ان سے فارسی یا عربی سیکھے، ان کی طبیعت میں اس زبان کا صحیح مذاق پیدا کر دیتے ہیں۔ اقبال کو بھی اپنی ابتدائے عمر میں مولوی سید میر حسن سا استاد ملا۔ طبیعت میں علم و ادب سے مناسبت قدرتی طور پر موجود تھی۔ فارسی اور عربی کی تحصیل مولوی صاحب موصوف سے سونے پر سہاگا ہو گیا''۔(۳)

علامہ اقبال اور سید میر حسن کے درمیان تعلقات کا باقاعدہ آغاز شکاچ مشن سکول سے ہی ہو گیا اور یہ تعلقات آگے بہت مضبوط بھی ہو گئے اور آخر تک قائم رہے۔

مولانا سید میر حسن سیالکوٹی کی پیدائش ۱۸/اپریل ۱۹۴۴ء کو فیروز والا ضلع گوجرانوالہ میں ہوئی۔ قرآن شریف کی تعلیم سید محمد صاحب سے حاصل کی اور ابتدائی کتب مولانا شبیر محمد صاحب سے۔(۴)

مولانا کی پیدائش کے بارے میں غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''علامہ مرحوم کے شاگردوں سے معلوم ہوا کہ آپ اپنا تاریخی نام ''رونق بخش'' بتایا کرتے تھے۔ اگر صحیح ہے تو آپ کی پیدائش کا سن ۱۹۵۸ء تھا اور اس اعتبار سے آپ نے نوے سال کی عمر پائی۔''(۵)

مولانا کی پیدائش ۱۸۴۰ء سے ۱۸۴۴ء تک ہوئی اور تقریباً ۸۵ سال سے ۹۰ سال کی عمر پائی۔ مولانا فارسی اور عربی زبان کے ماہر استاد تھے۔ مولانا کے یہاں کافی شاگرد تھے۔ آپ تمام شاگردوں کو نہایت شفقت

اور محنت سے پڑھاتے تھے۔ ان سے کبھی کوئی کام نہیں کرواتے تھے۔ ایک دفعہ علامہ نے بازار سے آپ کے گھر کے لیے کچھ سامان لایا، مولانا کو ناگوار ہوا اور کہا:

''تمہیں کتنی بار کہا کہ بازار سے ہمارے لیے سودا سلف مت لایا کرو۔
تم میرے شاگرد ہو نوکر نہیں''۔

علامہ نے مسکرایا اور کہا:

''جناب میں آپ کا شاگرد نوکر ہوں''۔ (۶)

مولانا نیک اخلاق کے اچھے اور وعدے کے پکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مشاہرہ پر سکاچ مشن سکول میں ملازمت شروع کی اور آخر تک اسی عہدے پر فائز رہے اگرچہ بہت ساری جگہوں پر آپ کو اس سے زیادہ تنخواہ بھی پیش کی گئی مگر آپ نے انکار کیا اور کہا کہ اب مشن کو چھوڑ دینا آئین مروت شناسی کے خلاف ہے [ے]۔ مشن نے بھی آپ کی کافی قدر کی اور آخر تک پنشن مقرر کی۔ مولانا کی کئی تصانیف ہیں مگر ان کے طبعی انکسار کے باعث آج تک زیر طبع سے آراستہ نہیں ہو سکیں۔ (۸)

علامہ اقبال کو سید میر حسن کا کافی احترام تھا۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ اقبال نے ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ زندگی بھر ان کے سامنے میری زبان سے ایک مصرعہ نکل گیا اور وہ بھی اتفاقی طور پر مولوی صاحب کسی کام کے سلسلے میں گھر سے نکلے ایک بچہ جوان کے عزیزوں میں تھا اور جس کا نام ''احسان'' تھا ان کے ساتھ تھا۔ میں نے اس کو گود میں

اٹھالیا۔ کچھ دور جا کے میں تھک گیا۔ میں نے بچے کو دکان کی تختوں پر کھڑا کر دیا اور خود سستانے لگا۔ مولوی صاحب اتنے میں بہت آگے نکل گئے تھے ہمیں اپنے ساتھ نہ پایا تو الٹے پاؤں لوٹے اور میرے قریب آ کے فرمایا!

اقبال اس کی برداشت بھی دشواری ہے
میرے زبان سے بے اختیار نکل گیا۔
تیرا احسان باری ہے۔(۹)

علامہ اور سید میر حسن کے ابتدائی تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے عبد المجید سالک لکھتے ہیں:

''علامہ کے والد محترم مولانا غلام حسین کے ہاں معارف دین کی سماعت کے لیے جایا کرتے تھے اور ان کا رجحان بھی زیادہ تر یہی تھا کہ اپنے بچے کو صرف دینی تعلیم دلوائیں۔ اس لیے انہوں نے اقبال کو مولانا ہی کے ہاں پڑھنے بٹھا دیا۔ مولانا سید میر حسن بھی اکثر مولانا غلام حسین کے ہاں جایا کرتے تھے۔ اقبال کو وہاں دیکھ کر پوچھا۔ یہ کس کا بچہ ہے جب معلوم ہوا کہ شیخ نور محمد کا لڑکا ہے۔ تو آپ نے شیخ صاحب سے فرمایا کہ اس بچے کو یہاں سے اٹھا کر میرے پاس لاؤ، اسے میں پڑھاؤں گا چنانچہ اقبال مولانا کے ہاں سپرد ہوئے اور وہ تعلق پیدا ہوا جو مدۃ العمر قائم رہا''۔(۱۰)

علامہ اقبال نے انہی تعلقات کی بناء پر مولانا سید میر حسن کا ذکر اپنے خطوط اور کلام میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ مولانا

گرامی کو لکھتے ہیں:

کم نہ شود خزانہ مدت بے نہائیست
یک دو نفس زیادہ کن غنچہ نیم بازرا

مقصود یہ ہے کہ تیرے پاس وقت کا ایک لازوال خزانہ ہے۔ پھر غنچہ کی عمر اگر تھوڑی سی زیادہ کردے تو اس میں کمی نہ ہوگی۔ بہ نظر انتقاد ملاحظہ کیجئے۔

''مولوی میر حسن صاحب کی خدمت میں بھی میں نے یہ شعر سیالکوٹ لکھا ہے دیکھیں ان کی کیا رائے ہے''۔(۱۱)

مولانا کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے محمد بن عبدالرحمان شاطر مدراسی کے نام لکھتے ہیں:

''اگر آپ ''اعجاز عشق'' میرے کسی دوست کے نام ارسال کرنا چاہیں تو حضرت مولوی سید میر حسن صاحب پروفیسر عربی سکاچ مشن کالج سیالکوٹ کے نام ارسال کیجئے۔ یہ بڑے بزرگ ہیں۔ عالم اور شعر فہم ہیں۔ میں نے انہیں سے اکتساب فیض کیا ہے''۔(۱۲)

''اقبال اکثر کہا کرتے تھے کہ اسوۂ رسول ﷺ پر صحیح معنوں میں اگر کسی شخص نے عمل کی ہے تو وہ مولوی سید میر حسن سیالکوٹی ہیں''۔(۱۳)

۱۹۱۳ء کا ایک واقعہ ہے جب ڈاکٹر اقبال صاحب انارکلی والے مکان میں رہتے تھے سید محمد عبداللہ ان سے ملنے کے لیے وہاں گئے تو علامہ نے فرمایا:

''عبداللہ جی یورپ کا کوئی ایسا بڑا عالم فلسفی نہیں Oriental

occidental مستشرق یا مستغرب، جس سے میں نہ ملا ہوں یا کسی نہ کسی موضوع پر بے جھجک بات نہ کی ہو، لیکن نہ جانے کیا بات ہے۔ شاہ جی سے بات کرتے ہوئے میری قوت گوئی جواب دہ رہ جاتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے کسی نقطہ نظر سے مجھے اختلاف ہوتا ہے لیکن دل کی یہ بات بآسانی زبان پر نہیں لا سکتا''۔(۱۴)

علامہ مولانا کا کتنا احترام کرتے، اس کا ثبوت اس بات سے فراہم ہوتا ہے جب علامہ اقبال کو گورنمنٹ کی طرف سے ''سر'' کا خطاب ملا تو علامہ نے یہ خطاب قبول کرنے سے انکار کردیا اور انہوں نے یہ شرط عائد کردی کہ ان کے استاد میر حسن کو بھی شمس العلماء کا خطاب دیا جائے''۔(۱۵)

اس بات کی وضاحت کرتے ہوئے غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''غالباً ۱۹۲۲ء میں گورنمنٹ نے آپ کو شمس العلماء کا خطاب دیا۔ خطاب کی شان نزول بھی عجیب ہے۔ سر ایڈورڈ مکلیگن سابق گورنر پنجاب نے ایک وفد علامہ سر محمد اقبال کو ملاقات کے لیے یاد فرمایا۔ باتوں باتوں میں دریافت کیا کہ امسال حکومت کا ارادہ کسی مولوی صاحب کو شمس العلماء کا خطاب دینے کا ہے اور آپ کی رائے میں کس کو دیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے استاد کا نام پیش کیا۔ سر ایڈورڈ مولوی صاحب کو نہیں جانتے تھے۔ پوچھا مولوی صاحب کی کوئی تصنیف ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا ''اقبال''۔(۱۶)

مولانا سید میر حسن کا انتقال ۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء مطابق ۲۱ / ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ کو ہوا۔ علامہ یہ خبر سنتے ہی سیالکوٹ روانہ ہوئے تاکہ نماز جنازہ

میں شرکت کر سکیں۔ غلام رسول مہر لکھتے ہیں:

''۲۵ ستمبر کی صبح کو یہ اندوہناک خبر تار کے ذریعہ علامہ اقبال مدظلہٗ العالی کو پہنچی۔ آپ پہلی ٹرین سے سیالکوٹ روانہ ہوئے تاکہ نماز جنازہ میں شریک ہو سکیں۔ مولانا میر حسن کی وفات کا صدمہ نہ صرف ان کے اعزہ واقارب اور ہزارہا تلامذہ بلکہ تمام قوم کو ہوگیا جو ایک گراں مایہ ہستی سے تہی دامن ہوگئی ہے''۔ (۱۷)

قاضی افضل حق قریشی ان کے انتقال کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:

''۲۵ ستمبر ۱۹۲۹ء کو مولانا کا انتقال ہوگیا۔ میکلوڈ والے مکان سے علامہ کو خبر ملی۔ ریلوے سٹیشن کی طرف چل پڑے۔ سیالکوٹ کی کوئی گاڑی نہ تھی۔ مال گاڑی وزیرآباد جا رہی تھی۔ علامہ اسی میں گئے''۔ (۱۸)

علامہ اقبال نے اپنے استاد شفیق کے انتقال پر یہ مادہ تاریخ نکالا:

ما ارسلناک الا رحمة للعالمین

علامہ اقبال نے اس بزرگ ہستی کا ذکر اپنے کلام میں یوں کیا ہے:

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہے [۱۹]

مندرجہ شعر اقبال کے متروک کلام میں درج ہے۔ یہ غزل روزگار فقیر جلد دوم میں موجود ہے۔ مگر اس غزل کا صرف مقطع ''سرودرفتہ'' اور ایک شعر ''رختِ سفر'' میں شائع ہوا۔ (۲۰)

پروفیسر جگن آزاد اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

''اٹھارہ اشعار کی یہ غزل ''روزگار فقیر'' میں شامل ہے لیکن اس غزل

کے دو شعر اور کتابوں میں موجود ہیں اور وہ ہیں ''رخت سفر'' اور ''سرود رفتہ'' اول الذکر کتاب میں یہ شعر درج ہے:

تعلق پھول میں گویا ریاض آفرینش کے
مگر دیکھا تو کانٹے بھی یہی دامن کے نکلے ہیں

اور ثانی الذکر میں یہ شعر

مجھے اقبال اس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پہلے جو اس کے دامن میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں [۲۱]

''بانگ درا'' میں بھی علامہ اقبال نے ''التجائے مسافر'' عنوان کے تحت ایک نظم لکھی ہے جس میں میر حسن کے تئیں عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ یہ نظم اقبال نے ۱۹۰۵ء میں انگلستان جاتے ہوئے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کے مزار مبارک پر کہی۔ یہاں علامہ مختلف خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معترف ہیں کہ یہ سارا فیض انہیں خاندان مرتضوی سے ہی نصیب ہوا۔

پھر آر کھوں قدم مدر و پدر پہ جبیں
کیا جنہوں نے محبت کا رازداں مجھ کو
وہ شمع بار گاہ گہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستان مجھ کو
نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو

دعا یہ ہے کہ خداوند آسمان و زمین
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھ کو

علامہ اقبال کی خوش قسمتی یہ تھی کہ انہیں خود استاد میر حسن نے اپنا طالب علم بنایا اور اس بارے میں ان کی کوئی جستجو نہ کرنا پڑی اور بقول فقیر سید وحید الدین

''اقبال اپنے استاد کے طالب نہیں مطلوب تھے''۔(۲۲)

اور پھر خاندان مرتضوی سے علامہ کو جو فیض پہنا اس بارے میں ڈاکٹر عبدالحق لکھتے ہیں:

''دوسرا فکری اور تعمیری ماحول انہیں خاندانی مرتضوی کی بارگاہ کے آستانہ علم و دانش سے ملا جو اقبال کے لیے مثل حرم ہے۔ جس کے نفس سے اقبال کی آرزو کی کلیاں کھلی ہیں جس کی مروت نے اقبال کو نکتہ داں اور نکتہ سنج بنادیا''۔(۲۳)

❁❁❁

فارسی زبان وادب کے اعلام ومشاہیر

۱) اقبال اور غنی کاشمیری

۲) اقبال اور حافظ شیرازی

۳) اقبال اور حکیم سنائی

۴) اقبال اور شیخ سعدی شیرازی

۵) اقبال اور مولانا جلال الدین رومی

۶) اقبال اور مرزا عبدالقادر بیدل

علامہ اقبال اور غنی کاشمیری

جنت بے نظیر ارض کشمیر کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس سرزمین میں بہت سارے علماء، شعراء، مورخ اور ادیبوں کے علاوہ مختلف بلند قامت شخصیات نے جنم لیا۔ ان ہی بلند اور عظیم شخصیات میں فارسی زبان و ادب کی ایک عظیم شخصیت غنی کاشمیری بھی شامل ہیں۔ غنی کاشمیری کا اصلی نام ملا محمد طاہر اور بعض کے مطابق شیخ محمد طاہر ہے۔ آپ کشمیر کے معروف خاندان اشائی سے تعلق رکھتے تھے اور غنی تخلص تھا۔ غنی کی تاریخ پیدائش صحیح معلوم نہیں۔ آپ سرینگر میں عالی کدل کے نزدیک پیدا ہوئے۔ بعض مورخین کے مطابق غنی کی پیدائش ۱۰۴۰ھ[1] اور بعض کے مطابق ۱۰۲۰ھ[2] میں ہوئی ہے۔ ڈاکٹر جی۔ ایل۔ تکو نے اپنی کتاب ''پارسی سرایان کشمیر'' میں غنی کا سالا ولادت ۱۶۳۰ء لکھا ہے جو ۱۰۴۰ھ کے مطابق ہے۔ دیوان غنی کے مقدمے میں علی جواد زیدی لکھتے ہیں:

> ''اتنا قطعی طور معلوم ہے کہ جب ۱۰۴۱ھ میں صائب کشمیر آئے تو غنی کی شاعری مسلم ہو چکی تھی، یقیناً یہ غنی کی جوانی کا زمانہ رہا ہوگا''۔ (۳)

دیوان غنی میں لکھا ہے:

> ''محمد طاہر غنی بزرگترین سخنری کشمیر و از معاریف گویندگان پارسی زبان سرزمین پنہادر ہندوستان در قرن یازدھم هجری است۔ وی از

شاعرانی است۔ کہ بہ سبک ہندی سخن راندہ اند و باینکہ ہمروزگار گویند گانی چوں صائب تبریزی و حکیم کاشانی دوتن از نام آواران این سبک بودہ خود درین شیوہ مقامی شایستہ یافتہ است، تابہ ایجاً کہ صائیب تبریزی در سفر ہند بہ ستایش سخن اور برحاستہ و بہ نگارش بخشی از اشعاروی در سفینۂ خود اہتمام جستہ است۔ وفات غنی بہ سال ۱۰۷۹ھ قمری روای دادہ است (۴)

فارسی شعراء میں غنی مزاجاً درویش تھے۔ وہ ایک بلند پایہ شاعر بھی تھے اوران کے کلام میں مختلف موضوعات ملتے ہیں۔ان کے دیوان میں غزلیات کے علاوہ قصائد اور رباعیات،نعت وغیرہ شامل ہیں۔غنی شیخ محسن فانی کے شاگرد تھے۔تحصیل علوم وفنون سے فارغ ہونے کے بعد ۱۰۶۰ھ میں شاعری کی اور بہت جلد اپنے ہم عصروں میں امتیاز حاصل کرلیا۔مرزا صائب بھی غنی کے قدر دان تھے۔صائب گیارہویں صدی کا ایک مشہور شاعر گزرا ہے۔ جب ۱۰۴۱ھ میں ظفر احسن کو کشمیر کی صوبہ داری کے عہدے پر متعین کیا گیا تو صائب بھی اس کے ساتھ کشمیر کی سیر و سیاحت کے لیے آیا۔صائب جب ہندوستان آیا تو وہ غنی کی شہرت سن چکا تھا یہاں پہنچ کر انہوں نے غنی سے ملاقات کی۔

”اکثر تذکرہ نگاروں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ غنی کے ”حسن سبزی بخط مرا۔(الخ)“ والے شعر کو انہوں نے بے حد پسند کیا اور اپنی پسند کا اظہار انہوں نے ان لفظوں میں کیا کہ غنی میرا کل دیوان لے لیں اور مجھے یہ شعر دیدیں“۔(۵)

صائب اور غنی نے ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کے علاوہ ایک دوسرے کو اپنا کلام بھی سنایا۔ صائب نے اپنے قیام میں کشمیر میں غنی سے مصاحبت اور مجالست کی اور اس کے کلام کا پورا پورا استحسان کیا۔ جس کا تمام تذکرہ نویسوں نے اعتراف کیا...... اس کے علاوہ اس نے غنی کی بعض غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ جس کی تائید میں تذکرہ نویسوں نے یہ شعر پیش کیا ہے۔

این جواب آں غزل صائب کہ می گوید غنی
یاد آیا میکہ دیگ شوق ما سرپوش داشت[٦]

غنی اور صائب کی ملاقات سے ظاہر ہے کہ صائب کی آمد کے موقع پر غنی بیس پچیس سال کا ہوگا۔ (٧)

غنی کی قابلیت کا اعتراف ایرانی شعراء اور نقادوں نے بھی کیا ہے۔ غنی کی ایک آنکھ ناقص تھی جس کا ذکر ان کے اشعار میں بھی کیا گیا ہے:

بسان اشک شمع از تیرہ بختی
گریزان چشم من از روشنائی
از گریہ ام نہ ہمیں چشم تر سفید شد است
کر آب دیدہ مراموی سر سفید شد است

بخلاف دیگر شعراء غنی خوددار قناعت پسند تھا وہ زندگی بھر کسی امیر کے دروازے پر نہیں گیا۔ غنی کاشمیری کا انتقال جوانی ہی میں ١٦٦٨ء میں ہوا۔ مثالیہ مضمون نظم کرنا ان کی شاعری کی اہم خصوصیات ہیں۔ شبلی نے

اس خصوصیت کو حکیم مرزا صائب اور غنی کاشمیری کی مشترکہ خصوصیات بتایا ہے۔(۸)

غنی کاشمیری کا انتقال ۱۰۷۹ھ میں ہوا اور اپنے آبائی قبرستان سید صاحب راجوری کدل میں دفن ہوئے۔ ان کے شاگرد مسلم نے تاریخ وفات لکھی:

از قوت غنی گشت کہ و مہ غمگیں
ہر کس شدہ در ماتم او خانہ نشیں
تاریخ وفاتش از پرسند بگو
پنہاں شدۂ گنج ہنرے زیر زمین
۱۰۷۹

محمد علی ماہر نے یہ مشہور قطعہ کہا:

چوں دادش فیض صحبت شیخ کامل محسن فانی
غنی سر حلقۂ اصحاب او در نکتہ دانی شد
تہی چوں کردم بزم شیخ را گفتند تاریخش
کہ آگاہے سوی دارالبقا از دار فانی شد[۹]

غنی کا دیوان ان کی وفات کے بعد ایک سال ۱۰۸۰ھ میں ان کے شاگرد مسلم نے غنی کے دوسرے شاگرد ملک شہید کی مدد سے ترتیب دیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ دیوان غنی کو محمد علی ماہر نے ترتیب دیا ہے اور کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ مسلم اور محمد علی ماہر دنوں نے غنی کا دیوان مرتب کیا

ہے۔غنی کے کلام میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تصویر ملتی ہے۔ان کی نظر میں بڑی گہرائی اور گیرائی ہے وہ حسن وعشق کے ناز و نیاز سے واقف ہیں اور معرفت الٰہی کے رموز و اسرار سے بھی وہ تزکیہ نفس کے علاوہ تہذیب واخلاق کے داعی ہیں۔ان کا کلام کرداراور معاشرے کی اصلاح کی تمنا سے پر ہے۔''دائرۃ المعارف اقبال''میں ملک حسن اختر لکھتے ہیں

''غنی فارسی زبان کے مشہور شاعر ہیں۔کلام میں صفت ایہام کو بکثرت استعمال کیا ہے۔سرینگر میں پیدا ہوئے۔ساری عمر قناعت اور گوشہ نشینی میں بسر کی۔۱۶۶۸ء میں فوت ہوئے اقبال نے جنت میں ان سے ملاقات کی ہے۔رومی ان کا تعارف اس طرح کرواتے ہیں:

شاعر رنگین نوا طاہر غنی
فقر او باطن غنی ظاہر غنی
نغمۂ می خواند آں مست دام
در حضور سید والا مقام[10]

علامہ اقبال نے غنی کاشمیری کا ذکر اپنے کلام میں نہایت ہی عقیدت واحترام کے ساتھ کیا ہے۔انہوں نے غنی کی شخصیت کو پسند فرمایا ہے۔دونوں شعراء کو مسلم قوم سے ہمدردی تھی۔دونوں شعراء ہم وطن تھے اور اپنے وطن کشمیر سے کافی ہمدردی رکھتے تھے۔دونوں قوم کی بے بسی اور بے کسی پر مایوس تھے۔دونوں کشمیر کے درد کو محسوس کرتے ہیں

ہم چو سوزن دایم از پوشش گریزا نیم ما
جامہ بہر حلق می دوزیم و عریانم ما

روزی، ما میشود آخر نصیب دیگراں
طالع ہر گشتہ ہمچوں آصیا داریم ما
(غنی)

بریشم قبا خواجہ از محنت او
نصیب تنش جامۂ تار تارے
(اقبال)

غنی اور اقبال کے یہاں فکری تطابق اور توافق کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں جن کی وجہ سے غنی اقبال کے محبوب شاعروں میں شامل ہو گئے ہیں۔ چنانچہ غنی کا یہی فقر گوشہ نشینی اور استغنا اقبال کی توجہ اس حکایت کی طرف پھیر دیتا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ غنی ایک معمولی کمرے میں سکونت کرتا تھا اور جب گھر سے نکل جاتا تھا تو کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ دیتا تھا۔ لیکن جب گھر میں واپس آتا تھا تو دروزہ بند کر دیتا تھا۔ جب غنی سے اس غیر عادی فعل کے بارے میں پوچھا گیا تو اس نے جواب دیا کہ دروازے کا بند کرنا مال و متاع کی حفاظت کے خیال سے ہے چونکہ اس گھر کا مال و متاع میرے اپنے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے۔ اس لیے گھر سے نکلتے وقت دروازہ کھلا چھوڑ دیتا ہوں اور جب واپس آتا ہوں تو دروازہ بند کر دیتا ہوں تا کہ محفوظ رہوں۔ یہ حکایت غنی کے استغناء کامل کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس لیے علامہ اقبال اس سے الہام حاصل کر کے اسے ایک قطعہ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ (۱۱)

یہ قطعہ علامہ اقبال نے ''پیام مشرق'' میں غنی کاشمیری کے عنوان سے یوں پیش کیا ہے:

غنی آن سخن گوئے بلبل صفیر نوا سنج کشمیر مینو نظیر
چو اندر سرابوددر بستہ داشت چو رفت از سرا تختہ روا گزاشت
یکے گفتش اے شاعر دل رسے عجب دار از کار تو ہر کسی
بہ پاسخ چہ خوش گفت مرد فقیر فقیر و باقلیم معنی امیر
زمن آنچہ دید ندیاران رواست درین خانہ جز من تاعے کجاست
غنی تانشیند بہ کاشانہ اش متاعے گرانے است درخانہ اش
چوں آں محفل امروز درخانہ نیست تہی تر ازین ہیچ کاشانہ نیست [12]

غنی اور اقبال دونوں کو دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس تھا۔ دونوں روح کے تقاضوں کو دینوی انہاک پر ترجیح دیتے ہیں۔ دونوں اپنے اپنے مخصوص انداز میں دنیا کی محدود زندگی کو بامعنی بنانے کی تلقین کرتے ہیں۔ اس سے گریز کی نہیں۔ دونوں کا خیال ایک ہے اگرچہ زبان و بیان جداگانہ بھی ہے۔

نے گل بچمن نہ بلبل است ایں
خاکستر و آتش گل است ایں
(غنی)

فریب نظر سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرہَ کائنات
(اقبال)

علامہ اقبال نے ''بانگ درا'' میں ''خطاب بہ جوانان اسلام'' والی نظم میں غنی کاشمیری کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے۔ یہاں علامہ اپنے قوم کے جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے:

تجھے آبا سے اپنی کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
تو گفتار وہ کردار تو ثابت وہ سیارا[۱۳]

علامہ کو یہاں اپنی قیمتی میراث کے کھونے کا غم ہے۔ حکومت سے انہیں کوئی غرض نہیں۔ انہیں غرض صرف اپنے علمی سرمایہ کا ہے جو اغیار کے قبضہ میں ہے۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ ایک عارضی شئے تھے
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھے ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا[۱۴]

اپنے اسلاف کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشین کیا تھے
جہاں گیر جہاں دار و جہاں بان جہاں آرا
گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسمان نے ہم کو دے مارا[۱۵]

اس نظم کا اختتام غنی کاشمیری کے اس شعر پر کیا ہے:

غنی روز سیاہ پیر کنعان را تماشا کن
کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را[۱۶]

اے غنی حضرت یعقوبؑ کی بدقسمتی کو دیکھو کہ خود بیٹے یعنی یوسف کے فراق میں رو رو کے اندھے ہو گئے۔ لیکن ان کے نور چشم یعنی بیٹے نے زلیخا کی نظروں کے سامنے رہ کر اس کی آنکھوں کو روشن کر دیا۔ گویا حقدار تو محروم رہا اور اغیار فیضیاب ہوئے۔

مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ریاض لکھتے ہیں:

''غنی کے اشعار کا انعکاس اقبال کے ہاں بہت کم ہے مگر ان سے اظہار ارادت زیادہ۔ ''بانگ درا'' کی نظم ''خطاب بہ جوانان اسلام'' کا تتمہ غنی کی غزل کا مقطع ہے''۔ (۱۷)

محمد عبداللہ قریشی لکھتے ہیں:

''ملا طاہر غنی کاشمیری کی شخصیت سے وہ اس قدر متاثر تھے کہ ان کے استغناء کا ذکر کرنے کے علاوہ ان کے بعض اشعار پر تضمین بھی لکھیں''۔ (۱۸)

غنی کاشمیری کے تئیں علامہ کے عقیدت کا اظہار ''جاوید نامہ'' میں بھی ملتا ہے۔ یہاں اقبال نے غنی کو ایک عظیم مبلغ اسلام حضرت میر سید علی ہمدانیؒ ۷۸۶ء کے حضور میں جنت الفردوس میں نغمہ خواں دکھایا ہے۔ ''جاوید نامہ'' کی ایک نظم ''زیارت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی و ملا طاہر غنی کاشمیری'' میں علامہ نے بدنصیب ملک کا ذکر بحوالہ میر سید علی ہمدانی و غنی کاشمیری کیا ہے۔ یہاں غنی حوض کوثر پر نغمہ خواں ہیں اور یہاں کشمیری الاصل سیاست والوں کی تعریف کی ہے کہ وہ آزادی ہند کے کوشاں ہیں۔

از تپ یاراں تپیدم در بہشت　　کہنہ غمہارا خریدم در بہشت
تادراں گلشن صدائے درد مند　　از کنار حوض کوثر شد بلند

''جمع کردم مشت خاشا کے کہ سوزم خویش را
گل گماں دارد کہ بندم آشیاں در گلستان''

گفت رومی آنچہ می آید نگر　　دل مدہ با آنچہ بگزشت اے پسر
شاعر رنگین نوا طاہر غنی　　فقر او باطن غنی ظاہر غنی
نغمۂ می خواند آں مست دام　　در حضور سید والا مقام
سید السادات سالار عجم　　دست او معمار تقدیر اُمم

مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ریاض لکھتے ہیں:

''جاوید نامہ (آنسو سے افلاک میں) غنی کا ایک شعر تضمین شدہ ملتا ہے۔ یہاں اقبال نے غنی کو عظیم مبلغ اسلام حضرت میر سید علی ہمدانی شاہ ہمدانؒ (م ۷۸۶ء) کے حضور جنت الفردوس میں نغمہ خواں دکھایا ہے اور ساتھ ساتھ وادی جموں و کشمیر کے انگریزوں کے ہاتھوں ڈوگرہ گلاب سنگھ کو فروخت کیئے جانے (نام نہاد معاہدہ امرتسر ۱۸۴۶ء) اور وادی کی خراب سیاسی حالت پر نالہ کنعاں بھی''۔(۱۹)

کشمیر کی سیاسی حالت کا ذکر کرنے کے ساتھ ساتھ کشمیری قوم کی غربت اور ظلم کا بھی تذکرہ کیا ہے اور آزادئ کشمیر انگریزوں کا ظلم سب چیزوں کو پورا نقشہ کھینچا ہے ان ہی حالات کا تذکرہ علامہ نے اور ایک جگہ بھی کیا ہے:

توڑ دے اس دست جفا کش کو یارب جس نے
روح آزادی کشمیر کو پامال کیا

سرما کی ہواؤں میں ہے عریاں بدن اس کا
دیتا ہے ہنر جس کا امیروں کو دوشالے

علامہ غنی کاشمیری کی زبانی اہل کشمیر کی پستی کا راز جاننا چاہتا ہے۔ شاعر یہاں کشمیر کی گزشتہ عظمت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ایسی دانشمند قوم جس کی ہنر مندی کا اعتراف تمام دنیا نے کیا ہے جس کے شال دوشالے تمام دنیا میں مشہور ہیں، افلاس کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ غلامی کی زندگی کی وجہ سے جذبات مردہ ہو چکے ہیں مگر کسی زمانے میں یہ قوم حوصلہ مند اور بہادر رہ چکی ہے۔

در زمانے صف شکن ہم بودہ است
چیرہ و جاں باز پردم بودہ است

علامہ نے اس نظم میں وادی کشمیر کا نقشہ کھینچا ہے اور اس وادی میں ایک پرندہ (غنی) یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اگر چہ باغ (کشمیر) میں بہار کی فضا پرانی ہی ہے مگر اس باغ (کشمیر) میں کوئی شہاب الدین پیدا نہ ہوسکا۔

عمر ہا گل رفت بر بست و کشاد
خاک ما دیگر شہاب الدین[۲۰] نژاد

اس باغ میں غنی کشمیری کی بے تاب روح یوں نغمہ خوانی کر رہی ہے۔ اقبال نے فنکارانہ انداز میں غنی کی زبانی اپنے خیالات یوں پیش کئے ہیں:

ایں مشت پر کجا سرود ایں چنیں کجا
روح غنی است ماتمی مرگ آرزوے

باد صبا اگر بہ جنیوا گزر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوے
دہقان و کشت وجوے خیاباں فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند[۲۱]

اس شعر میں یہ اشارہ ملتا ہے کہ انگریزوں نے پورا کشمیر گلاب سنگھ کو صرف پچاس لاکھ روپے میں فروخت کیا۔ یہ واقعہ ۱۸۴۶ء کا ہے جب سارا کشمیر غلامی کی زد میں آ گیا۔

''جاوید نامہ'' اقبال نے ۳۱۔۱۹۳۰ء میں لکھی تھی جس وقت کشمیر میں تحریک آزادی چل رہی تھی۔ علامہ کے مطابق کسی قوم کو یہ حق نہیں کہ دوسرے قوم کا سودا کرے۔

می تواں ایراں و ہندوستان خرید بادشاہی را زکس نتواں خرید
جام جم را اے جوان باہنر کس نہ گیرد از دکان شیشہ گر[۲۲]

علامہ اقبال ان حالات میں بھی پُر امید ہیں اور انہیں کشمیری قوم باہنر قوم لگتی ہے اور وہ کسی بھی وقت کوئی بھی مشکل کام انجام دے سکتی ہے۔ انہیں اس بات پر فخر ہے کہ جن برہمن زادوں نے ہندوستان کو ذوق آزادی عطا کیا وہ کشمیر ہی کے باشندے ہیں۔

ہند را ایں ذوق آزادی کہ داد صید را سودائے صیادی کہ داد
آں برہمن زادگان زندہ دل لالۂ احمر ز روے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش از نگاہ شاں فرنگ اندر خروش
اصل شان از خاک دامنگیر است مطلع ایں اختراں کشمیر است[۲۳]

ان حالات میں غنی زندہ رود سے کہتے ہیں کہ

کار و انہا از صدائے تو درا　　تو ز اہل خط نومیدی چرا

اس حوصلہ افزائی کے بعد غنی ایک نوائے مستانہ کی فرمائش کرتا ہے جس کے جواب میں زندہ رود ''زبور عجم'' کی ایک غزل سناتا ہے جو اس کتاب کی بہترین غزلوں میں سے ہے۔ اس کے مطلع میں اقبال کا فلسفہ، تعلیمات قرآنی کا خلاصہ پوشیدہ ہے۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ اگر قوم آپس میں لڑتی رہی تو یہ خطرناک مسئلہ ہے اگر قوم میں اتحاد و اتفاق پیدا ہو تو یہ کسی بھی دشمن کا مقابلہ کر سکتی ہے۔

ہیچ می دانی کہ روزے در ولر　　موجۂ می گفت با موج دگر
چند در قلزم بیک دیگر زنیم　　خیز تا یک دم بساحل سر زنیم
باکران در ساختن مرگ دوام　　گرچہ اندر بحرِ غلطی صبح و شام
زندگی جولامیانِ کوہ دشت　　اے خنک موجے کہ از سال گزشت

حقیقی شاعری وہ ہوتی ہے جس سے قوم کے تقدیر کی تشکیل ہو۔ اس شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے غنی کشمیری کہتے ہیں کہ اقبال تو نے قوموں کو زندہ کر دیا مگر قوم کو تیری شاعری کی کوئی قدر نہیں اس لیے بہشت میں حوروں کو اپنا کلام سناؤ۔ کیونکہ آپ کا کلام شاعری سے بھی (ماورا) بالاتر ہے۔

از نوا تشکیل تقدیر امم　　از نوا تخریب و تعمیر امم
نشتر تو گرچہ در دلہا خلید　　مر ترا چو نانکہ ہستی کس ندید

پردۂ تواز نوائے شاعری است　　آنچہ گوئی ماورائے شاعری است

تازہ آشو بے فگند اندر بہشت
یک نوا مستانہ زن اندر بہشت[۲۴]

''جاوید نامہ'' میں اقبال نے غنی کاشمیری کی عظیم المرتبت شخصیت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔سید عبدالواحد لکھتے ہیں:

''ان اشعار میں اقبال نے غنی کی زبانی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔اقبال کو اہل کشمیر کے شاندار مستقبل پر یقین واثق ہے وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ایسی جفاکش، چرب دست اور ذہین قوم محکوم نہیں رہ سکتی''۔(۲۵)

❁❁❁

علامہ اقبال اور خواجہ حافظ شیرازی

شمس الدین محمد حافظ جنہیں لسان الغیب کا لقب دیا گیا ہے۔ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل میں ۷۲۶ء کے قریب شیراز میں پیدا ہوئے۔تذکروں میں ان کے والد کا نام بہاءالدین لکھا ہے جو فارس کے سلفری اتابکوں کے عہد میں اصفہان سے ہجرت کر کے شیراز چلے آئے تھے۔خواجہ حافظ کی والدہ کازرون کی رہنے والی تھیں۔(۱)

''خواجہ حافظ کے آباواجداد اصفہان سے آئے تھے اور شیراز میں سکونت پذیر ہوگئے تھے۔جو اس وقت سلطنت کا پایہ تخت تھا۔خواجہ کے والد کا نام بہاءالدین تھا اور تجارت ان کا ذریعہ معاش تھا اور وہ شیرازہ کے دولتمندوں میں شمار ہوتے تھے۔ باپ کے انتقال کے بعد ساری جائیداد بیٹوں نے ترکہ میں پائی لیکن انہوں نے اپنی نالائقی کے سبب اسے چند ہی دن میں برباد کر دیا۔

خواجہ ان سب میں چھوٹے تھے۔بچپن کا زمانہ بڑی عسرت اور تنگدستی میں گزارا جب وہ ذرا بڑے ہوئے تو ایک نانبائی کے یہاں خمیر بنانے کا کام شروع کر دیا۔ پاس ہی ایک مکتب تھا جب ادھر سے گزرتے تو اور لڑکوں کو مدرسے جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں سوچتے کہ کاش یہ موقعہ مجھے بھی نصیب ہوتا۔ چنانچہ کسی نہ کسی طرح انہوں نے وقت

نکال کر مدرسہ میں داخلہ ہی لیا۔ کام کی جو اجرأت تھی اس میں ایک تہائی ماں کو دیتے، ایک تہائی تعلیم کا خرچ ادا کرتے اور بقیہ ایک تہائی اللہ کی راہ میں خیرات کر دیتے۔ جس شخص کی ابتدائی زندگی میں شوق علم اور تقویٰ کا یہ عالم ہو پھر اس کے آگے کی زندگی کا کیا کہنا''۔(۲)

حافظ نے متداول، علوم کی تحصیل اپنے وطن ہی میں کی۔ اپنے زمانے کے بڑے بڑے علماء کی مجلس درس سے استفادہ کیا اور ان علوم میں ایک بلند مقام پر پہنچ گئے۔ ان علماء میں ایک قوام الدین عبداللہ (متوفی ۷۸۲) بھی تھے۔ محمد گلندام جو حافظ کے ہم عصر اہل فضل اور متذکرہ قوام الدین عبداللہ کے حلقۂ درس میں ہمیشہ شریک رہنے والوں میں تھے کی شہادت موجود ہے کہ ہمارا بلند پایہ شاعر ''تحشیہ کشاف و مصباح، مطالعہ مطالع و مفتاح وتحصیل قوانین ادب وتحسین و داویں عرب'' پر قدرت رکھتا تھا۔ ظاہر ہے کہ کشاف سے مراد تفسیر میں زمخشری متوفی (۵۲۸) کی کشاف نحو میں مطرزی (متوفی ۶۱۰) کی مصباح، حکمت میں بیضاوی (وفات در آخر قرآن ہفتم) کی طوالع الانور میں مطالع الانظار یا منطق میں قطب الدین رازی کی شرح مطالعہ اور ادب میں سکاکی (متوفی ۶۲۶) کی فتاح العلوم ہے۔(۳)

حافظ کی شعر و شاعری کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ محلے میں ایک بزاز رہتا تھا جس کی دکان پر اکثر شعر و سخن کی محفلیں گرم رہا کرتی تھیں۔ خواجہ حافظ بھی فرصت کے اوقات میں وہاں پہونچ جاتے تھے اور دوسروں کو دیکھتے دیکھتے خود بھی شعر کہنے لگے لیکن طبیعت کچھ موزوں نہ پاتی تھی۔ اس لیے اکثر ان کا کلام دوسروں کے لیے تفریح کا سامان ہوتا تھا۔ حافظ اس سبب سے دل گرفتہ ہوئے اور ایک دن بابا کوہی نامی ایک بزرگ کے

مزار پر گئے اور پھوٹ پھوٹ کر روئے، رات کو خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ ان کو لقمہ کھلا رہے ہیں اور کہتے ہیں جا۔اب تجھ پر علم وادب کے دروازے کھل گئے۔صبح کو اٹھے تو یہ غزل شروع کی:

دوش وقت سحر از غصہ نجاتم دادند   وندراں ظلمت شب آب حیاتم دادند

اس کے بعد سے خواجہ کی غزل گوئی کی شہرت گھر گھر عام ہوگئی اور لوگوں کی وہ دلچسپی سنجیدگی اور احترام میں بدل گئی۔(۴)

حافظ نے قرآن کا گہرا مطالعہ کیا اور اسے حفظ بھی کرلیا تھا۔انہوں نے تخلص بھی اس رعایت سے اختیار کیا تھا۔ان کے بعض اشعار سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے۔چنانچہ کہتے ہیں:

ندیدیم خوش تراز شعرتو حافظ   بقرآنی کہ تو در سینہ داری

اورعرفان کے لطیف ذوق کے ساتھ وہ حکمت کی تعلیم قرآنی آیات کے ساتھ دیتے ہیں۔خودفرماتے ہیں:

زحافظان جہاں کس چو بندہ جمع نکرد   لطایف حکماء با کتاب قرآنی[۵]

حافظ شیرازی کی شہرت اس قدر عام ہوئی کہ نہ صرف شیراز کے امراء وسلاطین نے ان کی قدر اور حوصلہ افزائی کی بلکہ دور دور سے ان کو بلانے کے دعوت نامے آگئے۔خواجہ نے اپنے زمانے میں شیراز کی سلطنت پر مختلف بادشاہوں کی شام وسحر دیکھی۔ ہر ایک نے آپ کے علم وفضل کی قدر کی، آپ نے اپنی شاعری میں شعراء، علماء اور حکماء کا ذکر کیا ہے۔ بادشاہوں کا ذکر بھی حافظ کی شاعری میں ملتا ہے۔شاہ شجاع ایک بہت

صاحب علم وفن اور خواجہ صاحب کا بڑا قدر دان تاجدار گزرا ہے۔ اس نے تخت نشین ہوتے ہی میکدوں سے پابندیاں اٹھادیں جو اس کے پیشروؤں نے عائد کررکھی تھیں۔ خواجہ صاحب نے ایک پوری غزل اس خوشی میں لکھ ڈالی جس کا مطلع ہے

سحر ز ہاتف غیبم رسد مژدہ بہ گوش
کہ دور شاہ شجاع ست مے دلیرانہ بہ نوش[٦]

شاہ شجاع کے دربار میں ایک فقیہ خواجہ عماد تھے جن سے شاہ شجاع کو بڑا اعتقاد تھا۔ خواجہ عماد نے ایک بلی پال رہی تھی اور جس کو اسی طرح تعلیم دے رکھی تھی کہ جب وہ نماز پڑھتے تو بلی بھی اسی انداز سے ارکان نماز ادا کرتی۔ خواجہ صاحب کو یہ ریا و مکر کب گوارا ہوسکتا تھا۔ اپنی ایک غزل میں اس کا یوں پردہ فاش کردیا ؎

اے کبک خوش خرام کہ خوش می روی بہ ناز
غرہ مشو کہ گربۂ عابد نماز کرد

خواجہ عماد کو یہ بات بری لگی اور انہوں نے شاہ شجاع سے خواجہ صاحب کی شکایتیں کرنا شروع کردیں۔ ایک دن شاہ نے خواجہ صاحب کو بلایا اور کہا کہ آپ کے کلام میں کوئی یکسانیت اور ہمواری نہیں ہے۔ ایک شعر تصوف، دوسرا مے نوشی، تیسرا شاہد بازی۔ خواجہ صاحب نے فرمایا۔ ہاں ان سب برائیوں کے باوجود میری غزلیں زبان سے نکلتے ہی دنیا میں پھیل جاتی ہیں۔ شاہ شجاع اس جواب کو سن کر خاموش ہوگیا۔ (۷)

اسی عہد کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک سال تیمور بادل کی طرح گرجتا ہوا ایک بڑے لشکر کے ساتھ شیراز پر حملہ آور ہوا۔ ایرانی فوجیں اس کے حملوں کی تاب نہ لاسکیں اور شیراز دم کے دم میں فتح ہوگیا۔ تیمور شاہ شجاع کے بھائی نصرت الدین کو شیراز کی سلطنت سپرد کر کے خود واپس جانے لگا۔ خواجہ حافظ کو بھی طلب کیا اور پوچھا یہ شعر آپ کا ہے۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را

خواجہ صاحب نے فرمایا: ہاں اس پر تیمور نے کہا میں نے تمام دنیا اس لیے فتح کیا ہے کہ اپنے وطن سمرقند و بخارا کو مالا مال کردوں اور آپ اسے معشوق کے ایک تل کے عوض دے دیتے ہیں۔ خواجہ صاحب نے مسکرا کر کہا انہی فیاضیوں کا تو یہ نتیجہ ہے کہ میں تنگدستی کی حالت میں ہوں۔ (۸)

خواجہ حافظ نے ۷۹۱ کو شیراز میں وفات پائی اور شہر کے اسی حصے میں جس کی سیر و تفریح سے وہ اپنا دل بہلاتے تھے اور اس کی گل گشت ان کی محبوب تفریح گاہ تھی اور جس کا نام ''مصلیٰ'' تھا سپرد خاک کیے گئے۔ اب اسی مقام پر اس بلند مرتبہ شاعر کے شایان شان مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے کسی شاعر نے ''خاک مصلیٰ'' ہی سے شاعر کی وفات تاریخ نکالی۔ کہتا ہے۔

چراغ اہلِ معنی خواجہ حافظ — کہ شمعی بود از نور تجلی
چو در خاک مصلیٰ ساخت منزل — بجو تاریخش از خاک مصلیٰ[9]

حافظ نے اپنی شاعری میں مختلف موضوعات کو مختلف طریقوں اور شاعری صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ بڑی شیرینی اور سادگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ کا کلام کافی مشہور ہوا۔ دنیا میں انسان کو جن دشواریوں اور ناکامیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، ظاہر ہے کہ انسان کو کبھی کبھی پستی کا عالم بھی دیکھنا پڑتا ہے۔ حافظ نے اپنے عارفانہ ارادوں اور فیروزمند جولانیوں کو پست نہ ہونے دیا۔ اس کے عزم میں کبھی فرق نہ آیا شوق حیات اور نور امید سے اس کا دل محرم نہ ہونے پایا بلکہ اس نے سینہ سپر ہوکر حوادث کا مقابلہ کیا[10] خود کہتے ہیں:

بگذر ایں روزگار تلخ تراز زہر   بار دگر روزگار چوں شکر آید
بلبل عاشق تو عمر خواہ کہ آخر   باغ شود سبز و سرخ گل بدر آید
صبر و ظفر دو دوستان قدیمند   بر اثر صبر نوبت طفر آید[11]

علامہ اقبال نے اس عظیم المرتبت شاعر اور شخصیت کا ذکر نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ اپنی شاعری اور خطوط میں کیا ہے۔ علامہ نے حافظ کے کئی اشعار کو تضمین بھی کیا ہے اور ان کی شاعری سے متاثر بھی نظر آتے ہیں۔ اگرچہ علامہ حافظ کی شاعری میں جمود، گوشہ نشینی اور مایوسی جیسی بڑی چیزوں کو پسند نہیں کرتے مگر پھر بھی علامہ نے حافظ کے شاعرانہ فن کو سراہا ہے اور ان کو اپنی شاعری میں وہ مقام عطا کیا ہے جس کے حافظ شیرازی مستحق تھے۔ جہاں علامہ نے ''اسرار خودی'' میں حافظ کی

شاعری پر اعتراضات کیے ہیں وہاں ''پیام مشرق'' میں وہ حافظ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ علامہ نے حافظ کے کئی اشعار کو اپنی شاعری میں درج کیا ہے۔ وہ حافظ کے فن کی قدر کرتے ہیں اور داد دیتے ہیں۔ ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

''اقبال حافظ کو فنکار کی حیثیت سے بلند مقام پر فائز کرتے ہیں مگر وہ ایسے فنکار کو (خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو) جو عوام کے اخلاق پر برا اثر ڈالے پسند نہیں کرتے''۔ (۱۲)

مہاراجہ کرشن پرشاد کے نام ایک خط میں مورخہ ۳/اپریل ۱۹۱۴ء کو لکھتے ہیں:

''خواجہ حافظ کی شاعری کا میں معترف ہوں میرا عقیدہ ہے کہ ویسا شاعر ایشیا میں آج تک پیدا نہ ہو سکا اور غالباً پیدا نہیں ہوگا لیکن جس کیفیت کو وہ پڑھنے والے کے دل پر پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ کیفیت قوائے حیات کو کمزور اور ناتواں کرنے والی ہے''۔ (۱۳)

علامہ نے حافظ شیرازی کی شاعری سے نہ صرف اثرات قبول کر لئے بلکہ انہوں نے ان کی شاعری سے استفادہ بھی کیا۔ وہ ان کے اسلوب کو کافی پسند کرتے ہیں۔

اقبال کو حافظ کا مخالف سمجھا جاتا رہا ہے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں اقبال بدو شعور سے آخری ایام تک حافظ کی فنی عظمت کے دل سے قائل رہے۔ اسلوب کے اعتبار سے حافظ ان کے محبوب ترین شعراء میں شامل ہیں۔

اقبال نے حافظ کی مقبولیت کے پیش نظر ان کے اشعار کے بعض معانی سے اختلاف کیا۔ یہ ایسا ہی اختلاف تھا جیسے امام محمد غزالی (م ۵۰۵ء) کو بوعلی سینا (۴۲۸ھ) سے تھا یا ابن رشد (۵۹۵ ۃ) کو غزالی سے تھا۔ امام محمد غزلی، ابن سینا، یا ابن رشد غزالی کی عظمت کے قائل تھے اسی طرح اقبال حافظ کی فنی عظمت کے مدح خوان رہے ہیں۔ (۱۴)

ان باتوں کے علاوہ علامہ اور حافظ شیرازی کی شاعری میں مماثلت کے کئی پہلو نظر آتے ہیں۔ دونوں میں جہاں اصولی اختلافات موجود ہیں وہیں دونوں کی فارسی شاعری کا معیار ایک ہی نظر آتا ہے۔ علامہ نے بخوبی حافظ کا رنگ اپنایا۔ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''اقبال کی کئی فارسی غزلیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو دیوانِ حافظ میں داخل کر دیا جائے تو پڑھنے والے حافظ کے کلام سے اس کا امتیاز نہ کر سکیں''۔ (۱۵)

ان ہی مماثلتی پہلوؤں کا ذکر کرتے ہوئے محمد منور لکھتے ہیں:

''حق یہ ہے کہ حافظ کے حسن بیان، حسن اختراع، حسن تراکیب اور حسن آہنگ کا اثر علامہ اقبال پر تمام عمر رہا۔ حافظ کے فقر و مستی اور درویشی و بے نیازی کے مضامین بھی نقطہ نظر کے اختلافات کے باوصف علامہ اقبال کے دل و دماغ پر مستقل اثرات چھوڑ گئے''۔ (۱۶)

پروفیسر نذیر احمد دونوں شعراء کے مماثلت پر تبصرہ یوں کرتے ہیں:

''دونوں اسلامی توحید کے قائل اور وحدت الوجود کے منکر نظر آتے ہیں۔ دونوں کی شاعری میں دل وجدانی ادراک کا مرکز قرار دیا گیا ہے

اس کا آئینہ جمال الٰہی کا پرتو ہے۔انسانی عظمت کے بارے میں دونوں شاعر متحد الخیال ہیں۔دونوں نے فقر واستغنا کو سراہا ہے۔دونوں کے نزدیک قناعت و توکل کا مقصد استغنا ہے۔مرد قلندر کا استغنا اور درویشی کی شان دونوں کی سیرت کا جز ہے۔واعظ، زاہد اور صوفی کی پردہ دری دونوں کا دلچسپ موضوع ہے۔اقبال کے یہاں دعوت سعی و عمل کا جذبہ شدت سے کارفرما ہے لیکن حافظ کی شاعری میں یہ عنصر کلیتاً ناپید نہیں۔دونوں فنکاروں نے رضائے الٰہی کو مقصود حیات سمجھا ہے۔منصور حلاج دونوں کا ممدوح ہے۔حافظ کے نزدیک وہ عشق و سرمستی کا پیکر مجسم ہے اور اقبال اسے اثبات ذات کا مظہر سمجھتے ہیں"۔(۱۷)

ان مماثلتی پہلوؤں کے علاوہ دونوں میں اختلافات بھی نظر آتے ہیں۔

"حافظ کی شاعری اندرونی جذبات و احساسات کی عکاسی اور مقصدیت سے دور ہے ان کے نزدیک انسان مجبور ہے اس کا دائرہ عمل مقدرات کے حدود سے باہر نہیں ہے۔اس کے برخلاف اقبال کی اجتماعی مقصدیت کا تقاضا ہے کہ وہ انسان کو مجبور محض نہ مانے وہ بڑی حد تک انسان کو اپنی کام ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔حافظ کے اشعار میں خودی کا مروجہ تصور کارفرما ہے۔اس کے نزدیک خودی کا احساس مٹانا ضروری ہے۔اقبال خودی کے تصور میں منفرد ہیں۔اساس خودی ان کی شاعری اور فکر میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔اسی وجہ سے انسان میں دائمہ آرزومندی اور جستجو پیدا ہوتی ہے۔اسی کو عشق و شوق کہتے ہیں۔اس طرح خودی اور شوق ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ ہو جاتے ہیں"۔(۱۸)

شروع میں اقبال نے حافظ پر تنقید کی تھی لیکن بعد میں اس نے محسوس کیا کہ اپنی مقصدیت کو موثر بنانے کے لیے حافظ کا پیرائیہ بیان اختیار کرنا ضروری ہے۔ چنانچہ اس نے حافظ کے طرز اسلوب کا شعوری طور پر تتبع کیا اور بعض اوقات جیسا کہ اس نے کہا ہے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کہ حافظ کی روح اس میں حلول کر آئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ طرز اسلوب میں وہ حافظ سے بہت قریب ہے۔ (۱۹)

۱۹۱۵ء اقبال کی پہلی فارسی تصنیف ''اسرار خودی'' چھپ کر سامنے آئی۔ اس پر افلاطون کے فلسفہ اور حافظ کی شاعری پر اعتراضات تھے اور اس وجہ سے اقبال کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس لیے اقبال نے آئندہ ایڈیشن میں یہ اشعار حذف کر دئے اور باقی اشعار کو ''در حقیقت شعر و اصلاح ادبیات اسلامیہ'' عنوان کے تحت باقی رہنے دیا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے بھی اقبال کے بیان فرمودہ نکات کے مطابق ہی دیوان حافظ کا پڑھنا ممنوع قرار دیا تھا۔ (۲۰)

ان اشعار میں انہوں نے حافظ کو ''فقیہ ملت میخوارگاں'' اور ''امام امت بیچارگاں'' کے القاب سے یاد کیا ہے۔ ان کے اشعار کو زہر کا نام دیا گیا ہے اور ان کے ''نغمۂ چنگ کو'' ذلیل انحطاط کہا ہے۔ (۲۱)

اس بارے میں فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

۱۹۱۴ء میں مثنوی اسرار خودی زیر تکمیل تھی۔ اس لیے رات کی مجلسوں میں اس کے مضامین کا ذکر رہتا۔ بعض اوقات علامہ اپنے والد کو مثنوی کے

اشعار سناتے۔ ایک دن فرمایا کہ اس مثنوی میں اس حقیقی اسلام کو جسے رسول مقبول ﷺ نے پیش کیا تھا دکھانا چاہتا ہوں کیونکہ ''ہندوستان کے مسلمان اس عربی اسلام کو بہت کچھ فراموش کر چکے ہیں اور عجمی اسلام ہی کو سب کچھ سمجھ رکھا ہے''۔

گفتگو کے دوران تصوف کا ذکر چھڑ گیا۔ علامہ عجمی تصوف کے رائج الوقت مفہوم کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اکثر ایرانی شعراء پر کڑی تنقید اور نکتہ چینی کرتے اور فرماتے انہوں نے بڑی "Subtle" انداز میں شعائر اسلام پر چوٹیں بلکہ تردید کی ہے۔

۱۹۱۵ء میں جب اسرار خودی شائع ہوئی۔ اس کا ایک نسخہ علامہ نے اپنے والد کو بھی بھیجا۔ جسے عام طور پر وہ صبح کے وقت بڑے شوق کے ساتھ پڑھا کرتے .... علامہ کی مثنوی ''اسرار خودی'' کے خلاف جب یہ ہنگامہ گرم تھا، انہی دنوں علامہ سیالکوٹ تشریف لائے اور باپ بیٹے جب یکجا بیٹھے تو مثنوی پر حلقۂ صوفیا کی برہمی کا ذکر آیا۔ علامہ نے فرمایا: میں نے حافظ کی ذات اور شخصیت پر اعتراض نہیں کیا ہے۔ میں نے صرف ایک اصول کی تشریح کی ہے۔ اس کا افسوس ہے کہ مسلمانان وطن پر عجمی اثرات اس قدر غالب آ چکے ہیں کہ وہ زہر کو آب حیات سمجھتے ہیں۔ علامہ کے والد بزرگوار نے بڑی مرنجان مرنج طبیعت پائی تھی۔ انہوں نے اس پر فرمایا کہ اگر حافظ کے عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس لگائے بغیر اصول کی تشریح کر دی جاتی تو اچھا تھا۔ علامہ نے اس

کے جواب میں کہا ''یہ حافظ پرستی بھی تو بت پرستی سے کم نہیں اس پر ان کے والد نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول نے تو بتوں کو بھی برا کہنے سے منع فرمایا ہے۔اس لیے مثنوی کے وہ اشعار جن پر عقیدت مندان حافظ کو اعتراض ہے آئندہ ایڈیشن میں ان کا حذف کر دینا ہی مناسب ہوگا۔ علامہ نے اس پر زبان سے کچھ نہیں کہا، بس مسکرا کر رہ گئے اور اپنے والد محترم سے بحث کرنے کے بجائے ان کے حضور سر تسلیم خم کر دیا بعد کی اشاعتوں میں علامہ نے حسب ذیل ۳۵/اشعار مثنوی سے خارج کر دیے۔

ہوشیار از حافظ صہبا گسار ۔۔۔ جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہن ساقی خرقۂ پرہیز او ۔۔۔ مے علاج ہول رستا خیز او
نیست غیر از بادہ در بازار او ۔۔۔ از دو جام آشفتہ شد دستار او
چوں خراب از بادہ گلگوں شود ۔۔۔ مایہ دار حشمت قاروں شود
مفتی اقلیم او مینار بدوش ۔۔۔ محتسب ممنون پیر مے فروش
طوف ساغر کرد مثل رنگ مے ۔۔۔ خواست فتویٰ از رباب و چنگ و مے
در رموز عیش و مستی کاملے ۔۔۔ از خم خون و لے پادر گلے
رفت و شغل ساغر و ساقی گذاشت ۔۔۔ بزم رندان و مئے باقی گزاشت
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید ۔۔۔ عیش ہم در منزل جانان ندید
در محبت پیروِ فرہاد بود ۔۔۔ بر لب او شعلہ فریاد بود
تخم نخل آہ در کہسار کاشت ۔۔۔ طاقت پیکار با خسرو نداشت
مسلم و ایمان او زنار دار ۔۔۔ رخنہ اندر دینش از مژگان یار

آنچناں مست شراب بندگی ست — خواجہ و محرم ذوق خواجگی ست
''دعویٰ او نیست غیر از قال و قیل — دست او کوتاہ و خرما بر نخیل''
آں فقیر ملت میخوار گاں — آں امام امت بے چار گاں
گوسفند است و نو آموخت است — عشوہ و ناز و ادا آموخت است
دلربائی ہائے او زہر است و بس — چشم او غارت گر شہر است بس
صنعت را نام توانائی دہد — ساز او اقوام را اغوا کند
از بز یونان زمین زیر کتر است — پردۂ عودش حجاب اکبر است
نغمۂ چنگش دلیل انحطاط — ہاتف او جبرئیل انحطاط
بگزر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدان حسن دارو حشیش
از تخیل جنتے پیدا کند — مر ترا بر نیستی شیدا کند!
ناوک اندازے کہ تاب از دل برد — ناوک او مرگ را شیریں کند
مار گلزارے کہ دار و زہر ناب — صید را اول ہمی آراد بخواب
عشق با سحر نگاہش خودکشی است — کشتنش مشکل کہ مار خانگی است
حافظ جادو بیاں شیرازی است — عرفی آتش زبان شیرازی است
ایں سوئے ملک خودی مرکب جہاند — ایں کنار آب رکن آباد ماند
این قتیل ہمت مردانۂ — آں ز رمز زندگی بے گانہ
دست ایں گیرد ز انجم خوشہ — چشم آں از اشک دارو توشہ
روز محشر رحم اگر گوید بگیر — عرفیا! فردوس و خوار و حریر
غیرت او خندہ بر خوراء زند — پشت پا بر جنت الماویٰ زند

باده زن با عرفی ہنگامہ خیر! زنده؟ از صحبت حافظ گریز
ایں فسوں خواں زندگی از مار بود جام اوشان جمی از مار بود
محفل او در خور ابرار نیست ساغر او قابل احرار نیست
بے نیاز از محفل حافظ گزر الحذر ماز کو سفنداں الحذر[۲۲]

مذکورہ اشعار میں عرفی کو حافظ پر ترجیح دی گئی ہے کیونکہ عرفی کے یہاں جوش اور توانائی ملتی ہے اور حافظ کے ہاں کاہلی اور سستی مگر پھر بھی علامہ حافظ سے کافی متاثر نظر آتے ہیں۔ یوسف حسین خان لکھتے ہیں:

''اس کڑی تنقید میں بھی اقبال حافظ کے پیرایہ بیان کے جادو سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا چنانچہ اس کا یہ مصرعہ ''از دم جام آشفتہ شد وستار او'' حافظ کے اس شعر کی آواز بازگشت ہے جس میں اس نے صوفی کی کم ظرفی ظاہر کی ہے کہ تھوڑی سی پی کر اس نے اپنی ٹوپی ٹیڑھی کر لی دو پیالے اور پی لیتا تو اس کی ساری پگڑی زمین پر گر جاتی۔

صوفی سر خوش ازیں دست کہ کج کرد کلاہ
بد و جام دگر آشفتہ شد دستارش

اقبال کا یہ مصرعہ از دو جام آشفتہ شد دستا او حافظ کے مندرجہ بالا شعر کے زیر اثر لکھا گیا ہے''۔ (۲۳)

فنی لحاظ سے علامہ حافظ کے کلام کا معترف تھا۔ حافظ کا کلام حسین اور دلکش ہے مگر علامہ کے نزدیک اس کی افادیت بہت کم ہے کیونکہ حافظ کی شاعری کے برے اثرات سے علامہ خوش نہ تھے۔ علامہ نے

حافظ پر تنقیدی اشعار کو دوسرے ایڈیشن میں حذف کر دیا۔ کیا علامہ کو حافظ کی شاعری نے خوفزدہ کیا تھا[۲۴] یا یہ وجہ تھی کہ ان کے والد صاحب نے انہیں ایسا کرنے کو کہا اس مسئلہ کے بارے میں مختلف کوششیں کارفرما تھیں۔ اکبرالہ آبادی نے بھی علامہ کو اس بارے میں اپنی رائے دی تھی اس کے علاوہ علامہ نے کس بنیاد پر اشعار کو حذف کر دیا۔ وہ علامہ ہی جانتے ہیں مگر یوسف حسین خان مذکورہ اشعار کو حذف کرنے کے بارے میں لکھتے ہیں۔

''اسرار خودی کے دوسرے ایڈیشن میں یہ حصہ خارج کر دیا گیا میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں وہ اکبرالہ آبادی کی رائے سے بھی متاثر ہوا۔ اقبال نے حافظ پر اور تصوف کے متعلق جو اعتراضات کئے تھے ان سے صوفیوں میں بڑی برہمی پیدا ہوگئی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے اقبال کے خلاف مضامین لکھے جن کے جواب اس نے امرتسر کے اخبار وکیل میں شائع کئے۔ اس بحثا بحثی نے کافی طول کھینچا۔ اکبرالہ آبادی بھی اس معاملے میں خواجہ حسن نظامی کے ہم نوا تھے۔ لیکن چونکہ ذاتی طور پر وہ اقبال کو عزیز رکھتے تھے اس لیے انہوں نے خواجہ حسن نظامی پر روک کا کام کیا اپنے ایک خط میں خواجہ صاحب کو مشورہ دیا کہ اقبال سے زیادہ نہ لڑے۔ دعائے ترقی و درستی اقبال کیجیے''۔ (۲۵)

علامہ اقبال نے اکبرالہ آبادی کے نام بھی خطوط ارسال کئے تاکہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے۔

''میری بدنصیبی یہ ہے کہ آپ نے اسرار خودی کو اب تک نہیں پڑھا ہے۔ میں نے گزشتہ خط میں عرض بھی کیا تھا کہ ایک مسلمان پر بدظنی کرنے

سے محترز رہنے کے لیے میری خاطر اسے ایک دفعہ پڑھ لیجئے"۔(۲۶)

علامہ محمد اسلم جیراج پوری کے نام لکھتے ہیں:

"خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے تھے ان کا مقصد محض ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیع تھا۔خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا۔مگر عوام اس باریک امتیاز کو نہ سمجھ سکے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔اگر لٹریری اصول یہ ہے کہ حسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں خواہ مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعراء میں سے ہیں"۔(۲۷)

اور ایک خط میں علامہ اکبر الہ آبادی کو لکھتے ہیں:

"اسرار خودی میں جو کچھ لکھا ہے وہ ایک لٹریری نصب العین کی تنقید تھی جو مسلمانوں میں کئی صدیوں سے پاپولر (popular) ہے۔اپنے وقت میں اس نصب العین سے ضرور فائدہ ہوا۔اس وقت یہ غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ہے۔خواجہ حافظ کی ولایت سے اس تنقید میں کوئی سروکار نہ تھا نہ ان کی شخصیت سے نہ ان اشعار میں "مے" سے مراد وہ "مے" ہے جو لوگ ہوٹلوں میں پیتے ہیں بلکہ اس سے وہ حالت سکر (Narcotic) مراد ہے جو حافظ سے بحیثیت مجموعی پیدا ہوتی ہے"۔(۲۸)

"خواجہ حافظ کے متعلق ایک معاصرانہ شہادت ملفوظات شاہ جہانگیر اشرف میں پائی جاتی ہے۔ یہ کتاب کمیاب ہے مگر معلوم نہیں کہ یہ ملفوظات کس نے جمع کیے اور شاہ جہانگیر اشرف کی وفات کے کس قدر عرصے بعد؟ شاہ جہانگیر اشرف حافظ کے ہمعصر تھے اور جامع ملفوظات

لکھتا ہے کہ شاہ جہانگیر حافظ کو ولی کامل تصور کرتے تھے اور وہ حافظ سے ہم صحبت رہے ہیں۔اس کے متعلق بھی میں جستجو کر رہا ہوں‘‘۔

اس خط میں حافظ کے صوفی ہونے کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے مولانا جامی کی رائے لکھتے ہیں:

’’مولانا جامی کی نفحات الانس بھی ملاحظہ کیجیے اور غور سے دیکھئے کہ مولانا نے کس قدر احتیاط سے حافظ کے متعلق لکھا ہے............

پھر لکھتے ہیں:

تصوف کا سب سے پہلا شاعر عراقی ہے......اور سب سے آخری شاعر حافظ ہے (اگر اسے صوفی سمجھا جائے)۔‘‘(۲۹)

اقبال قوم میں جمود اور سستی کو ختم کرنے کے خواہاں تھے وہ چاہتے تھے کہ محکوم قوم غلامی کی زنجیروں کو یقین محکم اور عمل پیہم کے ذریعے ہی توڑ سکتی ہے۔اقبال کا خیال ہے کہ حافظ کی متصوفانہ شاعری سے جماعت کی قوت عمل کمزور ہوگی۔ان کے مطابق حرکت وعمل کے بغیر کوئی بھی قوم سر بلندی حاصل نہیں کرسکتی۔

ایسی کوئی دنیا نہیں افلاک کے نیچے
بے محرکہ ہاتھ آئیں جہاں تخت جم و کے

اقبال ایسی شراب پلانے کے حق میں ہیں جس میں مقصدیت ہو۔وہ اس شراب کے حق میں نہیں ہے جس سے قوم می مست و بے عمل ہو جائے۔

تجھ کو خبر نہیں کیا بزم کہن بدل گئی

اب نہ خدا کے واسطے ان کو مے مجاز دے

علامہ نے حافظ کی تنقید کرتے ہوئے بھی ان کی فنی عظمت کو سراہا ہے۔ چنانچہ اقبال کی فارسی غزلوں کا پہلا مجوعہ ''پیام مشرق'' ہے جسے ''مے باقی'' کا عنوان دیا گیا ہے اس کی پہلی غزل ہی میں اقبال نے اپنی اجتماعی معنویت اور زندگی کے ممکنات کو صاف صاف بیان کیا ہے۔ یہ غزلیات حافظ کے رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی ہے خاص کر ''مے باقی'' کا عنوان حافظ ہی کی ترکیب ہے۔

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نخواہی یافت

کنار آب رکنا بادو گلگشت مصلا را

حافظ کے ساتھ اقبال کے بے پناہ لگاؤ کا ذکر کرتے ہوئے عطیہ بیگم فیضی لکھتی ہیں:

''باتوں باتوں میں حافظ کا ذکر چھڑ گیا چونکہ مجھے اس عظیم شاعر سے دلچسپی تھی میں نے اس کے کئی برمحل شعر سنائے مجھے پتہ چلا کہ اقبال بھی حافظ کے لیے بے حد مداح ہیں۔ انہوں نے کہا جب میری طبیعت کا میلان حافظ کی طرح ہوتا ہے تو اس کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہے اور میری شخصیت اس کی شخصیت میں گم ہو جاتی ہے اور میں خود حافظ بن جاتا ہوں''۔(۳۰)

علامہ اقبال کی مثنوی ''اسرار خودی'' کا ترجمہ پروفیسر نکلسن نے

کیا۔ ۱۹۲۰ء میں یہ اشاعت ہوا۔ علامہ اقبال نے اس کا ذکر اپنے والد کے نام ایک خط میں کیا۔

"آپ کو معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ جب یہ مثنوی شائع ہوئی تھی تو یہاں کے صوفیاء نے اس پر اعتراض کیا تھا کہ مصنف مسلمانوں کو مغربی خیالات سکھاتا ہے اور ان کو ان کی فرنگیت کے رنگ میں رنگنا چاہتا ہے لیکن مغرب کے مترجم نے دیباچے میں لکھا ہے کہ یہ مثنوی زبردست آواز ہے جو مسلمانوں کو محمد ﷺ اور قرآن کی طرف بلاتی ہے اور اس آواز میں جو سوز صداقت ہے اس کی ہم تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتے"۔(۳۱)

علامہ نے اس تاثر کا اظہار ایک اور جگہ یوں فرمایا۔ فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

"کہ جس قوم کے لیے یہ مثنوی کہی گئی ہے وہ نہ تو ٹھیک طرح سے اس کے مفہوم کی تہہ کو پہنچتی ہے اور نہ اس آواز اور پیغام کو سنتی ہے مگر جن قوموں سے اس مثنوی میں خطاب ہی نہیں کیا گیا وہ اس کا مطلب سمجھ گئی ہیں۔

علامہ اقبال کی حیات میں بعض صوفیاء نے ان پر خوب کس کر تنقید کی بلکہ دشنام طرازی پر اتر آئے۔ ان کو "فلسفی فطرت زدیں برگشتہ" تک کہہ دیا مگر وفات کے بعد ۲۵/اپریل کو اخبارات میں حسب ذیل خبر بھی نظر سے گزری۔

علامہ اقبال کو بزم جمالی کا خراج عقیدت

بزم جمالی کے زیر اہتمام حکیم الامت مفکر اعظم علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ کا یوم منایا گیا جس میں صوفیہ کرام ومشائخ عظام نے حلقہ، ذکر و شغل فاتحہ خوانی ونعت خوانی کر کے اور قرآن خوانی کا ثواب پہنچا کر خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقع پر علامہ کا صوفیانہ یا عارفانہ کلام پیش کیا گیا۔ علامہ اقبال نے بحیثیت صوفی کے جو خدمت واشاعت دین اسلام کی ہے اس کو سراہا گیا۔ آپ کا روحانی اور ابدی پیغام دنیا کے لیے راہ رشد وہدایت ہے اور زندہ جاوید یادگار رہے۔

''ہائے اس زود پشیمان کا پشیمان ہوتا''۔ (۳۲)

علامہ اقبال نے حافظ کی شاعری پر جو اعتراضات کئے ہیں اس بارے میں سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''حافظ کی شاعری پر دو بڑے اعتراضات کیے ہیں اول یہ کہ وہ اپنی شاعری میں ایک ایسی کیفیت کو محبوب بناتے ہیں جو اغراض زندگی کی منافی ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ ان کی تعلیم موت کی طرف ہے۔ زندگی کی طرف نہیں۔ دوم ان کی تعلیم بڑی حد تک مسلمانوں کے زوال کی ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کے انحطاط میں اس نے بطور ایک عنصر کام کیا ہے''۔ (۳۳)

ان سب باتوں کے باوجود علامہ نے حافظ شیرازی کی شاعری سے خاص استفادہ کیا۔ انہوں نے نہ صرف ان کے اشعار کو پسند کیا بلکہ اقبال حافظ کی شاعری سے کافی حد تک متاثر نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے علامہ نے اپنے فارسی کلام کے علاوہ اردو کلام میں بھی حافظ کے بہت سے

اشعار درج کئے اور ان سے استفادہ کیا۔

مزا تو یہ ہے کہ یوں زیر آسمان رہے　　ہزار گونہ سخن در دہان ولب خاموش
یہی اصول ہے سرمایہ سکون حیات　　گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
پیام مرشد شیراز بھی مگر سن لے　　کہ ہے سر نہاں خانۂ ضمیر سروش
محل نور تجلی است رای انور شاہ　　چو قرب او طلبی در صفای نیت کوش [۳۴]

❁❁❁

ہوائے بزم سلاطین دلیل مردہ دلی
کیا ہے حافظ رنگین نوا نے راز یہ فاش
گرت ہو است کہ با خفر ہم نشینی باشی
نہاں ز چشم سکندر چو آب حیوان باش [۳۵]

❁❁❁

دلق حافظ بچہ ارزو بہ عیش رنگین کن
و آنگش مست و خراب از رہ بازار بیار [۳۶]

❁❁❁

شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمت شہباز و شاہین کردہ اند [۳۷]

''بانگ درا'' ہی میں ''طلوع اسلام'' والی نظم میں حافظ کا یہ شعر ملتا ہے۔

بیا تا گل بفشانیم و می در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح دیگر اندازیم

عاقبت منزل ماواری خموشان است

حالیہ غلغلہ در گنبد افلاک انداز

(''بال جبریل''، نظم نپولین کے مزار پر)

حالی اور شبلی پر ماتم کرتے ہوئے ''بانگ درا'' میں اقبال نے حافظ کا یہ شعر درج کیا ہے:

اکنون کرا دماغ کہ پرسد زباغبان

بلبل چہ گفت گُل چہ شنید و صباچہ کرد

(بانگ درانظم شبلی وحالی)

در غم دیگر بسوز و دیگران راہم بسوز

گفت روشن حدیثی گر توانی دار گوش

(بانگ دار)

علامہ اقبال نے ''ضرب کلیم'' میں ایک نظم ''ایجاد معانی'' لکھی ہے اس میں حافظ شیرازی کی اس محنت اور کوشش کا ذکر کیا گیا ہے جس کی وجہ سے حافظ نے بلند مقام حاصل کیا۔ یہ مقام حافظ کو سخت کوشی پیہم عمل اور کافی محنت سے حاصل ہوا۔

خون رگ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر

مے خانہ حافظ ہو کہ بت خانہ بہزاد

بے محنت پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا

روشن شرر تیشہ سے ہے خانہ فرہاد

غرض علامہ اقبال نے حافظ شیرازی کی شاعری پر تنقید کرنے کے باوجود بھی ان کی شاعری سے اثرات قبول کر لئے ، ان کے فن کو سراہا اور ان کی عظمت کی داد دی۔ علامہ اس عظیم شاعر کے قدر دان تھے اور اس بات کے معترف بھی تھے کہ حافظ کی شاعری کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ حافظ کے ساتھ اس کی عقیدت آخر تک قائم رہی اور اسکی برابر یہ کوشش تھی کہ وہ اپنی شاعری میں اس کی مستی اور رنگینی کو سمو دے [۳۸] فارسی زبان کا کوئی شاعر طرز و اسلوب اور پیرایۂ بیان میں حافظ سے اتنا قریب نہیں جتنا کہ اقبال ہے۔ اس کے ماسوا دوسرا کوئی شاعر حافظ کا تتبع نہ کر سکا۔ اقبال کو اس ضمن میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ میں اسے حافظ کا روحانی فیض اور خود اس کی اپنی ریاضت کا ثمرہ خیال کرتا ہوں۔ (۳۹)

❁❁❁

علامہ اقبال اور حکیم سنائی

حکیم سنائی کا نام مجذود تھا اور کنیت ابوالمجد تھی۔ ان کا مولد غزنین تھا۔ ولادت ۴۶۴ھ مطابق ۱۰۷۱ء کے قریب ہوئی جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل شعر سے واضح ہوتا ہے۔ انہوں نے حدیقہ ۵۲۴ھ میں لکھا۔

پانصد و بیست و چار رفتہ عام
پانصد و بیست و پنج گشت عام

حدیقہ بمبئی (۱۵۸۹ء ص ۴۹۵) چنانچہ اس وقت ان کی عمر تقریباً ساٹھ سال ہوگی حدیقہ (مطبوعہ لکھنؤ ص ۵۹۲۔۵۹۳) میں سنائی نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ کم وبیش تیس سال سے (یعنی تقریباً ۴۹۵ھ سے) شعر و شاعری میں مصروف تھے۔ یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کے دیوان میں تاریخی یقین کے ساتھ سب سے قدیم کلام وہ دو قطعے ہیں جو انہوں نے سلطان ابراہیم غزنوی (م ۴۹۲ھ/ ۱۰۹۹ء) کے وزیر خواجہ محمد بن بہروز بن احمد (ممدوح و مسعود سعد سلمان) کے مرثیے میں لکھے تھے۔(۱)

سنائی کی پیدائش کے بارے میں بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں:

''سنائی غزنوی میں پیدا ہوا۔ اس کی صحیح تاریخ ولادت کی تو تحقیق نہیں ہوسکی۔ محققین کا خیال ہے کہ وہ ۴۶۳/ ۱۰۷۰ یا ۴۷۳/ ۱۰۸۰ میں پیدا

ہوا اور ۵۲۵ھ/۱۱۳۰ء (یا ۵۳۵ھ/۱۱۴۰ء) میں وفات پائی۔(۲)

مدرس رضوی دیوان حکیم سنائی میں لکھتے ہیں:

''تاریخ تولد سنائی بدرستی معلوم نیست و بیشتر تذکرہ نویسان دراین باب سکوت اختیار کردہ واز سال تولداو ذکری نکردہ اند وامیر علی شیر لودی در تذکرہ مرآت الخیال از تاریخ مجمل فصیحی خوافی سال تولداو سنہ ۴۳۷ نقل کردہ است و مدت عمرش راشصت و دو سال آوردہ است واین مدت عمر کہ برای حکیم از تاریخ مذکورہ نقل شدہ است بحقیقت نزدیک وبعض از شعار حدیقہ ہم مدید آنست آنجا کہ سنائی از ضعف و پیروی خویش شکایت می کنند ہم جاازسن شصت سالگی یاد کردہ است۔

واما تاریخ تولدش کہ سال ۴۳۷ ذکر شدہ درست نیست چہ اگر تاریخ اتمام حدیقہ چنانکہ جمعی گفتہ اند یکسال پیش ازمرگ وی باشد ووفاتش درسال ۵۳۵ بقول مشہور ودرسال ۵۳۵ بنابرآنچہ درسال وفات وی اختیار شدہ وعمرش شصت و دو باشد بنابراین سال تولد وی باید درحدود سال ۴۶۳ یا ۴۷۳ باشد وچوں سال وفاتش درسال ۵۳۵ بجہاتی کہ ذکر خواہد شد بصحت نزدیکتر است باین علت تاریخ تولد وی کہ فصیحی خوافی در وفات سنائی ذکر کردہ است۔ بطور قطع و یقن نادرست است''۔(۳)

حکیم سنائی کی وفات کے بارے میں مدرس رضوی لکھتے ہیں:

''اشکال دیگر آنست کہ سنائی درآخر حدیقہ تاریخ اتمام آنرا چنین گوید۔

شد تمام این کتاب در مہ وی   کہ در آذر فلکندم آنرا پی
پانصد و بیست و پنج رفتہ عام   پانصد وسی و چار گشت تمام

اگر چہ روایت بیت تاریخ اختلافت ونسخہ ھای حدیقہ موافق ہم نیست و بیت تاریخ چنیں

پانصد و بیست و چہار رفتہ زعام　　پانصد و بیست و پنج گشتہ تمام

وچنیں

پانصد و سی و چار رفتہ ز عام　　پانصد وسی و پنج گشت تمام

ازمقدم وزین نسخہ کہن دونکتہ مہم بدست می آید کہ برای روشن شدن تاریخ وفات سنائی بسیار قابل ملاحظہ ومناسب است کہ درانیجا بدان اشارہ شود...... یکی آنکہ دردریباچۂ حدیقۃ الحقیہ درداستان خواہش بہرام شاہ غزنوی ازحکیم واستکاف ومی دردیباچۂ نسخہ مخطوط تاریخ روزوسال رفتن حکیم شت ومعین است ونوشتہ شدہ'' مثال فرموددرشب پنجشبہ سال بر پا نصدو بیست وھفت ۔ ۵۲۷ ھلالی کہ اورا ازبارگاہ مجاہدت ببارگاہ مشاہدت آرند''۔

ونکتہ دیگرآنکہ درمقدمہ رفاء درنسخہ ھای مخطوط وچاپی سال وفات حکیم یکشنبہ یازدھم شعبان ۱۵۲۵ است ط دراین نسخہ سال ۱۵۲۹ است۔

وبنابرآنچہ ازسالۂ مذکورہ نقل افتادجای شک وتردیدنیست کہ سال ۴۲۵ درتاریخ وفات سنائی غلط بہیچوجہ جای تاویل نیست''۔(۴)

سنائی کا انتقال ۵۴۵ھ/۱۱۵۰ء میں ہوا ہوگا۔(۵)

ابوالمجد مجدد بن آدم سنائی جوانی ہی سے دربارغزنوی میں منسلک ہوگئے اوراس خاندان کے بعض بادشاہوں مثلاً بہرام شاہ کی مدح میں اشعار کہے۔ سنائی نے بیت اللہ کا حج کیا اورخراسان کے اکثرشہروں کی سیر و سیاحت کی۔ درویشوں کے حلقوں میں گھومے اورصوفیوں سے

ملاقات کی اور فیض یاب ہوئے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آخر کار بادشاہوں کی مدح گوئی سے کنارہ کش ہوا گوشہ نشین بن گیا اور صوفیانہ شاعری کا آغاز کیا۔ایک دن قصیدہ لکھ کر بہرام شاہ کے دربار میں جارہا تھا کہ فوج مہم پر روانہ ہونے سے پہلے بادشاہ کو سنا سکے راستے میں ایک بادہ خوار مجذوب سے واسطہ پڑا جس نے سنائی کی کوتاہ اندیشی اور کم فہمی کا مذاق اڑایا اور اس کی نادانی پر ایک جام نوش کیا۔اس مجذوب کی یہ حرکت سنائی اوراس طرح اثر انداز ہوئی کہ اس نے بادشاہوں کے دربار سے قطع تعلق کرلیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد سنائی نے قصیدہ گوئی ختم کرلی اور زہد وتقویٰ کی زندگی بسر کی۔(٦)

خیال کیا جاتا ہے کہ سنائی ۵۰۰ھ/ ۱۱۰۷ء سے قبل بلخ میں وارد ہوا۔ اس دور میں یہاں افراتفری کا ماحول تھا اور مایوس کن حالات میں سنائی نے اپنی تمام کوششوں سے لوگوں کو دینی اور اخلاقی نصب العین کی طرف متوجہ کرنا چاہا۔سنائی نے تصوف کو ذریعہ بنایا۔

سنائی نے بلغ میں ''مثنوی کارنامہ بلخ'' لکھی اس میں تقریباً تین سو ساٹھ اشعار ہیں۔سلطان محمود غزنوی کی مدح بھی اس میں شامل ہے۔(۷)

بعض تذکروں سے ظاہر ہے کہ سنائی نے اور بھی مثنویاں لکھیں جیسے عشق نامہ عقل نامہ،غریب نامہ۔سنائی کی اہم تصانیف میں حدیقۃ الحقیہ اور سر العباد بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔حدیقہ سنائی کی سب سے مشہور مثنوی ہے۔ یہ مثنوی ۵۳۵ھ میں مکمل ہوئی۔اس میں گیارہ ابواب اور

دس ہزار اشعار ہیں۔ ہر باب کے اکثر مطالب، حکایت اور مثال کے طور پر بیان کیے گئے ہیں۔ مذکورہ مثنوی کو سنائی کا شہکار سمجھا جاتا ہے۔ صوفیانہ مطالب، بلاغت اور حسن سبک کے لحاظ سے یہ کتاب صوفیانہ مسائل کی کتابوں میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ اس تصنیف میں سنائی نے بادشاہ وقت یعنی بہرام شاہ غزنوی ۵۱۲۔۵۴۸ھ کی مدح بھی کی ہے۔(۸)

سنائی کا دور ایک طرف عام لوگوں کی پریشانیوں کا دور تھا مگر دوسری طرف اس دور میں بے شمار دانشور، حکیم، شاعر اور صوفی موجود تھے۔ غزالی، عمر خیام، ابوالسعید ابوالخیر انوری اور معریٰ اس دور کی اہم شخصیتیں تھیں۔(۹)

سنائی کی شہرت ان کی زندگی میں ہی ہوئی۔ انہوں نے اپنی شاعری میں تصوف کے اسرار معارف کو بیان کر کے فارسی شاعری کو ایک نیا رنگ دیا۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ احمد غزالی جو بلند مقام مفکر اور صوفی تھے اور سنائی کے معاصر انہوں نے اپنے شاگرد عین القضاۃ ہمدانی کو خط لکھتے وقت ان کے اشعار نقل کیے ہیں۔ ایک دوسرے ہمعصر دانشور اور شاعر نے اس کے لیے ''عیسیٰ عصر'' اور ''طبیب زیرک'' کے الفاظ استعمال کیے''۔(۱۰)

مولانا جلال الدین رومی نے سنائی کے بارے میں لکھا:

عطار روح بود و سنائی دو چشم او

ما از پے سنائی و عطار آمدیم

ایک اور جگہ مثنوی میں لکھا ہے:

ترک جوشی کردہ ام من نیم خام
از حکیم غزنوی بشنو تمام[11]

سنائی کی تصنیف حدیقہ ہے جسے الٰہی نام کہا جاتا ہے۔ رومی نے اس کتاب کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کیا ہے کہ قرآن حکیم دودھ ہے اور الٰہی نام اس کا مکھن[12]۔ سنائی کا امام غزالی سے روحانی رشتہ بھی یعنی بقول جامی (نعحات الانس لاہور ۱۹۲۷ء ص ۴۱۰) سنائی کے پیر خواجہ ابو یعقوب یوسف ہمدانی تھے جو امام غزالی کے پیر حضرت ابو علی فارمدی کے مرید تھے۔ (۱۳)

شبلی نے شعر العجم میں لکھا ہے کہ پہلی مرتب سنائی نے تصوف کے اسرار کو شاعری سے روشناس کرایا اور اخلاقی شاعری کی بنیاد ڈالی، ان کے کلام کا امتیازی پہلو تشبیہ یا تمثیل کی ندرت اور جوش سرمستی ہے۔ (۱۴)

غزل کے مقطع میں تخلص سب سے پہلے انہیں کے ہاں پایا جاتا ہے وہ واردات حقیقت کو مجاز کی زبان میں بڑی خوبی اسے ادا کرتے ہیں۔ انہوں نے غزل میں نیا رنگ پیدا کیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قصیدہ سے الگ غزل پہلے انہوں نے ہی لکھی۔ (۱۵)

دیوان سنائی کے بارے میں ڈاکٹر شفق لکھتے ہیں:

''دیوان سنائی میں زیادہ تر اشعار ایسے ملتے ہیں جن میں لوگوں کی ظاہر پرستی، ریاکاری، بے عقلی، دوست آزاری، بے وفائی اور نامسلمانی کی برائی کی گئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انہوں نے لوگوں کے

ہاتھوں ایسی تکلیفیں اٹھائی تھیں اسی وجہ سے وہ لوگوں کو اصلاح حال، خود پرستی چھوڑنے صفائے قلب، خدمت حق کی پیروی کے لیے حصول دانش، کسب وحکمت، شہوت کشتی، ترک حرص اور سلوک ایمان و عرفان حاصل کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔(۱۶)

دیوان سنائی میں اس بات کا یوں اظہار کیا ہے:

مکن در جسم و جان منزل کہ این دونست و آن والا
قدیم زین ہر دو بیرون نہ نہ این جاباش نہ انجا
بہرچہ از راہ دو افتی چہ کفر آنحرف و چہ ایمان
بہرچہ از دوست و امانی چہ زشت آنجا وچہ زیبا
سخن کزروی دین گوئی چہ عبرانی چہ سریانی
مکان کز بہر حق جوئی چہ جا بلقا چہ جابلسا
ترا دنیا ہمی گوید کہ دل در مانتبدی بہ
تو خودمی پند منیوشی از ایں گویان نا گویا
گر امروز آتش شہوت بکشتی بیگمان رستی
وگرنہ تف ایں آتش تراہیزم کند فردا
چوں علت ہست خدمت کن چو دانایاں کہ زشت آید
گرفتہ چنیساں احرام و مکی خفتہ در بطحا!
چو علم آموختی از حرص آنگہ ترس کاندر شب
چو دزدی با چراغ آید گزیدہ تر برو کالا[۱۷]

علامہ اقبال نے دیگر شخصیات کی طرح حکیم سنائی کا ذکر بھی نہایت

عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا قصیدے میں حکیم سنائی نے اپنے زمانے کے حالات اور مستقبل کے لیے ایک لائحہ عمل کا ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال نے بھی اس قصیدے کی پیروی میں ایک نظم لکھی ہے۔ ''افکار پریشان'' کے نام سے بال جبریل میں یہ نظم موجود ہے۔ یہ نظم علامہ نے اس وقت لکھی جب نادر شاہ افغان کی دعوت پر وہ افغانستان گئے۔ مزار حکیم سنائی کی زیارت بھی کی اس دورے میں علامہ کے ہمراہ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی بھی تھے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''علامہ نے جب غزنی میں مزار سنائی کی زیارت کی تو فرط جذبات سے زار و قطار رو پڑے اور بے خود ہو گئے''۔ (۱۸)

اس بات کا ذکر علامہ نے خود مثنوی پس چہ باید کرد میں کیا ہے:

در فضای مرقد او سوختم تا متاع نالہ اندوختم

مذکورہ نظم (حکیم سنائی کے قصیدے کی پیروی) کے ابتداء ہی میں علامہ لکھتے ہیں:

اعلیٰ حضرت شہید امیر المومنین نادر شاہ غازی رحمۃ اللہ علیہ کے لطف و کرم سے نومبر ۱۹۳۴ء میں مصنف کو حکیم سنائی غزنوی کے مزار مقدس کی زیارت نصیب ہوئی یہ چند ''افکار پریشان'' جن میں حکیم ہی کے ایک قصیدے کی پیروی کی گئی ہے اس روز سعید کی یادگار میں سپرد قلم کیے گئے۔

ما از پے سنائی و عطا آمدیم [19]

علامہ اقبال نے اس نظم کا آغاز اس طرح کیا ہے:

سما سکتا نہیں پنہائے فطرت میں مرا سودا
غلط تھا اے جنوں شاید تیرا اندازہ صحرا

اور مولانا رومی کے اس شعر کو علامہ نے عنوان بنایا ہے:

ما از پے سنائی و عطار آمدیم

اس نظم کے کچھ اشعار یوں ہیں جس میں علامہ نے مسلمانوں کو مستقبل کا راستہ دکھانے کی کوشش کی ہے:

خودی سے اس طلسم رنگ و بو کو توڑ سکتے ہیں
یہی توحید تھی جس کو نہ تو سمجھا نہ میں سمجھا
خدا کے پاک بندوں کو حکومت میں غلامی میں
زرہ کوئی اگر محفوظ رکھتی ہے تو استغنا
وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا
سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولوئے لالا [۲۰]

اس نظم میں علامہ نے سنائی کا ایک شعر تضمین کیا ہے؟ جو سنائی کے اس قصیدے کا ہے جس کی پیروی میں علامہ نے یہ نظم لکھی۔ علامہ نے شعر یوں لکھا ہے:

حضور حق میں اسرافیل نے میری شکایت کی
یہ بندہ وقت سے پہلے قیامت نہ کر دے برپا

ندا آئی کہ آشوب قیامت سے یہ کیا کم ہے
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا [۲۱]

سنائی کے قصیدے میں یہ شعر اس طرح ہے

چو علمت ہست خدمت کن چو دانایاں کہ زشت آید
گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا [۲۲]

مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد ریاض لکھتے ہیں:

''اقبال نے ۲۵ شعر کی اس نظم یا غزل مسلسل میں سنائی کے قصیدے کے اشعار قوافی اور تعبیرات کا اتباع فرمایا ہے۔آپ نے اس قصیدے سنائی کے مقابلے میں مختصر رکھا۔نظم کے آخری بند میں دو تین نعتیہ اشعار ضمناً لکھنے کے بعد آخری شعر علامہ فرماتے ہیں:

سنائی کے ادب سے میں نے غواصی نہ کی ورنہ
ابھی اس بحر میں باقی ہیں لاکھوں لولو سے لالا'' [۲۳]

علامہ اقبال نے حکیم سنائی کا ذکر اپنے کلام میں بہت جگہوں پر کیا ہے۔سنائی کے متعلق پہلا حوالہ جو ہمیں ملتا ہے وہ ۱۹۲۲ء کے قریب ایک خط میں ہے جو اقبال نے پروفیسر اکبر منیر کے نام لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں۔(۲۴)

''حکیم سنائی اور مولانا روم کو زیر نظر رکھنا چاہیے اس قسم کے لوگ اقوام وملل کی زندگی کا اصلی راز ہیں............ حکیم سنائی سے طرز ادا سیکھنا چاہیے کیونکہ مطالب عالیہ ادا کرنے میں ان سے بڑھ کر کسی نے قدم نہیں

رکھا''۔(۲۵)

علامہ اقبال کی مثنوی ''اسرارِ خودی'' جب مولانا گرامی کو ملی تو گرامی نے علامہ کو لکھا کہ یہ مثنوی پڑھ کر معلوم ہوا کہ آپ حکیم سنائی ہیں جس کے جواب میں علامہ نے لکھا ''اگر اقبال حکیم سنائی ہیں تو گرامی کیا ہوگا''۔(۲۶)

ارمغان حجاز میں بھی علامہ نے لکھا ہے:

عطا کن صدق و اخلاص سنائی''[۲۷]

علامہ حکیم سنائی اور مولانا رومی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

نصیب از آتشے دارم کہ اول
سنائی از دل رومی بر انگیخت

مجھے اس آگ سے حصہ ملا ہے جسے سنائی نے رومی کے دل میں پیدا کیا اور جس کے باعث اس نے مثنوی جیسی لاثانی کتاب لکھی اور یہ آگ کیا ہے یہ وہ جذبہ ہے جو اپنے ہمعصر زوال پذیر معاشرے کو دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوا اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ قوم کو اسلام کی تعلیم کی طرف دوبارہ متوجہ کرانا چاہتے تاکہ قرآن وسنت کی رہنمائی میں وہ کھویا ہوا مقام حاصل کرسکیں۔'' (۲۸)

چنانچہ اقبال اس روایت کا علمبردار ہے جو حلاج، سنائی اور رومی نے قائم کی تھی[۲۹] ''ضربِ کلیم'' کی ایک نظم ''اقبال'' میں علامہ کہتے ہیں۔

فردوس میں رومی سے کہتا تھا سنائی
مشرق میں ابھی تک ہے وہی کاسہ وہی آش

حلاج کی لیکن یہ روایت ہے کہ آخر
اک مرد قلندر نے کیا راز خودی فاش[۳۰]

ارمغان حجاز میں کہتے ہیں:

چو رومی در حرم دادم اذاں من
ازو آموختم اسرار جان من
بہ دور فتنۂ عصر کہن او
بہ دور فتنۂ عصر رواں من[۳۱]

علامہ اقبال نے ''مثنوی مسافر'' میں بھی حکیم سنائی کا ذکر نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ غزنی میں علامہ نے حکیم سنائی کے مزار کی زیارت کی اور اس تاثیر کے نتیجے میں دو نظمیں لکھیں جن کا عنوان ہے ''سفر بہ غزنی و زیارت مرزا حکیم سنائی'' اور حکیم سنائی کی روح بہشت بریں سے جواب دیتی ہے۔ یہ دونوں نظمیں ''مثنوی مسافر'' میں موجود ہیں۔ پہلی مثنوی فصل پنجم اور دوسری فصل ششم میں درج ہے۔ دونوں میں شہر غزنی اور حکیم سنائی کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ اس بارے میں احسن عبدالشکور لکھتے ہیں:

''سفر افغانستان کے دوران علامہ غزنین بھی تشریف لیے گئے اور حکیم سنائی کے مزار پر حاضری دی۔ وہاں جا کر ان پر جو کیفیت طاری ہوئی اس کا احساس ''مسافر'' کے ان اشعار میں ہوتا ہے جو علامہ نے اس موقعہ پر کہے تھے۔ ان اشعار میں انہوں نے نہ صرف سنائی کو ہدیہ

عقیدت پیش کیا ہے بلکہ سنائی اور اپنی ذات میں گہری مماثلت کا اظہار بھی کیا ہے:'' (۳۲)

علامہ نے حکیم سنائی کا ذکر مثنوی میں یوں کیا ہے:

خفتہ در خاکش حکیم غزنوی　　از نوائے او دل مرداں قوی
آں، حکیم غیب، آں صاحب مقام　　''ترک جوش'' رومی از ذکرش تمام
من ز پیدا او ز پنہاں در سرود　　ہر دو را سرمایہ از ذوق حضور
او نقاب از چہرہ ایمان کشود　　فکر من تقدیر مومن وا نمود
ہر دو را از حکمت قرآں سبق　　او ز حق گوید من از مردان حق
در فضائے مرقد او سوختم　　تا متاع نالۂ اندوختم
مومن از افرنگیان دید آنچہ دید　　فتنہ پا اندر حرم آمد پدید
''اے حکیم غیب'' امام عرفان　　پختہ از فیض تو خام عارفاں

آنچہ اندر پردہ، غیب است گوئے
بوکہ آب رفتہ باز آید بجوے ۳۳ے

غزنی شہر کی عظمت اور حکیم سنائی کی عظمت بیان کرتے ہوئے علامہ نے سنائی کو حکیم غیب اور فخر العارفین جیسے القاب سے نوازا ہے۔ یہ القاب دراصل سنائی کو مولانا رومی نے عطا کئے ہیں۔ علامہ لکھتے ہیں کہ میری نظر صرف ظاہر پر ہے اور سنائی کی نظر باطن پر ہے۔ دونوں علامہ اور سنائی کی زندگی کا سرمایہ ذوق حضور ہے۔ دونوں دیدار خداوندی کے طالب ہیں (۳۴) علامہ اقبال نے قوم کی بلندی کا راز سنائی کی زبانی بیان کر کے

شاعرانہ عظمت کا ثبوت پیش کیا ہے۔

''سنائی کے کلام نے بقول اقبال انسان کو قیمت دلائی اور مشکل حالات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت بخشی وہ حکیم غیب ہے اور عالم الغیب سے اس کا رابطہ گہرا ہے''۔(۳۵)

اس بارے میں بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں:

''اس ذہنی ہم آہنگی اور قلبی یگانگت کے باعث اقبال نے سنائی کی قبر پر کھڑے ہوکر مسلم ملت کی زبوں حالی بیان کرنا شروع کردی۔اس زبوں حالی کی وجہ صرف اور صرف افرنگی ذہنی استیلا کی وجہ سے ہے

مومن از افرنگیان دید آنچہ دید
فتنہ ہا اندر حریم آمد پدید(۳۶)

علامہ اقبال نے سنائی سے التجا کی کہ اپنی قوم کو سربلندی حاصل کرنے کے لیے اسرار غیب سے آگاہ کریں۔ چنانچہ حکیم سنائی کی روح بہشت بریں سے جواب دیتی ہے۔

راز دان خیر و شر گشتم ز فقر — زندہ و صاحب نظر گشتم ز فقر
یعنی آں فقرے کہ داند راہ را — بیند از نور خودی اللہ را
اندرون خویش جوید لا الہ — درتہ شمشیر گوید لا الہ
سلطنت اندر جہاں آب و گل — قیمت او قطرہ از خون دل
می ندانی عشق و مستی از کجاست — ایں شعاع آفتاب مصطفیٰ است
باخبر شو از رموز آب و گل — پس بزن بر آب و گل اکسیر دل[۳۷]

اس نظم میں سنائی نے یہ جواب دیا ہے کہ مسلمانوں کو سب سے پہلے فقر کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور عشق رسول ﷺ کو دلوں میں پیدا کر کے مادی دنیا سے دور رہنا چاہیے تا کہ اصلی اور حقیقی دنیا ان کو نصیب ہو جائے اور اس لحاظ سے مستقبل روشن نظر آئے گا۔ احسن عبدالشکور لکھتے ہیں:

''شاعر نے حکیم سنائی سے دور حاضر کی ستمگری کا ذکر کرنے کے بعد ملت کی سر بلندی کے لیے کسی پیغام کی خواہش کی ہے اور پھر اس مرد عارف کی زباں سے ملت کو عشق و محبت، سوز و ساز اور امید و رجائیت کے ولولہ خیز پیغام کے ساتھ ساتھ انسان کامل کا تصور پیش کیا ہے''۔ (۳۸)

مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر ریاض لکھتے ہیں:

''اس میں عشق و معرفت فقہ اور نو آفرینی نفس و وجود کے بارے میں افکار عالیہ کو بیان فرمایا ہے۔

بشنود مردے کہ صاحب جستجو است
نغمۂ را کو ہنوز اندر گلو است

معاملہ واقعی ایسا ہی ہے سنائی کے نغمۂ در گلو کو سننے کے لیے اقبال ایسے صاحب جستجو مرد کی ضرورت تھی۔'' (۳۹)

علامہ اقبال نے سنائی کی زبانی کہا ہے کہ سب سے پہلے انسان کو فقر اختیار کرنا چاہیے کیونکہ فقر کی وجہ سے انسان راز دان خیر و شر بھی ہو سکتا ہے اقبال کے مطابق فقر کا مفہوم وہ صفات ہیں جو ایک صحیح مسلمان کی تعمیر میں لابدی ہیں۔ فقر اقبال کی نگاہ میں ہے ''دولتی (ورنجوی) نہیں بلکہ ''دلیل خسروی'' ہے۔ (۴۰)

آہ کھویا گیا تجھ سے فقیری کا راز
ورنہ ہے مال فقیر، سلطنت روم و شام[41]

اسی طرح صحیح فقر وہ ہے جو راہ بین ہوا اور جس کی خودی اتنی پختہ ہو کہ اس کی روشنی میں وہ ذات خداوندی کا مشاہدہ کر سکے۔ (۴۲)

یعنی آں فقرے کہ داند راہ را — بیند از نور خودی اللہ را
اندروں خویش جوید لا الٰہ — در تہ شمیر گویا لا الٰہ[43]

علامہ اقبال فقر کے بعد سنائی کی زبانی دل کو روشن کرنے کی بات کرتے ہیں اور دلوں میں عشق رسول ﷺ کا جذبہ پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

می ندانی عشق و مستی از کجاست — ایں شعاع آفتاب مصطفیٰ است
با خبر شو از رموز آب گل — پس بزن بر آب و گل اکسیر دل
بوعلی دانندہ آب و گل است — بے خبر از خستگیہائے دل است

عشق رسول ﷺ کے جذبے سے دل کو اکسیر بنایا جا سکتا ہے تا کہ جسم بھی غیر فانی بن جائے۔ حکیم بوعلی سینا کا ذکر کرتے ہوئے علامہ نے عشق رسول ﷺ پر زور دیا ہے اور اہل دل میں رہ کر دل کو منور کرنے کی تلقین کی ہے۔

''اقبال کی نگاہ میں آب و گل کا فتنہ مغرب کی مادہ پرستانہ فکر کی پیداوار ہے۔ مادیت قدیم ہو یا جدید میکانکی ہو یا جدلیاتی دونوں خدا اور آخرت، اخلاق اور روحانیت کے اعلیٰ اقدار سے محروم ہونے کے باعث زندگی میں انتشار بے راہ روی، ذہنی پریشانی اور کج فہمی پیدا کرتی ہے۔ قومیت اور زمین پیوستگی، اشتراکیت و ملوکیت و سرمایہ داری سبھی اس فتنے

کی پیداوار ہیں۔" (۴۴)

یہی وجہ ہے عشق محمدی ﷺ پر زور دیا گیا ہے اور اس علم کی تلقین کی گئی ہے جو دل کو ہمیشہ عشق رسول ﷺ سے زندہ رکھ سکے۔ انسانی زندگی (مادہ) کی پرداخت بھی ضروری ہے۔ یہ اس کے ارتقائی مدارج کی ابتدائی منزل ہے جس کے بغیر اس کی روحانی ترقی ناقص رہ جاتی ہے۔ انسان کو دنیا کے ساتھ ساتھ دل کی دنیا کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے۔ مولانا رومی کہتے ہیں:

علم را برتن زنی مارے بود
علم رابر دل زنی یارے بود

حکیم سنائی کی زبانی مسلمانوں کی درماندگی کو دور کرنے کے لیے اقبال نے جو پیغام دیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بشیر احمد ڈار لکھتے ہیں:

"اس کا لب لباب گویا یہ ہے کہ راہ حق پر پورے علم الیقین سے گامزن ہو جائے اور راستے کی مشکلات کو عشق مصطفیٰ ﷺ کے نور سے دور کیا جائے اس اسلامی نظام حیات کو محض احساس کمتری کے باعث ترک کرنا کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ پورے عزم وحوصلہ اور مستقبل پر پورے یقین کے ساتھ اس کو اپنایا جائے معذرت خواہانہ رویہ ترک کر کے پورے اطمینان قلب سے اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ ع

"پردہ بگداز آشکار اے گزیں" ۴۵

علامہ اقبال نے اس پیغام کے آخر میں سنائی کی زبانی عالم غیب سے مستقبل کا ایک پر امید نقشہ یوں کھینچا ہے:

''میں نے کل فطرت کائنات کو دیکھا جس کی آنکھوں کے سامنے ظاہر کے تمام پردے ختم ہو جاتے ہیں دیکھا کہ وہ آب و خاک کے آمیزے میں کچھ تلاش کر رہی ہے شاید کوئی انوکھی اور تازہ شبیہ کی تعمیر کے لیے کوشاں ہے میں نے اس سے سوال کیا کہ وہ کس کی تلاش میں ہے۔ اس نے جواب دیا کہ خدا کا حکم صادر ہوا ہے کہ ایک نئے آدم کی تخلیق کی جائے مگر پرانی مٹی سے۔ چنانچہ میں نے دیکھا۔ حکیم سنائی اقبال کو بیان کر رہے ہیں کہ اس نے مٹی کے ایک معمولی ٹکڑے کو کئی طرح سے آزمایا۔ اسے پے بہ پے گرم کیا تو لا اور پھر گرم کیا۔ آخر میں اس ٹکڑے کو لالہ کا آب و رنگ بخشا اور اس کے ضمیر میں لالہ کا رنگ بویا۔ اس کے بعد مجھ سے مخاطب ہو کر کہا

باش تا بینی بہار دیگرے
از بہار باستان رنگیں ترے

تم مسلمانوں کی موجودہ پستی سے پریشان ہو مگر اطمینان رکھو کہ حیات نے اس خاکی انسان سے ایک نئے مسلمان کی تعمیر کا عزم کر رکھا ہے اور بہت جلد ہی وہ ایسی شان و شکوہ، عظمت و جلال سے پردۂ کائنات پر نمودار ہوگا[۴۲]۔ مسلمان کی عظمت لوٹ آئے گی۔ حالات سازگار نظر آتے ہیں اور اب مسلمانوں کی کامیابی یقینی ہے:

لالہ را در وادی و کوہ دمن
از دمیدن باز نتوان داشتن

❀❀❀

علامہ اقبال اور شیخ سعدی شیرازی

شیخ سعدی کا نام مصلح الدین بن عبد اللہ شیرازی تھا۔ وہ ایران کی ایک مشہور و معروف شخصیت گزری ہے۔ انہوں نے فارسی نظم و نثر میں کافی شہرت حاصل کی۔ انہوں نے فارسی زبان کو فصاحت کے درجہ کمال پر پہنچایا اور بلاغت کا بہترین نمونہ پیش کیا اپنے اس شعر کے مطابق

ہفت کشور نمی کنند امروز بے مقالات سعد انجمنی

ہر زمانہ میں مقبول اہل ذوق و ادب رہا۔

بوستان کے ایک شعر کے مطابق جو سعدی نے ۶۵۵ھ میں تصنیف کیا اور کہا ہے

اللہ اے کہ عمرت بہ ہفتاد درفت مگر خفتہ بودی کہ ہر باد رفت

(ایسی صورت میں کہ یہ شعر انہوں نے اپنے آپ سے خطاب کر کے کہا) وہ ۵۷۵ء میں پیدا ہوئے ہوں گے ایک اور شعر کے مطابق جو گلستان میں آیا ہے

اے کہ پنجاہ رفت در خوابی مگر ایں پنج روزہ دریابی

گلستان کی تالیف کے وقت یعنی ۶۵۲ھ میں اپنے آپ کو خطاب کر کے کہا ہے تو ان کی تاریخ ولادت ۶۰۲ھ کے لگ بھگ آتی ہے.............. پس ان کی ولادت ۶۰۲ھ کے لگ بھگ ہوئی ہوگی

جیسا کہ پنجاہ رفت و در خوابی والے شعر سے ظاہر ہے اور یہی سنہ درست معلوم ہوتا ہے۔(۱)

دائرۃ المعارف اسلامیہ میں لکھا ہے:

''مصلح الدین تقریباً ۵۸۰ھ/۱۱۸۴ء میں بمقام شیراز پیدا ہوئے اور بقول (ETHE) اتھے اتابک فارس بن زنگی نے خود انہیں اپنی تربیت میں لے لیا جو ۱۱۹۵ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اظہار احسان مندی کے طور پر انہوں نے اس کے نام کی نسبت اپنا تخلص سعدی لکھا۔ سعدی نے ذوالقعدہ ۶۹۱/ستمبر ۱۲۹۲ء میں شیراز میں وفات پائی۔

(ان کا مزار (سعدیہ) شہر کے مشرقی جانب ہے جسے پہلوی دور میں ازسرنو تعمیر کرایا گیا)(۲)

کلیات سعدی میں محمد علی فروغی لکھتے ہیں:

''شیخ سعدی خانوادس از عالمان دین بودہ اند و در سالہای اول سدہ، ہشتم ہجری در شیراز متولد شدہ در جوانی بغداد رفتہ و در آنجا در مدرسہ نظامیہ وحوزہ ھای دیگر درس و بحث و تکمیل علوم دینی وادبی پرداختہ و در عراق وشام وحجاز مسافرت کردہ وحج گزارد............در سال ششصد و پنجاہ و پنج ھجری کتاب معروف بوستان را بنظم آوردہ و در سال بعد گلستان راتصنیف نمودہ۔(۳)

شیخ سعدی اوائل جوانی ہی میں یتیم ہو گئے اور سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ کہتے ہیں

مرا باشد از حال طفلاں خبر — کہ در طفلی از سر برفتم پدر
من آنگہ سر تاجورد داشتم — کہ سر در کنار پدر داشتم

سعدی کے اجداد اہل دانش تھے اور علوم دینی میں شہرت رکھتے تھے، خود فرماتے ہیں:

همه قبلهٔ من عالمان دین بودند
مرا معلم عشق تو شاعری آموخت[۴]

ابتدائی تعلیم شیراز میں حاصل کی۔ پھر بغداد چلے گئے اور وہاں مدرسہ نظامیہ پہنچے۔ ۴۰ سال مسافرت میں گزارے۔ بغداد شاہ مکہ سے لے کر شمالی افریقہ تک گھومے مختلف شہر اور مختلف مذاہب فرقوں سے واقف ہوئے اور مختلف علوم سے فیض یاب بھی ہوئے۔ اپنی مسافرت کی طرف اشارہ یوں کرتے ہیں:

ندانی کہ من در اقالیم غربت چرا روز گاری بکردم درنگی

طویل مسافرت کے بعد آپ شیراز واپس لوٹ آئے۔ اس زمانے میں یہاں سعدی کا ممدوح اور سرپرست اتابک ابوبکر بن سعد زنگی (۶۲۳۔۶۶۸) حکومت کرتا تھا اور ہر طرف امن وامان قائم ہو گیا تھا۔

چو باز آمدم کشور آسودہ دیدم پلگاں رہا کردہ خوی پلنگی
چناں بود در عہد اول کہ دیدی جہانی پر آشوب وتشویش وتنگی
چنیں شد در ایام سلطان عادل اتابک ابوبکر بن سعد زنگی

اسی زمانے میں شاعر کو فراغت نصیب ہوئی اور تصنیف و تالیف کا خیال آیا۔ اپنے نغموں اپنے کلام کو جمع کیا۔ بوستان اور گلستان لکھی اور اپنے اشعار وقطعات کو مرتب کیا۔ سعدی ان خوش نصیب شاعروں میں

تھے جنہوں نے اپنی زندگی میں بلکہ ابتدائی جوانی ہی میں اپنی شہرت کا غلغلہ سنا اور ان کی یہ ناموری اتابک ابوبکر کے زمانے میں کمال کو پہنچی۔

بوستان میں کہتے ہیں:

در ایام ابوبکر بن سعد بود[۵] کہ سعدی کہ گوئی بلاغت ربود

شیخ سعدی نے اسی زمانے یعنی ۶۵۵ھ میں بوستان نظم کی

کہ من گفتم ایں نامبر دار گنج ز ششصد فزون بود پنجاہ و پنج

اس کے ایک سال بعد گلستان تصنیف کی

ز ہجرت شش صد و پنجاہ و پنج درآں مدت کہ مارا وقت خوش بود

ان تصانیف کے علاوہ سعدی کی کلیات میں قصائد، غزلیات، قطعات، ترجیح بند، رباعیات، مقالات اور عربی قصائد بھی ہیں۔

"اس عظیم المرتبت شاعر کی وفات ۶۹۱ھ سے ۶۹۴ھ کے درمیان سالوں میں خود ان کے وطن شیراز میں ہوئی اور وہ اسی شہر میں دفن ہوئے۔"[۶]

سعدی شیرازی نے مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی اور ہر ایک صنف میں خوب عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ ان کا موضوع خدا کی حمد وثنا، پند ونصیحت، مرثیہ اور مداح ہے۔ سعدی نے غزل میں بھی کمال حاصل کیا۔

سعدی کی نثر بھی شیریں اور رواں ہے۔ سعدی سے پہلے کسی نے ایسی نثر نہ لکھی۔ ان کی نثر کا نمونہ گلستان ہے۔ گلستان آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ گلستان کو ایرانی ادبیات کا گل سرسبد ( ) کہا جاتا ہے۔ پوری کتاب اجتماعی، اخلاقی اور تربیت کے بہترین نکات سے مملو ہے۔ عالمی ادب

میں اسی کتاب کو بلندترین مقام حاصل ہے۔

''بوستان'' بھی شیخ سعدی کی اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب سے سعدی کی اخلاقی مثنوی میں کمال اور مہارت عیاں ہے۔ اسی کتاب میں ایسے حقائق جو کافی سودمند اور اہم ہیں۔ حکایتوں کے پیرائے میں بیان کئے ہیں۔ یہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اول عدل اور تدبیر ورائے پر باب دوم احسان کی فضیلت پر۔ باب سوم عشق مستی وشور پر ہے۔ چہارم تواضع پنجم فضیلت پر ششم قناعت پر اور ہفتم تربیت ہستی ہشتم شکر یہ عافیت، نہم توبہ وصواب دہم مناجات پر ہے۔ شیخ سعدی کی شخصیت پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر شفق لکھتے ہیں:

''استاد سعدی شیرازی کے آثار خواہ نثر میں ایسے افکار اور عقائد کے مظہر ہیں۔ جو ان کی ایک عمر کے تجربہ، غور وفکر، آفاق والنفس کے مطالعہ سیر وسفر، مختلف قوموں اور ملتوں سے ملنے اور تاریخی واقعات کے مشاہدے حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں

در اقصای عالم بگشتم بسی   بسر بردم ایام باہر کسی
تمتع زہر گوشئہ یافتم   زہر خرمنی خوشئہ یافتم

ایسے ہی گراں بہا تجربوں کو سعدی نے نہایت موزوں اور دلکش عبارت میں نہایت برجستہ حکایات و امثال اور اشعار کے پیرائے میں بیان کردیا ہے اور اس طرح بیان کیا ہے کہ اس سے بہترین اخلاقی اور اجتماعی اصولوں کا ایک نفیس مجموعہ اور بہترین ادبی فارسی کا ایک ایسا نمونہ عالم وجود میں آیا ہے جس کا مطالعہ بدون تردید۔

متعلمان رابکار آید و مترسلان را بلاغت افزاید (۸)

علامہ اقبال نے اپنے کلام نظم و نثر میں شیخ سعدی کا ذکر نہایت ہی عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔ جہاں تک علامہ اقبال کے نثر کا سوال ہے اس میں سعدی شیرازی کا ذکر دو واقعات میں ملتا ہے۔ ایک واقعہ میں سعدی شیرازی کی ہجو گوئی (جو کشمیریوں سے منسوب ہے) کا ذکر ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے کشمیر اور کشمیریوں کا ذکر بہت سی نظموں میں کیا ہے (خاص کر ساقی نامہ میں) مگر کچھ لوگوں کو علامہ اقبال کا کشمیریوں کے مطلق یہ نظریہ پسند نہ آیا اور علامہ پر الزام لگایا کہ علامہ نے ان نظموں خاص کر ''ساقی نامہ'' (پیام مشرق) میں کشمیریوں کو تنقید کا نشانہ بنا کر ملامت کی ہے۔ اس شکایت کے پیش نظر علامہ نے ۲۶ رمئی ۱۹۲۳ء کے ایک خط میں میر خورشید احمد صاحب[9] کو لکھا:

''ساقی نامہ و کشمیر سے متعلق بعض لوگوں کا گلا سن کر مجھے تعجب ہوا۔ سعدی نے محض قومی رقابت سے کشمیریوں کی ہجو کی ہوگی کیونکہ ایک زمانہ میں کشمیر ایران کا ہمسر رہ چکا ہے۔ میں نے تو دکھڑا رویا ہے............ دکھڑے کی بنا بھی واقعات پر ہے جن کا میں نے کشمیر میں خود مشاہدہ کیا۔ پنجاب کے کشامرہ کی حالت کشمیر کے کشامرہ سے بدرجہا بہتر ہے۔ نظم کا موضوع کشامرہ کشمیر ہے نہ کشامرۂ پنجاب..................''۔ (۱۰)

علامہ اقبال نے شیخ سعدی کا ذکر ایک اور جگہ کیا ہے:

''۴ رستمبر ۱۹۲۷ء کو علامہ نے کشمیری بازار لاہور میں ایک بصیرت افروز

تقریر کی اور ضمناً شیخ سعدی کی ایک حکایت کی طرف اشارہ کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عورت نے اپنے شوہر سے شکایت کی کہ محلے کا دکاندار گراں فروش ہے اور انہیں چاہیے کہ آٹا بازار سے لایا کریں۔ شوہر نے جواب دیا عزیز تر از جانم، محلے کا یہ دکاندار بھی تو ہمارے رحم و کرم پر ہے اگر ہم اس سے آٹا نہ خریدیں گے تو بے چارے کا گزارہ کیسے چلے گا''(۱۱)

یہ حکایت سعدی کے اسلوب فکر و بیان سے کوئی مغائرت نہیں رکھتی۔مگر شیخ کے تصانیف میں ملتی نہیں۔(۱۲)

علامہ اقبال نے شیخ سعدی کا ذکر اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ ''بانگ درا'' کی نظم ''فردوس میں ایک مکالمہ'' میں ''شیخ سعدی'' اور ''مولانا حالی'' جیسی عظیم المرتبت شخصیات کو ایک ساتھ جنت الفردوس میں یوں پیش کیا ہے۔

ہاتف نے مجھ سے کہا فردوس میں ایک روز
حالی سے مخاطب ہوئے سعدی شیراز
اے آنکہ ز نور گہر نظم فلک تاب
دامن بچراغ مہ و اختر زدہ باز
کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیاں کر
واماندہ منزل ہے کہ مصروف تگ و تاز؟
مذہب کی حرارت بھی ہی کچھ اس کی رگوں میں
تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمئ آواز

باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر
رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحب اعجاز؟
جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا
آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل
دنیا تو ملی طائر دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی
فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمین تاز
مذہب سے ہم آہنگی افراد ہے باقی
دیں زخمہ ہے جمیعت ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوار چمن کی
ظاہر ہے کہ انجام گلستان کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو
پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضور شہ یثرب میں نہ کرنا
سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز
''خرمانتواں یافت ازاں خارکہ کشتیم
دیبانتواں یافت ازاں پشم کہ رشتیم''
سعدی (۱۳)

اس نظم میں علامہ اقبال نے شیخ سعدی کے اس شعر کو آخر پر تضمین کیا ہے۔

خرما نتواں یافت ازاں خار کہ کشتیم
دیبا نتواں یافت ازاں پستم کہ رشتیم

یعنی قوم نے دنیاوی مقاصد کے لیے تعلیم حاصل کی ہے اور قوم آخرت کو بھول گئی ہے اصل بات یہ ہے کہ ہم نے جو کانٹے بوئے ہیں ان سے کھجوریں نکل نہیں سکتی اور جو اون کاتے گئے ہیں ان سے مخمل حاصل نہیں ہوسکتی۔ یعنی تعلیم نصاب کا ثمرہ یہی ہے اس سے دنیا تو مل سکتی ہے مگر آخرت نہیں۔

اس نظم میں حالی اور سعدی کو علامہ نے اس لیے پیش کیا ہے کہ دونوں نے قوم کی سربلندی کے لیے خاص کام کئے ہیں۔ سعدی نے گلستان اور بوستان میں اور حالی نے ''مسدس'' کے ذریعہ قوم کو اصلاح کا پیغام دیا۔ دونوں نے قوم کو صحیح تعلیم دی اور بلند و مقام حاصل کرلیا۔ اس بارے میں ڈاکٹر ریاض لکھتے ہیں:

> ''سعدی اور حالی کی یہ ملاقات دونوں کی شخصیت کے ایک معنوی ربط کی غماز ہے۔ حالی کو بعض نقاد نے ''سعدی ہند'' لکھا ہے۔ حالی کو سعدی سے جو معنوی مناسبت تھی اسے ان کی پہلی سوانحی کتاب ''حیات سعدی'' مولفہ ۱۸۸۴ء اور مطبوعہ ۱۸۸۶ء میں دیکھا جاسکتا ہے۔ یہ کتاب فارسی میں ترجمہ ہوکر تہران میں چھپ گئی اور خاصی متداول ہے۔ حالی کے ''مقدمہ شعر و شاعری'' اور ان کی اخلاقی و اصلاحی شاعری میں بھی شیخ سعدی کی تاثیر دیکھی جاسکتی ہے''۔ (۱۴)

سید عبداللہ نے اس بارے میں لکھا ہے:

''حالی اور سعدی دونوں جامع نظم و نثر تھے۔ دونوں شاعری اور نثر نگاری میں ایک طرز نو کے موجد تھے۔ دونوں صنعت، تکلف، مبالغہ اور اغزاق سے متنفر تھے.......... حالی نے سعدی میں اپنے آپ کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور کوئی تعجب نہیں کہ انکے بہت سے اصلاحی خیالات سعدی کے رہین منت ہوں۔'' (۱۵)

اس کے علاوہ بھی ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں حالی نے سعدی کو فارسی شاعر کا ہومر لکھا ہے۔ (۱٦)

علامہ اقبال کی دوررس اور تیز بین نگاہیں شیخ علیہ الرحمہ کے فکروفن پر شروع سے آخر تک جمی رہیں۔ مسلمان گھرانوں کی متداول روایات کے مطابق اقبال نے بہت ابتداء ہی میں سعدی کی تصانیف پڑھی ہوں گی۔ ۱۹۲۷ء میں علامہ نے میٹریکولیشن (Matriculation) کے امتحان کی خاطر فارسی نثر و نظم کا ایک حسین انتخاب ''آئینۂ عجم'' کے نام سے مرتب فرمایا تھا۔ اس میں سعدی کی نثر و نظم کا جو حصہ انہوں نے منتخب کیا، وہ کلام سعدی کے بہت دقیق اور ناقدانہ مطالبہ کا مظہر ہے۔ آپ نے سعدی کے متعدد اشعار کو تضمین کیا ہے اور کہیں کہیں شیخ کے مطالب وافکار کو بہ انداز دیگر پیش کیا ہے۔ (۱۷)

''بانگ درا'' نظم ''مرزا غالب'' والی نظم میں علامہ اقبال نے سعدی شیرازی کو ''گل شیراز'' اور اسی کتاب کی نظم ''داغ'' میں دو جگہوں پر ''بلبل شیراز'' کے القاب سے یاد کیا ہے۔

شاہد مضمون تصدق ہیں تیرے انداز پر
خندہ زن ہے غنچۂ دلی گل شیراز پر
اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبل شیراز بھی
سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحب اعجاز بھی
نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر[۱۸]

علامہ اقبال نے ''پیام مشرق'' میں ایک نظم ''قطرہ آب'' لکھی ہے اس میں سعدی کے ایک قطعے کے بعض اشعار کو تضمین کر کے اپنے اضافات اور افادات کے ذریعے اسے تازہ معنی دئے ہیں۔ سعدی کا یہ قطعہ بوستان کے باب چہارم ''تواضع'' کے ابتدائی اشعار پر مشتمل ہے۔ شیخ نے اپنے ''باب'' کے عنوان کے مطابق تواضع، فروتنی اور خاکساری کا درس دیا ہے مگر اس قطعے کے ابتدائی اشعار سے نفی خودی اور فنائے ذات کے مطابق بھی مستفاد ہو سکتے ہیں۔ علامہ نے اسی خاطر انہیں معنی تازہ دئے ہیں''۔(۱۹)

سعدی کا شعر یہ ہے:

یکی قطرہ باران ابری چکید   خجل شد چو پہنای دریا بدید
کہ جائے کہ دریاست من کیستم   گر او ہست حقا کہ من نیستم[۲۰]

علامہ نے اس نظم کی ابتداء اس شعر سے کی ہے:

مرا معنئ ز تازۂ مدعا است
اگر گفتہ را باز گویم رواست

اس کے بعد کچھ اشعار یوں ہیں:

ولیکن ز دریا برآمد خروش
ز شرم تنگ مائگی روپوش
تماشائے شام و سحر دیدہ
چمن دیدہ دشت و دردیدہ
گہر شودر آغوش قلزم پڑی
فروزان تر از ماہ و انجم بزی[۲۱]

علامہ اقبال نے ''نظم طیارہ'' ''پیام مشرق'' (صفحہ۱۶۲۔۱۶۳) میں شیخ سعدی کے ایک شعر کو تضمین کیا ہے:

تو کار زمیں رانکو ساختی   کہ با آسمان نیر پرداختی

نظم ''ذوق شوق'' کے ابتداء میں بھی شیخ سعدی کا یہ شعر ملتا ہے۔

دریغ آمدم زاں ہمہ ''بوستان''   تہی دست رفتن سوئے دوستان

لفظ بوستان میں صنعت ایہام کارفرما ہے یعنی مثنوی بوستان کی طرف اشارہ ہے اور خود باغ و بوستان بھی مراد ہوسکتا ہے جہاں اسے احباب کی خاطر اثمار کے تحفے لائے جاتے ہیں۔ یہ شعر بوستان کی اکثر اشاعتوں کا سرورق بنتا رہا۔(۲۲)

علامہ اقبال نے ''ساقی نامہ'' میں بھی شیخ سعدی کا یہ شعر درج کیا ہے:

اگر یک سرموی بر ترپرم   فروغ تجلی بسوزد پرم[۲۳]

علامہ نے ''سر راس مسعود'' پر جو نظم ''ارمغان حجاز'' میں لکھی ہے اس

میں شیخ سعدی کا یہ شعر تضمین کیا گیا ہے:

دلی کہ عاشق و صابر بود مگر سنگ است
ز عشق تا بہ صبوری، ہزار فرسنگ است

اسی طرح نظم ''درویوزۂ خلافت'' میں جو ''بانگ درا'' میں موجود ہے سعدی کا یہ شعر تضمین شدہ ملتا ہے:

مرا از شکستن چناں عار ناید
کہ از دیگران خواستین مومیاتی

اس کے علاوہ علامہ اقبال نے سعدی کے کچھ جملوں یا شعروں کو بالفاظ دیگر پیش کر دیا ہے:

سعدی:

توہم گردن از حکم داور پیچ
کہ گردن نپچد ز حکم تو ہیچ

اقبال:

ناتوانی گردن از حکمش پیچ
تا نہ پچید گردن از حکم تو ہیچ

سعدی ''زمانہ اگر باتو نسازد، تو با زمانہ بساز (گلستان)

اقبال:

حدیث بے خبراں ہے تو با زمانہ بساز
زمانہ باتو نسازد تو با زمانہ ستیز

سعدی:

بزرگی بہ عقل است نہ سال (گلستان: باب اول)

اقبال:

سخنگو طفلک و برناو پیر است
سخن را سالی و ماهی نباشد

شیخ سعدی کا ایک قطعہ ہے:

بنی آدم اعضای یک دیگر ند | کہ در آفرینش زیک جوہر ند
اگر عضوی درد آورد روز کار | دگر عضو ھارا نماند قرار
تو کر محنت دیگراں بی غمی | نشاید کہ قامت نہند آدمی

اقبال نے ''جاوید نامہ'' میں کیا ہے:

آدمیت احترام آدمی | با خبر شو از مقام آدمی
آدمی را ربط و ضبط تن ہا تن | بہ طریق دوستی گامی بزن

اقبال نے خطاب بہ جوانان عجم میں فرمایا تھا:

فکر رنگینم کند نذر تہی دستان شما | پارہ لعلی کہ دارم از بدخشاں شما

اور ایک لعل پارہ یقیناً سعدی ہے شیخ کی تصانیف نے اقبال کے کلام کی ظاہری رعنائی پر خاص اثر ڈالا ہے۔ رہے علامہ کے افکار تو اس بارے میں یہی سہی ہے کہ

ھچکس رازی کہ من گویم نگفت | ہمچو فکر من در معنی نسفت
سر عیش جاودان خواہی؟ بیا | ہم زمین، ہم آسمان خواہی بیا

ان سطور کی روشنی میں اقبال شناسی کی خاطر مطالعہ سعدی کی اہمیت واضح ہے۔(۲۴)

علامہ اقبال اور مولانا جلال الدین رومی

ایران کے سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا جلال الدین فرزند سلطان العلماء بہاء الدین محمد بن حسین الخطیبی ۶۰۴ھ میں بمقام بلخ پیدا ہوئے۔ بلخ ایک عرصۂ دراز سے ایرانی ادبیات نعت اور عقائد کے مراکز میں شمار کیا جاتا تھا۔ آپ کے والد محمد بن حسین ملقب بہ بہاء الدین ولد حسب روایت علاء الدین خوارزم شاہ کے داماد تھے۔ اپنے زمانے میں بڑے عارفوں اور علماء میں شمار ہوتے تھے اور شیخ نجم الدین کبریٰ کے خلیفہ تھے خوارزم شاہ کے پاس آپ کو بڑا تقرب حاصل تھا، لیکن کہتے ہیں کہ آپ کے مواعظ، شہرت اور اثر ونفوذ کی وجہ سے وہ آپ کا دشمن ہو گیا۔ تصوف کے مخالف بھی آپ کو تکلیف دینے لگے اور بلخ کے باشندے بھی آپ کے درپے آزاد ہو گئے۔ مجبوراً آپ نے ہجرت کا ارادہ کیا اور اپنے صاحبزادے جلال الدین کے ساتھ بغداد کے راستے حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔ مولانا کے صاحبزادے سلطان ولد کی تصنیف کی ہوئی مثنوی کے بعض اشعار کی رو سے یہ سفر فتنہ مغول کے ظہور کے وقت اختیار کیا گیا ہو۔ اس لحاظ سے اس وقت مولانا جلال الدین کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ ہوگی۔

کہتے ہیں کہ مولانا بہاء الدین نے نیشاپور میں شیخ فرید الدین عطار کی بھی زیارت کی اور انہوں نے جلال الدین کو اپنے سینے سے لگایا، دعا دی اور انہیں مثنوی اسرار نامہ تحفتاً عطا کی۔[۲] پھر آپ بغداد گئے اور حج و زیارت کرنے کے بعد ملاطیہ پہنچے اور اس شہر میں چار سال قیام کیا۔اس کے بعد سلطان علاء الدین کیقباد (۶۱۷۔۶۳۴ھ) کی دعوت پر اس کے پایہ تخت قونیہ پہنچے[۲] اور وہاں سلطان العلماء بہاء الدین جو علوم ظاہری و باطنی میں بلند مقام رکھتے تھے درس و تدریس ارشاد و تلقین میں مصروف ہو گئے۔ علاء الدین کیقباد آپ سے بے حد عقیدت رکھتا تھا۔ شیخ بہاء الدین نے جمعہ کے روز ۱۸/ ربیع الثانی ۶۲۸ھ (۱۲۳۱ء) کو وفات پائی۔(۳)

مولانا جلال الدین نے ابتدائی تعلیم و تربیت اور ارشاد و ہدایت کی تعلیم اپنے والد ہی سے حاصل کی۔ان کی وفات کے ایک سال بعد (جو ۶۲۸ میں واقع ہوئی) سید برہان الدین محقق ترمذی جو بہاء الدین ولد کے شاگرد تھے اور زمرہ خواص اور اولیاء اہل طریقت میں شمار کئے جاتے ہیں۔قونیہ آئے۔جلال الدین نے ان کی مجالیس درس سے کسب فیض کیا اور پورے نو سال تک اس مرد عارف کے ارشاد کے تحت زندگی بسر کی۔ اس کے بعد سیاحت اخذ معرفت اور اصحاب طریقت کا فیض صحبت اٹھانے کے لیے شام کا سفر اختیار کیا۔عرصے تک حلب اور دمشق میں اقامت گزین رہے۔مقامات بلند حاصل کئے اور معنوی تجارت اور علمی

اکتسابات کی منزلیں طے کرنے کے بعد قونیہ لوٹے۔ یہاں آپ سلطان کے حکم پر اپنے والد کی طرح علوم شرعی کی تعلیم و تدریس میں مشغول ہو گئے۔ اسی طرح کہ وہ اپنے اس مبارک کام میں مشغول تھے کہ گردش روزگار سے ایک روز ایک اوتادزمانہ اور نوادر دوران سے آپ کی ملاقات ہوگئی۔ اس ملاقات نے مولانا جلال الدین کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالا۔ یہ شمس الدین بن علی بن ملک داد تبریزی کی ذات تھی جو اپنے وقت کے صوفی پیروں میں ایک مجذوب پیر تھے اور اپنے سانس میں گرمی اپنی ذات میں ایک زبردست کشش اور اپنے بیان میں غیر معمولی اثر رکھتے تھے۔

ایک شہر سے دوسرے شہر تک راہ پیمائی کرتے۔ درویشوں، عارفوں اور صاحبان راز سے انس و محبت رکھتے تھے۔ تا کہ آں کہ ۶۴۲ کا سال ہوگا کہ آپ جلال الدین کی تلاش میں قونیہ تشریف لائے۔ ایک ہی نظر میں جلال الدین کے دل میں عشق و حقیقت کا شعلہ بھڑکا اور انہیں اپنا معنوی شیفتہ بنالیا اور وہ آخر تک ان کے روحانی پیشوا اور مرشد بن گئے۔ (۴)

مولانا جلال الدین رومی نے اپنے مرشد سے متاثر ہونے کے بعد ایک بلند مقام حاصل کرلیا۔ تصوف کے علاوہ آپ نے نثر اور نظم میں بھی کمال حاصل کیا۔ مثنوی معنوی جلال الدین کے افکار کا گراں بہا ثمرہ اور ان کے اشعار کا بہترین مجموعہ ہے بلکہ یہ فارسی زبان میں تصوف کا مکمل ترین دیوان ہے۔ اس میں چھ دفتر ہیں اور اشعار کی تعداد چھبیس ہزار ہے۔ جو بحر رمل میں کہے گئے ہیں۔ (۵)

مثنوی کے علاوہ مولانا کی اہم تصانیف میں غزلیات کا مجموعہ جو دیوان شمس تبریزی کے نام سے جمع کیا گیا ہے۔(۶)

مثنوی اور دیوان کے سوا مولانا کی ایک کتاب نثر میں فیہ مافیہ کے نام سے بھی موجود ہے۔ یہ مولانا نے اقوال کا مجموعہ ہے۔

مولانا نے ۶۷۲ھ میں قونیہ میں ہی وفات پائی اور اپنے والد کے اس مقبرے میں دفن ہوئے جو بادشاہ وقت کے حکم سے تیار کیا گیا تھا۔(۷)

مولانا شبلی سوانح مولانا روم میں لکھتے ہیں:

> آخر ۵/جمادی الثانی ۶۷۲ھ (۱۲۷۳ء) بروز یکشنبہ غروب آفتاب کے وقت آپ واصل الی اللہ ہوئے۔ مولانا اتیاز الدین نے غسل دیا۔ شیخ صدرالدین نماز جنازہ کے کھڑے ہوئے۔ مگر فرط غم سے چیخیں مار کر بے ہوش ہو گئے۔ آخر قاضی سراج الدین نے نماز جنازہ پڑھائی۔
>
> قونیہ میں مولانا کا مزار مبارک آج تک زیارت خواص وعام ہے۔(۸)

وفات سے کچھ پہلے فرمایا طشت پانی سے بھر کر لاؤ۔ پانی پیشانی پر ملتے تھے اور یہ شعر پڑھتے تھے۔

گر مومنی و شیریں ہم مومن است مرگ
ور کافری و تلخی ہم کافر است مردن

پھر فرمایا میرے احباب ادھر کھینچتے ہیں اور مولانا شمس الدین ادھر بلا رہے ہیں۔ اللہ کی طرف بلانے والے کو مانو اور اس پر یقین لاؤ۔(۹)

مولانا کی شاعری اور افکار پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں:

> مولانا جلال الدین کی شاعری رسائی مقصود، اتقان مطلب، لطافت

معنی باریکی خیال عرفانی فکر کی صفائی اور پختگی کی شاعری ہے گویا سنائی نے عرفانی شاعری کا قوام اور اس میں موزونیت تام پیدا کی۔ شیخ عطا نے اسے لطیف معانی اور شوروشوق کا مظہر بنایا اور مولانا جلال الدین نے اسے اوج کمال پر پہنچایا۔ اگر کوئی ایرانی شاعروں کے کاروان پر ذرا گہری نظر ڈالے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھے گا کہ فردوسی داستانی اور رزمیہ شاعری کا استاد ہے۔ خیام حکیمانہ رباعی کا ماہر ہے۔ انوری کی شاعری فنی قصیدہ کا مکمل نمونہ ہے۔ نظامی بزمیہ اور عشقیہ داستان بیان کرنے پر قادر ہیں۔ سعدی اچھوتی نثر اور دلکش غزل کے مالک ہیں۔ مولانا جلال الدین عرفانی مثنوی میں بے مثال ہیں اور حافظ عرفانی غزل کے آقا ہیں''۔(۱۰)

علامہ اقبال نے اپنے کلام میں اس مردمومن اور اپنے مرشد کا ذکر نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ علامہ اقبال سب سے زیادہ رومی سے ہی متاثر ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام شخصیتوں میں علامہ اقبال رومی کو سب سے زیادہ پسند کرتے تھے اور اقبال نے اپنے کلام میں بھی زیادہ انہی کا ذکر کیا ہے۔ علامہ اقبال اور رومی کی مثنوی کافی پسند تھی۔ رومی خود اپنی مثنوی معنوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہست قرآن در زبان پہلوی
نیست پیغمبر ولے دارد کتاب

علامہ کو مولانا روم کی مثنوی (ہست قرآن در زبان پہلوی) سے قرآن ہی کی وجہ سے شغف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر اس مثنوی کے مطالعے سے قلب میں گرمی شوق پیدا ہو جائے تو اور کیا چاہتے۔ شوق خود

مرشد ہے۔ علامہ کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انہوں نے کتابوں کا مطالعہ ترک کیا اور اگر وہ کبھی کبھار پڑھتے تو صرف قرآن شریف یا مولانا کی مثنوی۔ کلام اقبال میں اس مثنوی کے اثرات نمایاں ہیں۔ علامہ اور مولانا رومی کے تعلق کے بارے میں فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

''............ اگلی صبح عمداً دیر سے پہنچا۔ کوئی گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ اقبال کو دیکھا تو ان کی عجیب کیفیت تھی۔ رنگ زرد، چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ تفکر اور اضطراب کا یہ عالم کہ جیسے کوئی شدید سانحہ گزر گیا ہو۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے؟ کہنے لگے فقیر میرے قریب آ کر بیٹھو تو کہوں۔ آج صبح میں یہیں بیٹھا تھا۔ کہ علی بخش نے آ کے اطلاع دی کہ کوئی درویش صورت آدمی ملنا چاہتا ہے۔ میں نے کہا بلالو۔ ایک درویش صورت اجنبی میرے سامنے خاموش آ کھڑا ہوا کچھ وقفہ کے بعد میں نے کہا فرمایئے۔ آپ کو مجھ سے کچھ کہنا ہے، اجنبی بولا ''ہاں تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے تھے میں تمہارے سوال کا جواب دینے آیا ہوں'' اور اس کے بعد مثنوی کا مشہور شعر پڑھا:

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
تو ندانی اول آں بنیاد را ویراں کنند

کچھ پوچھو نہیں کہ مجھ پر کیا گزر گئی۔ چند لمحوں کے لیے مجھ سے قطعی اپنے گرد و پیش کا احساس جاتا رہا۔ ذرا حواس ٹھکانے ہوتے تو بزرگ سے مخاطب ہونے کے لیے دوبارہ نظر اٹھائی لیکن وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ علی بخش کو ہر طرف دوڑایا لیکن کہیں سراغ نہیں ملا''۔ (۱۱)

اقبال کے اسی قسم کے ایک اور واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے محمود الرحمان لکھتے ہیں۔ یہ واقعہ علامہ کے ساتھ مسجد قرطبہ میں پیش آیا۔ جس کا ذکر علامہ یوں کرتے ہیں:

''............مسجد کے اندر پہنچ کر میں نے اپنی آواز پوری شدت کے ساتھ اذاں دی۔ میں نے مصلیٰ بچھایا اور نماز ادا کرنے لگا۔ دوران نماز مجھ پر اس قدر رقت طاری ہوئی کہ میں گریہ وزاری برداشت نہ کرسکا اور جب میں سجدے میں گرا تو بے ہوش ہوگیا۔ اس دوران میں نے عالم رویا میں دیکھا کہ ایک بزرگ تشریف لاتے ہیں اور مجھے مخاطب کر کے کہہ رہے ہیں۔ اقبال! تم نے میری مثنوی کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اسے مسلسل پڑھتے رہو اور میرا پیغام دوسروں تک پہنچاؤ''۔ (۱۲)

اس بے پناہ لگاؤ کی وجہ سے ہی علامہ نے ہر ''مجموعہ کلام'' میں مولانا رومی کا ذکر کافی عقیدت اور محبت کے ساتھ کیا ہے۔ ''بال جبریل'' میں پیر و مرید کے عنوان سے ایک نظم ملتی ہے اس میں علامہ نے دور حاضر کے مسلمانوں کو حایق و معارف سے آگاہ کیا ہے۔ اس میں مسلمانوں کے تمام مسائل کو پیش کر کے مولانا روم سے ان کا حل دریافت کیا ہے:

مرید ہندی:

آہ مکتب کا جواں گرام خوں
ساحر افرنگ کا صید زبوں

پیر رومی:

مرغ پر نارستہ چوں پراں شود
طعمہ ہر گربۂ دراں شود

مرید ہندی:

اب مسلمان میں نہیں وہ رنگ و بو
سرد کیونکر ہوگیا اس کا لہو

پیر رومی:

تا دل صاحبدلے نامد بہ درد
ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد

مرید ہندی:

ہند میں اب نور ہے باقی نہ سوز
اہل دل اس دیس میں ہیں تیرہ روز

پیر رومی:

کار مرداں روشنی و گرمی است
کار دوناں حیلہ و بے شرمی است[۱۳]

اس نظم کی ابتداء اس شعر سے ہوتی ہے

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

اور مولانا رومی اس شعر کا جواب یوں دیتے ہیں:

علم رابر تن زنی مارے بودے
علم رابر دل زنی یارے بود[۱۴]

علامہ اقبال نے قرآن شریف کو اپنا رہنما پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنا

محبوب اور رومی کو اپنا مرشد بنایا۔ چنانچہ رومی کے پیغام کی اہمیت کو ''ضرب کلیم'' میں پیش کیا ہے۔ علامہ نے ''رومی'' عنوان کے تحت اس نظم میں مثنوی رومی کی اہمیت اوران کے تصور عشق پر زور دیا ہے یہاں انہوں نے اپنا فلسفہ خودی بھی ظاہر کیا ہے اور قرآن شریف پر عمل کرنے کی تلقین بھی کی ہے۔ مسلمانوں کو اپنے دلوں میں عشق رسول ﷺ کا جذبہ پیدا کرنے کی ہدایت دی ہے۔ مذکورہ نظم یوں ہے:

غلط نگر ہے تیری چشم نیم باز اب تک
تیرا وجود ہے تیرے واسطے راز اب تک
تیرا ناز نہیں آشنائے راز اب تک
کہ ہے قیام سے خالی تیری نماز اب تک
گستہ تار ہے تیری خودی کا ساز اب تک
کہ تو ہے نغمۂ رومی سے بے نیاز اب تک [۱۵]

علامہ کے تمام تصانیف میں رومی کے تئیں زیادہ عقیدت اور احترام ''جاوید نامہ'' میں ملتا ہے۔ یہاں رومی کا ذکر زیادہ موثر انداز میں ملتا ہے:

> ''جاوید نامہ'' بعضوں کے نزدیک اقبال کی بہترین تصنیف ہے۔ تمام تر رومی کے رنگ و بو سے آراستہ ہے۔ اس میں شاعر رومی کی معیت میں عالم بالا کی سیر کرتا ہے۔ ارواح سے ہمکلام ہوتا ہے گویا رومی ہی کی اعانت سے کائنات کے مضمون کو سمجھتا ہے''۔ (۱۶)

علامہ نے ''جاوید نامہ'' میں اپنی تمام تر سیر مرشد رومی کے ساتھ کی

ہے اور مرشد رومی کی رہنمائی ہر مرحلہ پر اقبال کو حاصل ہوتی ہے۔ یہاں صرف بارگاہ ایزدی میں علامہ اکیلے اور تنہا حاضر ہوتے ہیں۔ باقی اول تا آخر رومی ہی کی معیت میں سارا سفر طے کرتے ہیں۔ علامہ نے اپنی اس تمثیلی نظم میں مختلف کرداروں کے ذریعے مختلف مسائل کا حل تلاش کیا ہے۔ اس کے علاوہ مختلف حالات و واقعات کا اظہار بھی یہاں ملتا ہے، اس لازوال تصنیف میں علامہ نے شاعری میں فلسفہ کو ایک ساتھ پیش کیا ہے اور اس طرح اعلیٰ فنکاری کی عکاسی کی ہے۔

اس کتاب میں علامہ نے ایسے حقائق اور معارف بیان کئے ہیں جن کا تعلق عالم بالا یا جہاں دیگر سے ہے(۱۷)

آنچہ گفتم از جہاں دیگر است
ایں کتاب از آسمان دیگر است[۱۸]

خاتمہ پر علامہ نے ''خطاب بہ جاوید'' میں اقبال شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے جہاں انہوں نے جاوید کے پردہ میں مسلمان نوجوانوں کو مرشد رومی کی اتباع کرنے کا مشورہ دیا ہے۔

''جاوید نامہ'' کے آخری حصے ''خطاب بہ جاوید'' میں علامہ نے پیر رومی کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ پیر رومی کی مثنوی کا مقصد لوگوں نے سمجھا نہیں ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

گر نیابی صحبت مرد خبیر　　از اب وجد آنچہ من دارم بگیرا
پیر رومی را رفیق راہ ساز　　تا خدا بخشند تر سوز و گداز

زانکہ رومی مغز را داند ز پوست　　پاے او محکم فتد در کوے دوست

شرح او کردند اور اکس ندید　　معنی او چوں غزال از ما رمید

رقص تن از حرف او آموختند　　چشم را از رقص جاں بردوختند

رقص تن در گردش آرد خاک را　　رقص جان برہم زند افلاک را [19]

علامہ اور رومی کا ذکر کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''مطالعہ رومی کی مثنوی کے سلسلے میں اقبال کا نصب العین یہی رقص جاں ہے جس سے علم و حکمت تک رسائی ہوگی، اقبال کے نزدیک قرآن کے بعد جو کتاب اس عظیم مقصد کو پورا کرسکتی ہے وہ مثنوی رومی ہے''۔(۲۰)

ایک اور جگہ رومی اور اقبال کا ذکر کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''اگر رومی نے اقبال کے فکر کو چار چاند لگائے ہیں تو اقبال نے بھی رومی کے افکار عالیہ کو بڑی عزت و شان سے دنیا میں متعارف کرایا''۔(۲۱)

''جاوید نامہ'' کے علاوہ علامہ نے ''پیام مشرق'' میں بھی مولانا رومی کا ذکر کرتے ہوئے رومی کے عشق کو بوعلی سینا کے فلسفہ پر ترجیح دی ہے۔

بو علی اندر غبار ناقہ گم　　دست رومی پردہ محمل گرفت

ایں فروتر رفت تا گوہر رسید　　آن بگردابے خوش منزل گرفت

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر می گردد چو سوز از دل گرفت [22]

''بال جبریل'' میں رومی کا ذکر یوں کیا ہے:

صحبت پیر رومی سے مجھ پر ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب ایک حکیم سر بکف[۲۳]

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایران وہی تبریز ہے ساقی[۲۴]

''عجم کے لالہ زاروں سے پھر کوئی رومی اٹھا ہو یا نہ اٹھا ہو لیکن تیرہ خاکدان ہند سے ضرور ایک اور رومی نمودار ہوا جس نے چھ سو سال بعد پیر رومی کے مرید ہندی کے بطور بعینہ ویسا ہی کردار کیا اور اسلام کو پھر یونانی اور اجنبی عناصر سے نجات دلا کر اس کے حقیقی رنگ میں پیش کیا......''۔(۲۵)

بال جبریل میں ہی ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی[۲۶]

ضرب کلیم میں لکھتے ہیں:

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی
کچھ ہاتھ نہیں آتا بے آہ سحر گاہی[۲۷]

اسرار خودی میں مولانا کا ذکر یوں ملتا ہے:

باز بر خوانم رفیق پیر روم — دفتر سربستہ اسرار علوم
پیر رومی خاک را اکسیر کرد — از غبارم جلوہ تعمیر کرد[۲۸]

مثنوی مسافر میں لکھتے ہیں:

ز آتش مردان حق می سوزمت — نکتہ از پیر آموزمت[۲۹]

پس چہ باید کرد میں لکھتے ہیں:

پیر رومی مرشد روشن ضمیر　　کاروان عشق مستی را امیر
از نئے آن نے نواز پاک زاد　　باز شورے در نہاد من فتاد[30]

اسی طرح مندرجہ ذیل اشعار میں رومی کا ذکر بڑے خلوص اور عقیدے سے ملتا ہے:

چوں رومی در حرم دارم اذن من　　ازو آموختم اسرار جان
بدور فتنۂ عصر کہن او　　بدور فتنۂ عصر روان من[31]

بکام خود گر آں کہنہ مے ریز　　کہ باجامش نیرزد ملک پرویز
ز اشعار جلال الدین رومی　　بدیوار حریم دل بیاویز[32]

ز رومی گیر اسرار فقیری　　کہ آں فقر است محسود امیری
حذر زاں فقر و درویشی کہ ازوے　　رسیدی بر مقام سربریزی[33]

ز چشم مست رومی وام کردم　　سرورے از مقام کبریائی[34]

مقام ذکر کمالات رومی و عطا
مقام فکر مقالات بو علی سینا[35]

علامہ اقبال اور مرزا عبدالقادر بیدل

مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آباد (پٹنہ) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر گزرے ہیں۔ مشکل پسندی، مضمون آفرینی اور رفعت تخیل کے لحاظ سے غالب اور عرفی کے علاوہ اور کوئی شاعر ان کا ہمسر نہیں ہے۔ چنانچہ غالب نے اس شعر میں ان کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

طرز بیدل میں ریختہ کہنا
اسد اللہ خان قیامت ہے

............ساری عمر کسی امیر کے مکان پر نہیں گئے اس شان استغناء کا نتیجہ یہ نکلا کہ نظام الملک بھی ملنے کے لیے مکان پر آتا تھا اور جب اس نے دکن میں اپنی حکومت قائم کی تو انہیں بلوایا لیکن انہوں نے خط کے جواب میں یہ شعر لکھ کر بھیج دیا۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش

مرزا بیدل ہندوستان کا آخری بڑا فارسی گو شاعر ہے۔ جس نے ایک لاکھ سے زیادہ اشعار کہے ہیں۔ بے شبہ بیدل نے غزل میں عرفانی شعر

کہے ہیں۔ نہایت درجہ استادانہ مثنویاں لکھی ہیں اور اس کا کلام ہندی سبک کا بہترین نمونہ ہے۔ بیدل کے کلیات میں غزلیں اور منظوم پند و حکم کے سوا نثر میں ''نکات'' کے نام سے ایک رسالہ بھی ملتا ہے۔ بیدل نے ۱۱۳۳ھ میں بمقام دہلی وفات پائی۔(۱)

خودداری کا یہ عالم تھا کہ مرتے وقت دوستوں کو وصیت کی جب میرے مکان میں صحن موجود ہے تو مجھے کسی قبرستان میں دفن نہ کرنا۔ غیر کا احسان کیوں اٹھاؤں۔(۲)

مرزا عبدالقادر بیدل جیسی عظیم المرتبت شاعر کا ذکر بھی کلام اقبال میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ ملتا ہے۔ دونوں شعراء کے درمیان کئی مماثلتی پہلو بھی ملتے ہیں۔اس کے علاوہ علامہ اقبال نے بیدل کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔رومی کے علاوہ اس شخصیت کو علامہ نے اس قابل سمجھا کہ اپنی شاعری میں نہایت ہی عظمت کے ساتھ ان کو پیش کردیا۔علامہ نے مرزا بیدل کو''مرشد کامل'' قرار دیا ہے۔(۳)

جس نظم میں علامہ نے بیدل کو''مرشد کامل'' قرار دیا ہے وہ مندرجہ ذیل نظم ہے۔یہ نظم چھ اشعار پر مشتمل ہے اور''مذہب''عنوان سے بانگ درا میں شامل ہے۔

مذہب تضمین بر شعر مرزا بیدل

تعلیم پیر فلسفہ مغربی ہے یہ
ناداں ہے جس کو ہستی غائب کی ہے تلاش
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا

ہے شیخ بھی مثال برہمن تراش
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی
اس دور میں ہے شیشہ عقاید کا پاش پاش
مذہب ہے جس کا نام وہ ایک جنون خام
ہے جس آدمی کے تخیل کو انتعاش
کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور
مجھ پر کیا ''مرشد کامل'' نے راز فاش
''باہر کمال اند کے آشفتگی خوش است
ہر چند عقل کل شدہ بے جنوں مباش''

(بانگ درا، ص ۲۴۸)

اقبال نے مذکورہ بالا تضمین میں اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اگر چہ مذہب کے لیے عقل ضروری ہے مگر اس کی بنیاد خدا تعالیٰ کی محبت پر ہے مگر جب تک مسلمان میں جنون کا رنگ نہ ہو اس وقت وہ حقیقی معنوں میں مسلمان نہیں بن سکتا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''بیدل کو وہ ''مرشد کامل'' کے خطاب سے یاد کرتے ہیں.................
اس کا مطلب یہ ہے کہ بیدل کا خاص احترام ان کے دل میں موجود تھا''۔(۴)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''یہ قطعہ بھی فلسفیانہ ہے علامہ اقبال فلاسفہ مغرب کے افکار کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے فلسفہ زندگی اپنے مرشد کامل بیدل عظیم آبادی سے

سیکھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ انسان چاہے جس قدر کمال خرد حاصل کر لے مگر وہ جنوں کے بغیر بیکار ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ''اسرار خودی'' کی تصنیف کے وقت حضرت علامہ بیدل کا مطالعہ ایک مفکر شاعر کی حیثیت سے کر رہے تھے۔ اظہار و ابلاغ کی خوبیوں کو اپنانے کے بعد اگلا قدم بیدل کے افکار سے استفاضہ تھا جو اس قطعے سے ظاہر ہے۔ اس لیے یہ کہنا بجا ہے کہ علامہ کے نظریات کی تشکیل میں بیدل کا قابل قدر حصہ ہے۔ علامہ انہیں ''مرشد کامل'' یوں ہی نہیں کہتے ہیں''۔(۵)

علامہ اقبال اس سے پہلے بھی بیدل عظیم آبادی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ نظم ''تصویر درد'' میں علامہ نے بیدل کا ایک شعر درج کیا ہے جس سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ علامہ کو بیدل سے ابتداء ہی سے لگاؤ تھا۔ اس نظم کا آخری شعر بیدل کا ہے:

درس حسرت سرا عمریست افسوں جرس دارم
زفیض دل طپیدن ھا فروش بے نفس دارم[۶]

بیدل کی اس غزل کا دوسرا شعر یوں ہے:

درین گلشن نوائے بود دام عندلیب من
زبس نازک دلم از بوئے گل چوب قفس دارم

اس شعر کو علامہ نے یوں پیش کیا ہے:

اٹھائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستان میری[۷]

اقبال اور بیدل کے فکر و اسلوب سے پہلے ہی سے متاثر نظر آتے

ہیں۔ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''صرف مرزا غالب کی حسین وجمیل، فکر انگیز اور اثر پرور ترکیب ہی بیدل کی تراکیب کا واضح پرتو اپنے اندر نہیں رکھتیں بلکہ علامہ اقبال کے حسن کلام کا خمیر بھی کافی حد تک بیدل کے دلآویز انداز ابلاغ سے تیار ہوا ہے۔اس نقطہ نگاہ سے اگر تمام ''تصویر درد'' کا مطالعہ کیا جائے تو بڑا سودمند ثابت ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۴ء میں اقبال بیدل کے اظہار وابلاغ کے پیرائیوں سے خاصے مسحور تھے''۔(۸)

''علامہ نے بیدل کی طرف ابتداء سے ہی اپنی توجہ معطوف رکھی اور چند فارسی غزلوں میں بیدل کے ظاہری سبک کا تتبع کیا''۔(۹)

علامہ نے ''ضرب کلیم'' مرزا بیدل کے عنوان سے ایک نظم لکھی ہے۔ اس میں بیدل کے ایک شعر کو تضمین کیا گیا ہے۔اس نظم میں بیدل کی زبانی کائنات کی حقیقت کا بیان کی ہے۔

ہے حقیقت یا مری چشم غلط بین کا فساد
یہ زمین یہ دشت یہ کہسار یہ چراغ کبود
کوئی کہتا ہے نہیں ہے کوئی کہتا ہے کہ ہے
کیا خبر ہے یا نہیں ہے تیری دنیا کا وجود
میرزا بیدل نے کس خوبی سے کھلی یہ گرہ
اہل حکمت پر بہت مشکل رہی جس کی کشود
''دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بوداین چمن
رنگ می بیروں نشت از بسکہ مینا تنگ بود''۱۰

بیدل نے اس کائنات کی حقیقت کو یوں بیان کیا ہے کہ کائنات

(تجلیات انوار الٰہ) کا مظہر ہے اس کے علاوہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ مومن کا قلب تجلیات کا محیط ہے اگر اس میں وسعت ہوتی تو ساری تجلیات کو اپنے اندر جذب کر لیتا لیکن اس وسعت کی کمی ہی تھی جس کی وجہ سے کائنات وجود میں آئی اور اس کائنات کا وجود حقیقی نہیں بلکہ خدا کی تجلیات کا پرتو ہے۔ مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمغنی لکھتے ہیں:

> ''یہ شعر نظری فلسفے کے ایک اہم موضوع سے تعلق رکھتا ہے فلاسفہ میں یہ بات شروع سے چلی آ رہی ہے کہ کائنات کی اصل Matter ہے یا Mind۔ علامہ فرماتے ہیں کہ جس کھتی کو ہیگل جیسے فلسفی سلجھا نہ سکے اسے بیدل کس عمدگی کے ساتھ کھول دیتے ہیں۔ بیدل کہتے ہیں کہ اصل حقیقت Mind یعنی قلب ہے اور جو مادی اشیاء نظر آتی ہیں انہیں اس شراب کا رنگ کہنا چاہیے جو مینا یعنی قلب کے اندر ہے۔ ''ضرب کلیم'' کی اس تضمین سے پتہ چلتا ہے کہ فلسفہ زندگی کے علاوہ علامہ مرحوم بیدل کے نظری فلسفے کے بھی مداح تھے''۔(۱۱)

علامہ اقبال نے اپنے خطباب میں بھی بیدل کا ذکر کیا ہے وہ انہیں عبدالقادر عظیم آبادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ کے ملفوظات میں بھی بیدل کے فلسفہ زندگی کا ذکر آیا ہے جس بات کا اشارہ یوں ملتا ہے۔

> ''علامہ کے ملفوظات میں بھی بیدل کے فلسفہ زندگی کا ذکر آیا ہے جس کی طرف اشارہ عبداللہ بیگ انور نے بھی اپنی تصنیف ''شاعر مشرق'' (Poet of East) میں کیا ہے۔ اپنے ایک ملفوظ میں غالب کے مقابلے میں بیدل کے فلسفے کو علامہ مرحوم نے حرکی کہا ہے وہ کہتے ہیں

کہ اپنے اسی نوعیت کے فلسفۂ حیات کی وجہ سے ناصر علی سرہندی کی طرف بیدل افغانستان اور وسط ایشیا میں مقبول ہوئے''۔ (۱۲)

علامہ اقبال نے اس کے علاوہ ''کلیات بیدل'' کا ذکر اپنی وصیت میں کیا ہے جس کا ثبوت ''روزگار فقیر'' کے مطالعہ سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ واحد کلیات ہے جس کا ذکر علامہ نے کیا تھا اس بات سے علامہ کی عقیدت اور احترام کا ذکر ملتا ہے جو وہ بیدل کے تئیں رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ایک جگہ عقیدت اور محبت کی ذکر کا اظہار یوں ملتا ہے۔

''حضرت علامہ نے اس دنیا میں ۲۱/اپریل ۱۹۳۸ء کو رحلت فرمائی اس سے پہلے ۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو جب ان کی زندگی میں انٹر کالجیٹ مسلم برادرہڈ نے یوم اقبال منایا تو طلبہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، تو اس موقعہ پر علامہ نے فرمایا ''یوم اقبال منانے کی کیا ضرورت تھی منانا تھا تو یوم بیدل منایا ہوتا''۔ (۱۳)

افکار پریشان میں علامہ نے بیدل کا ایک شعر درج کیا ہے یہ نوٹ بک Strary Reflections کے نام سے طبع ہو چکی ہے اس شعر میں ''حیرت'' جو بقول افلاطون تمام علوم کی ماں ہے کے بارے میں بیدل یوں فرماتے ہیں:

نزاکت ہاست در آغوش مینا خانہ حیرت
مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را[۱۴]

غرض علامہ اقبال نے بیدل کا ذکر ابتداء سے آخر تک کیا ہے جس سے اس بات کا ثبوت فراہم ہوتا ہے کہ علامہ کو بیدل سے کس قدر لگاؤ تھا۔

علامہ اقبال اور مرزا عبد القادر بیدل کے درمیان مماثلت کے کئی

پہلو ملتے ہیں۔ علامہ اور بیدل کے درمیان عشق کے علاوہ سوز و ساز مشترکہ موضوعات میں شامل ہیں۔ دونوں کے یہاں کلی یا جزوی اشتراک ملتا ہے۔ڈاکٹر ریاض لکھتے ہیں:

''اقبال کی بعض پسندیدہ تراکیب بیدل کے یہاں موجود ہیں۔مثلاً الطاف غمیم، ذوق نمود، لطاف خرام تو ادراک، ذوق تبسم، برق تجلی، قافلہ رنگ و بواز خورشید بانگ درا، خون جگر اور عشق وغیرہ وغیرہ''۔(۱۵)

اس کے علاوہ فکری پہلو کا اظہار بھی ملتا ہے:

بیدل:

باز آمدن مہدی و عیسیٰ اینجا　　از تجربہ مزاج ادیان دور است

علامہ:

مینار دل پر اپنے خدا کا نزول دیکھ
اور انتظار مہدی و عیسیٰ بھی چھوڑ دے

دونوں شاعروں نے مسلمانوں کے فکری اثاثے سے کام لے کر اپنے زمانے کے افکار کا جائزہ لے کر عجمی اثرات کو دور کر کے فقر، مذہب اور دین کی تعلیمات کو اجاگر کیا[۱۶] دونوں شعراء کو قدرت نے بلند فکر عطا کی تھی جس کی وجہ سے ان کو ایک شعور حاصل تھا کہ دونوں نے اسلامی روایات کو اپنے اپنے انداز سے آگے بڑھایا اور یہی وجہ ہے کہ علامہ نے بیدل ہی کا انتخاب کر کے ان کی بلندی اور عظمت کو سراہا اور حقیقت میں وہ اسی بلندی اور حقیقت کے مستحق تھے۔

"بیدل بے مقصد خیال آرائی نہیں کرتے بلکہ عجمی افکار کے مقابلے میں اسلام کی صالح اور حیات افروز تعلیمات بن کرتے ہیں اور یہی چیز علامہ اقبال کی بیدل سے وابستگی کا موجب تھی"۔(۱۷)

ان باتوں کے علاوہ علامہ اقبال اور بیدل میں فکری ہم آہنگی ملتی ہے اور دونوں کے فلسفہ میں مماثلت نظر آتی ہے۔ دونوں کا تخیل بلند ہے۔ بیدل کا تخیل نہ صرف بلند ہے بلکہ بے باک بھی ہے۔

ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

"ان کے تخُل کی بلند پرواز محض واہمہ نہیں ہے اس میں مغز ہے وزن اور وقار ہے گرانمائیگی ہے حکمت اور فلسفہ کی گیرائی اور گہرائی ہے۔ وہ شاعر سے زیادہ حکیم ہے اور اس لیے کبھی کبھی شاعرانہ زبان اور اسلوب کا جامہ ان کے خیالات پر تنگ ہو جاتا ہے اور یہی حال ان کے فرزند معنوی مرزا اسداللہ خان غالب کا ہے علامہ بھی اس سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ انہوں نے مرزا غالب کے تخُل کی بلندی کے بارے میں جو لکھا ہے وہ بڑی حد تک مرزا بیدل پر صادق آتا ہے۔ رفت پسندی بیدل کے اس رنگ طبیعت کی ذمہ دار ہے"۔(۱۸)

اکبرالہ آبادی مرزا سلطان احمد کو ایک خط میں دونوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"اقبال کا حسن بیان دیکھیے۔ اسے دیکھ کر بیدل بھی مسحور ہو جاتے ہیں"۔(۱۹)

غرض بانگ درا سے آخری وصیت تک علامہ نے بیدل کا ذکر کر کے ان کے تئیں اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

❁❁❁

تاریخ فلسفہ کے اعلام ومشاہیر

(۱) اقبال اور سید جمال الدین افغانی
(۲) اقبال اور امام غزالی
(۳) اقبال اور سعید حلیم پاشا
(۴) اقبال اور ٹیپو سلطان
(۵) اقبال اور نادر شاہ

علامہ اقبال اور سید جمال الدین افغانی

سید جمال الدین افغانی کا تعلق افغانستان کے نہایت اہم ممتاز خاندان سادات سے تھا۔ان کا نسب مشہور محدث حضرت علی الترمذی کے واسطے سے حضرت امام حسین بن علی المرتضیٰ کرم اللہ تعالیٰ وجہہ سے جاملتا ہے۔اس لیے انہیں سید کہتے ہیں۔ان کے اپنے بیان کے مطابق وہ حنفی گھرانے میں ۱۲۵۴ھ/ مطابق ۱۸۲۸ء۔۱۸۳۹ء میں ضلع کابل (افغانستان) میں مشرق کی جانب کنر (Konar) نزدیک اسعد آبادی میں پیدا ہوئے۔شیعہ مصنف ان کی جائے پیدائش ایران میں ہمدان کے نزدیک اسد آباد میں بتاتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ جمال الدین افغانی نے اپنے آپ کو افغانی قومیت سے اس لیے منسوب کیا کہ وہ ایران کے مطلق العنان حکومت سے بچ نکلیں۔لیکن انہوں نے اپنے بچپن اور شباب کے ایام یقیناً افغانستان میں بسر کیے۔کابل میں انہوں نے مروجہ تعلیم حاصل کی،اس کے علاوہ انہوں نے فلسفے اور عوام طبعی کی طرف بھی توجہ دی۔(۱)

جمال الدین افغانی کی عظمت کے پیش نظر ایرانیوں نے دعویٰ کیا ہے کہ جمال الدین کا وطن ایران ہے اور افغانستان والے انہیں افغانی

کہتے ہیں۔ اگر چہ ان کے وطن کے بارے میں اختلاف رائے ضرور پایا جاتا ہے لیکن یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جمال الدین کا وطن اسعد آباد افغانستان ہی ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ خود جمال الدین افغانی کہتے ہیں:

''من از سادات معروف کنر در سال ۱۲۵۴ھ در افغانستان تولد شدم''۔(۲)

جمال الدین افغانی کے وطن کے بارے میں عبدالحلیم اثر افغانی لکھتے ہیں:

''سید موصوف ''اسد آبادی'' نہیں تھے بلکہ اسعد آبادی تھے۔ اسد آباد (ایران) میں ہے اور اسعد آباد افغانستان کے مشرقی علاوہ کنر میں صوبہ ننگر ہار کے دارالحکومت جلال آباد سے شمال مشرق کی طرف دریائے کنٹر کے کنارے واقع ہے..........اس خیال کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس اسعد آباد کا علم نہیں جو افغانستان میں ہے اور دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو اس جمال الدین ایرانی کا بھی علم نہیں جو سید جمال الدین کا معاصر تھا اور جس کے نام سید جمال الدین افغانی کا ایک مکتوب بھی موجود ہے''۔(۳)

سید جمال الدین کے بارے میں شاہد حسین رزاقی لکھتے ہیں:

''افغانستان کا علاقہ کنز میں مواضعات کے مجموعے کو پست کہا جاتا ہے اور دریائے کنز کے کنارے واقع سادات کی بستیاں پشت سادات کہی جانے لگیں۔ اس علاقہ میں ایک اہم بستی اسعد آباد ہے جہاں ماہ شعبان ۱۲۵۴ھ مطابق ۱۸۲۸ء میں سید جمال الدین افغانی پیدا ہوئے''۔(۴)

جمال الدین کے والد کا نام سید صفدر اور والدہ کا نام سیدہ سکینہ تھا۔ جمال الدین کی ابتدائی تعلیم و تربیت اسعد آباد میں ہوئی۔ انہوں نے

ساری عمر میں اپنی ذہانت، محنت، لگن اور قابلیت سے تمام علوم کا بخوبی مطالعہ کیا اور کمال حاصل کرلیا۔ جب سید صاحب کے والد کابل میں رہنے کے لیے مجبور کئے گئے تو اس وقت ان کی عمر صرف آٹھ سال کی تھی۔ اس لیے ان کی ابتدائی تعلیم وہیں انجام پائی۔ اٹھارہ سال کی عمر تک اپنے والد کے ساتھ کابل میں مقیم رہے جہاں اپنے والد اور دوسرے علمائے روزگار کے خرمن علم سے خوشہ چینی کی سعادت حاصل کی اور اپنی بے مثال ذہانت اور طباعی کے سبب آغاز شباب میں ہی تمام رائج الوقت علوم و فنون، نحو بلاغت، تاریخ فلسفہ، تصوف، ریاضی، طب اور کلام وغیرہ میں عبور کامل حاصل کرلیا۔ تاریخ میں انہیں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ ۱۹۵۶ء میں سید صفدر کا انتقال ہوگیا اس وقت سید جمال الدین کی عمر انیس سال کی تھی۔ علوم مروجہ کی تکمیل کے بعد انہوں نے اس میدان کی طرف قدم بڑھائے جس کے لیے قدرت انہیں منتخب کرچکی تھی۔ عالم اسلام ایک مدت دراز سے ایسی ہی انقلابی شخصیت کا منتظر تھا۔ زمین کا کوئی خطہ بھی اس کے فیض سے محروم نہ رہ سکا۔ اوراس کی گن گرج سے مشرق کی سوئی ہوئی دنیا کروٹیں لینے لگی۔ (۵)

اٹھارہ انیس سال کی عمر میں افغانی ہندوستان آئے اور یہاں ڈیڑھ برس کے قیام کے دوران علم جدید سے فیض یاب ہوئے۔ پھر وہ حج کے لیے چلے گئے۔ ۱۸۵۷ء واپسی پر وہ افغانستان پہنچے اور امیر دوست محمد خان کی ملازمت اختیار کی۔ ۱۸۷۱ء میں قاہرہ (مصر) روانہ ہوئے،

اگر چہ وہاں مستقل قیام کرنے کا ارادہ نہ تھا مگر ان کا تعلیم یافتہ طبقے کی طرف سے بالخصوص اس قدر عقدت و محبت سے خیر مقدم کر لیا گیا کہ انہوں نے وہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کر لیا۔[6] یہاں انہوں نے نوجوانوں کو صحافی اور ادیب بننے کی تعلیم دی تا کہ وہ قلمی جہاد کر سکیں۔ مصر کا قدامت پسند طبقہ اور حکومت برطانیہ خاص کر جمال الدین افغانی کی مقبولیت اور سرگرمیوں سے خوف زدہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ کے اثر ورسوخ سے ۱۸۷۹ء میں جمال الدین کو ملک بدر کر دیا گیا۔ پھر وہ ہندوستان چلے آئے۔ ستمبر ۱۹۸۳ء کو بلنٹ نے ان سے پیرس میں ملاقات کی۔ وہ بلاد اسلامیہ میں انگریزوں کی حکمت عملی کے خلاف تحریک چلا رہا تھا۔ پیرس کے قیام میں ان کا امتیازی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے محمد عبدہٗ سے مل کر عربی میں ہفتہ وار اخبار ''عروۃ الوثقیٰ'' نکالا۔ یہ رسالہ اسی نام کی ایک خفیہ جماعت کا نمائندہ تھا جو اسکے معارف برداشت کرتی تھی۔ اس کا پہلا شمارہ ۱۵ر جمادی الاولیٰ ۱۳۰۱ھ/ ۱۳ر صیح ۱۴ر مارچ ۱۸۸۴ء کو نکلا اور اٹھارھواں اور آخری ۲۶ر ذی الحجہ ۱۳۰۱ھ/ ۱۶ صیح ۱۸ر اکتوبر ۱۸۸۴ء کو یہ اخبار اس جماعت کے ارکان کو اور جو بھی طلب کرتا اسے مفت دیا جاتا۔ حکومت برطانیہ نے مصر اور برطانیہ میں اس کا داخلہ ممنوع قرار دیا۔ (۷)

افغانی کے آخری ایام اندوھناک تھے انہوں نے یہ دن قسطنطنیہ کے طلائی قفس میں بسر کیے جہاں سلطان عبدالمجید نے انہیں اپنے سفیر لندن کے ذریعے دو دفعہ طلب کیا تھا۔ (۱۸۹۲ء) میں پہلے تو انہوں نے انکار کیا

لیکن پھر جانے پر رضامند ہو گئے............۱۹/مارچ ۱۸۹۷ء کو تھوڑی سی سرطان کی بیماری سے ان کا انتقال ہو گیا۔ دسمبر ۱۹۴۴ء کے اواخر میں ان کی نعش کو افغانستان لے جایا گیا۔ جہاں ۲ جنوری ۱۹۴۵ء کو کابل کے مضافات علی آباد کے قریب انہیں دفن کیا گیا اور ان کا مقبرہ تعمیر کیا گیا۔(۸)

افغانی کی زندگی تین اوصاف کی وجہ سے ممتاز ہے اولاً لطیف روحانیت، ثانیاً گہرا دینی اساس اور ثالثاً بلند اخلاقی معیار۔(۹)

جمال الدین افغانی مذہب کو تمام چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک حقیقی تہذیب کی بنیاد علم اخلاق اور مذہب پر ہونی چاہیے۔ وہ اسلامی اجتماعیت کو اشتراکیت اور اشتمالیت پر اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ اشتراکیت اور اشتمالیت کا مدار خودغرضی اور جبر وظلم پر ہے۔

جمال الدین افغانی تحریک اتحاد اسلامی کے (جسے مغربی اہل قلم زیادہ تر مذمت کی خاطر پان اسلامزم کہتے ہیں) علمبردار ہیں۔ اس تحریک کا مقصد تمام اسلامی حکومتوں کو ایک خلافت کے جھنڈے تلے متحد و منظّم کرنا تھا تاکہ وہ غیر ملکی تسلط سے چھٹکارا حاصل کرسکیں اور عزت کی زندگی بسر کرسکیں۔ اس لیے وہ قوم کی بلندیوں تک لے جانے کی تربیت دیتے ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں:

جن لوگوں کو اپنی زبان نہ ہو ان میں قومیت کا صحیح تصور نہیں پیدا ہو سکتا۔ اور جس قوم کا اپنا ادبی سرمایہ نہ ہو اس کی زبان بھی نہیں ہوتی۔ نیز جس قوم کی اپنی تاریخ نہیں اس کی دنیا میں کوئی عزت نہیں ہو سکتی اور جو

لوگ اپنے وطن کے ورثے کو حاصل نہیں کر سکتے یا اپنے بزرگوں کے کارناموں کی قدر نہیں کر سکتے ان کی کوئی تاریخ نہیں ہو سکتی''۔(۱۰)

افغانی کی تصانیف میں جرائد اور رسائل کے علاوہ ایک کتاب ''الواحدۃ اسلامیہ'' نہایت اہم ہے دوسری کتاب ''ابطال الملحدین'' ہے دونوں ان کی اہم تصانیف ہیں جن میں انہوں نے اپنے نظریات کے علاوہ اتحاد اسلامی پر زور دیا ہے۔ انہی اصولوں کے لیے انہوں نے اپنی ساری زندگی اور صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ تحریک اصلاح جس نے پہلے سلفیہ اور پھر بعد میں اخوان المسلمین کو پیدا کیا انہی کی ذات کی مرہون منت ہے۔ انہوں نے تقریر و تحریر کے ذریعے مسلمانوں کے فکر و عمل کی نشاۃ الثانیہ کی اہمیت پر بہت زور دیا۔(۱۱)

علامہ اقبال نے دیگر مشاہیر کی طرح سید جمال الدین افغانی کا ذکر بھی نہایت ہی عقیدت اور احترام سے کیا ہے۔ علامہ نے افغانی کی تعلیمات سے اثر قبول کر لیا تھا۔ وہ ان کے بے حد مداح تھے اور اس کی خدمات کو سراہا۔ علامہ اور افغانی کے درمیان کچھ مشترکہ خصوصیات بھی تھیں جن میں اتحاد اسلامی اور اسلامی حکومتوں کے قیام کے علاوہ مکہ معظّمہ کو مسلمانوں کا اہم مرکز قرار دینا تھا۔ اس کے علاوہ مسلم سلطنتوں کا وسیع بنیادوں کا قیام بھی افغانی نے سوچا تھا اور ان میں خلیفہ المسلمین کو بھی اہم قرار دیا تھا۔

جب افغانی کا انتقال ۱۸۹۷ء میں ہوا، اسی سال اقبال نے

بی۔اے کا امتحان پاس کیا۔عربی اور انگریزی میں اعلیٰ استعداد پر دو طلائی تمغے دیے گئے تھے اور ایم۔اے کرنے کے لیے وظیفہ بھی ملا تھا اس وقت یقیناً افغانی تحریروں کا مطالعہ کیا ہوگا۔ وہ ہندوستان کے ان نوجوان مسلم طلباء میں سے تھے جنھوں نے افغانی کے افکار اور ان کی تحریک سے اثر قبول کیا تھا۔(۱۲)

علامہ اقبال اور افغانی کی ملاقات کا ذکر کہیں نہیں ملتا البتہ جو کام افغانی نے شروع کیا اسکی تکمیل کے لیے قدرت نے علامہ کو متعین کر دیا۔(۱۳)

''علامہ کے نزدیک افغانی نے اسلام کی سربلندی کے لیے کافی موثر اقدامات کئے ان کی عالمگیر جدوجہد اور انقلابی خدمات علامہ کو کافی پسند تھیں۔علامہ کے خیال میں افغانی اپنے زمانے میں مسلمانوں نشاۃ الثانیہ کے موسس اور اپنے عہد میں سب سے بڑے مشرقی بلکہ سب سے بڑے مسلمان تھے''۔(۱۴)

سید جمال الدین کا ذکر کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں:

''مولانا سید جمال الدین افغانی کی شخصیت کچھ اور ہی تھی۔قدرت کے طریقے بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں۔مذہبی فکر وعمل کے لحاظ سے ہمارے زمانے کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ مسلمان افغانستان میں پیدا ہوا ہے۔ جمال الدین دنیائے اسلام کی تمام زبانوں سے واقف تھے۔ان کی فصاحت و بلاغت میں سحر آفرینی ودیعت تھی۔ان کی بے چین روح ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک کا سفر کرتی رہی اور اس نے ایران، مصر اور ترکی کے ممتاز ترین افراد کو متاثر کیا۔

ہمارے زمانے کے بعض جلیل القدر علماء جیسے مفتی محمد عبدہٗ اور نئی پود کے بعض افراد جو آگے چل کر سیاسی قائدین بن گئے۔ جیسے مصر کے زاغلول پادشاہ وغیرہ انہیں کے شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے لکھا کم اور کہا بہت اور اس طریقے سے ان تمام لوگوں کو جنہیں ان کا قرب حاصل ہوا، چھوٹے چھوٹے جمال الدین بنا دیا۔ انہوں نے کبھی نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا پھر بھی ہمارے زمانے کے کسی شخص نے روح اسلامی میں اس قدر تڑپ پیدا نہیں کی جس قدر کہ انہوں نے کی تھی۔ ان کی روح اب بھی اسلام میں سرگرم عمل ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی انتہا کہاں ہوگی''۔(۱۵)

علامہ اقبال سید جمال الدین کا ذکر کرتے ہوئے انگریزی خطبات میں لکھتے ہیں:

''ہمارا فرض ہے ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں۔ یہ غالباً شاہ ولی اللہ دہلوی تھے جنہوں نے سب سے پہلے ایک نئی روح کی بیداری محسوس کی، لیکن اس عظیم الشان فریضے کی حقیقی اہمیت اور وسعت کا پورا پورا اندازہ تھا تو جمال الدین افغانی کو جو اسلام کی حیات ملی اور حیات ذہنی کی تاریخ میں بڑی گہری بصیرت کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے انسانوں اور ان کی عادات و خصائل کا خوب خوب تجربہ رکھتے تھے۔ ان کا مطمع نظر بڑا وسیع تھا۔ اس لیے یہ کوئی مشکل بات نہیں تھی کہ ان کی ذات گرامی ماضی اور مستقبل کے درمیان ایک جیتا جاگتا رشتہ بن جاتی۔ ان کی ان تھک کوشش اگر صرف اسی امر پر مرکوز رہتیں کہ اسلام نے نوع انسانی کو جس طرح کے عمل اور ایمان کی تلقین کی ہے اس کی نوعیت کیا ہے تو آج ہم مسلمان

اپنے پاؤں پر کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ کھڑے ہوتے''۔(۱۶)

علامہ اقبال نے جمال الدین افغانی کا ذکر''جاوید نامہ'' میں بھی کیا ہے۔ جہاں جمال الدین امام ہیں اور سعید حلیم پاشا مقتدی۔ یہاں افغانی ''سورۃ النجم'' کی تلاوت فرما رہے ہیں۔ ان کی تلاوت میں ایسا اثر ہے کہ ملائکہ اور انبیاء پر بھی حالت وجد طاری ہو جاتی ہے اور اس قراۃ سے غیب آشکارا ہو جاتے ہیں۔ وطنیت کے مقاصد بیان کرتے ہوئے جمال الدین ساری دنیا کو مسلمان قوم کا وطن قرار دیتے ہیں۔ ''جاوید نامے'' میں ''فلک عطارد'' پر زیارت ارواح جمال الدین افغانی وسعید حلیم پاشا کا ذکر یوں ملتا ہے۔

رفتم و دیدم دو مرد اندر قیام — مقتدی تاتار و افغانی امام
پیر رومی ہر زمان اندر حضور — طلعتش برتافت از ذوق سرود
گفت مشرق زیں روکس بہتر نزاد — ناخن نشان عقدہ ہائے ما کشاد
سید السادات مولانا جمال — زندہ از گفتار او سنگ و سفال
ترک سالار آں حلیم درد مند — فکر او مثل مقام او بلند

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

قرأت آں پیر مردے سخت کوش — سورۃ النجم و آں دشت خموش
قرأت کنز دے خلیل آید بوجد — روح پاک جبرئیل آید بوجد
دل از و در سینہ گردد نا صبور — شور الا اللہ خیزد از قبور
اضطراب شعلہ بخشد دود را — سوز و مستی می دہد داؤد را

آشکارا ہر غیاب از قرأتش
بے حجاب ام الکتاب از قرآتش

من ز جابر خاستم بعد از نماز   دست او بو سیدم از راہ نیاز
گفت رومی ذرہ گردوں نورد!   در دل او یک جہاں سوز درد
چشم جزبر خویشتن نکشادۂ   دل بکس نا دادۂ آزادۂ

تُند سیر اندر فراخائے وجود
من زشوخی گویم اورا زندہ رود[۱۷]

علامہ نے اس نظم میں ایک تصوراتی اسلامی مملکت کا خاکہ پیش کردیا ہے اور اس کے لیے افغانی کو ذریعہ اظہار بنا کران کی عظمت بیان کی ہے۔ یہاں کارل مارکس کے فلسفے پر یوں تنقید کی گئی ہے:

صاحب سرمایہ از نسل خلیل   یعنی آں پیغمبر بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر است   قلب اومومن ودماغ کافر است[۱۸]

❀❀❀

علامہ اقبال اور امام غزالی

محمد نام حجۃ الاسلام لقب اور غزالی عرف، آپ کی ولادت کے بارے میں مولانا شبلی لکھتے ہیں:

خراسان کے اضلاع میں ایک ضلع کا نام طوس ہے۔ اس میں دو شہر ہیں، طاہران اور توقان۔ امام صاحب ۴۵۰ھ میں طاہران میں پیدا ہوئے۔[1] امام صاحب نے فقہ کی ابتدائی کتابیں احمد بن محمد رازکانی سے پڑھیں، یہ بزرگ امام صاحب کے شہر ہی میں مقیم تھے اور یہیں درس دیتے تھے۔ اس کے بعد جرجان کا قصد کیا اور امام نصر اسماعیلی کی خدمت میں تحصیل شروع کی۔[2] پھر امام صاحب نے نیشاپور میں تعلیم حاصل کرنے کا قصد کیا اور بالخصوص امیر الحرمین سے تعلیم کا یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر ۴۷۸ھ تک جب امام الحرمین کا انتقال ہوا انہیں کے ساتھ مقیم رہے۔ الغزالی میں شروع سے ہی ایک متشککانہ رجحان کا اظہار ہوتا ہے۔ صوفیاء ماحول میں رہنے سہنے کے اور صوفیانہ ریاضتوں میں حصہ لینے کے باوجود (شروع میں) ان پر تصوف کا کوئی اثر نہ ہوا۔ ان کا رجحان فقہی باریکیوں کے ساتھ تھا۔ جس کا آغاز اس وقت ہوا جب ان کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد امام صاحب نیشاپور سے سلجوتی وزیر نظام الملک کے دربار میں پہنچے اور ۴۸۴ھ میں آپ کا تقرر مدرسہ نظامیہ بغداد میں بحیثیت معلم ہوا۔ استاد امام الحرمین نے غزالی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ غزالی علم کا بحر ذخار ہیں۔(۳)

قیام بغداد کے دوران وہ پورے متشکک اور مرتاب بن چکے تھے اور تشکک کا تعلق صرف مذہب ہی سے نہ تھا بلکہ کسی قطعی علم کے امکان سے بھی۔ جہاں تک فلسفہ کا تعلق ہے الغزالی کبھی اس تشکک پر غالب نہ آ سکے۔ بغداد میں انہوں نے فقہ پر درس دیا اور اس علم میں بعض کتابیں بھی تصنیف کیں۔ وہ تعلیموں (باطنیہ، امامیہ، اسماعیلیہ) کے خلاف چند ایک کتب مناظرہ کے مصنف بھی ہیں۔ جنہوں نے ۴۸۵ھ میں نظام الملک اور ملک شاہ کو قتل کر ڈالا۔ ۴۸۲ھ سے ۴۸۷ھ تک وہ اپنے زمانے کے مختلف مذاہب فکر خصوصاً فلسفے کا بڑی محنت سے مطالعہ کرتے رہے اور انجام کار پورے انہاک سے تصوف کی طرف مائل ہو گئے۔ عقل وفکر نے ان کی کوئی رہنمائی نہ کی تھی لہٰذا (انہوں نے خیال کیا) کیوں نہ واردات مذہب کا رخ کیا جائے۔ چنانچہ وہ پھر توحید، رسالت اور یوم حساب کو ماننے لگ گئے یا جیسا کہ خود ان کا کہنا ہے کہ خدا نے حقائق میں ان کا ایمان از سر نو تعمیر کر دیا تھا۔ قیامت کا ہولناک خوف ان کے دل پر چھا گیا۔ ماہ رجب سے ذوالقعدہ ۴۸۸ھ تک دہشت نے ان کے اندر جو انقلاب پیدا کر دیا تھا اس کی وجہ سے انہیں ایک درد اور کرب کی جس

حالت سے گزرنا پڑا اس سے ان کی ذہنی اور جسمانی صحت جواب دے گئی۔ بالآخر ذوالقعدہ میں وہ بلند منصب اور دینوی خواہشات کو خیر باد کہہ کر ایک جہاں کشت درویش کی حیثیت میں بغداد سے چل کھڑے ہوئے۔ اب ان کی زندگی زہد وتشت اور غور وفکر کے لیے ہوگی تا کہ ان کی روح کو سکون اور ذہن کو یقین حاصل ہو اور وہ اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔ (۴)

بغداد چھوڑنے کے بعد امام غزالی شام آئے، تزکیۂ نفس، اخلاق کی درستی اور ذکر اللہ کے لیے اپنے قلب کو مصفا بنانے میں مشغول رہے۔ پھر جامع مسجد دمشق میں معتکف رہے۔ اس کے بعد بیت المقدس آئے۔ یہاں بھی عبارتوں اور ریاضتوں میں مشغول رہے اس کے بعد حجاز آئے اور کئی سال تک انہوں نے خلوص وعزت میں گزارے۔ لیکن عالم اسلامی کے ان بگڑے ہوئے انسانوں کی اصلاح وقت کا اہم تقاضا ہے اس احساس نے ان کو صحیح فرض یاد لایا یا پھر نئے عزم، پاک ارادوں اور نئی لگن کے ساتھ خلوت سے انجمن میں آئے۔ (۵)

امام غزالی نے ۴۹۹ھ میں نیشا پور کے مدرسہ نظامیہ میں تدریس کا کام شروع کیا۔ فخر الملک نے امام صاحب کو اس تدریس کے کام کے لیے تیار کیا۔ فخر الملک محرم ۵۰۰ھ میں ایک باطنی کے ہاتھ شہید ہوا اور غالباً اس کی وفات کے تھوڑے ہی دن بعد امام صاحب نے عہدہ تدریس سے کنارہ کشی کر کے طوس میں خانہ نشینی اختیار کی۔ گھر کے پاس ہی ایک

مدرسہ اور خانقاہ کی بنیاد ڈالی، جہاں مرتے دم تک ظاہری اور باطنی دونوں علموں کی تلقین کرتے رہے۔(۶)

امام غزالی کے انتقال کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:

امام صاحب نے ۱۴ر جمادی الثانی ۵۰۵ھ میں بمقام طاہران انتقال کیا اور وہیں مدفون ہوئے۔

ابن جوزی نے ان کے مرنے کا قصہ ان کے بھائی احمد غزالی کی روایت سے حسب ذیل لکھا ہے:

''پیر کے دن امام صاحب صبح کے وقت بستر خواب سے اٹھے، وضو کر کے نماز پڑھی۔ پھر کفن منگوایا اور آنکھوں سے لگا کر کہا'' آقا کا حکم سر آنکھوں پر''۔ یہ کہہ کر پاؤں پھیلا دیئے کے لوگوں نے دیکھا تو دم نہ تھا۔

امام صاحب کے مرنے کا تمام اسلامی دنیا کو صدمہ ہوا۔(۸)

تصانیف کے لحاظ سے امام صاحب کی حالت نہایت حیرت انگیز ہے۔انہوں نے کل ۵۴، ۵۵ برس کی عمر پائی۔تقریباً ۲۰ برس کی عمر سے تصنیف کا مشغلہ شروع ہوا۔ دس گیارہ برس صحرا نوادری اور بادپیائی میں گزرے۔درس وتدریس کا شغل ہمیشہ قائم رہا اور کسی زمانے میں ان کے شاگردوں کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں رہی۔فقر وتصوف کے مشغلے جدا، اور دور سے جو فتاوے آتے تھے ان کا جواب لکھنا الگ بایں ہمہ سینکڑوں کتابیں تصنیف کیں۔جن میں بعض کئی کئی جلدوں میں ہیں اور گونا گوں مضامین سے پر ہیں اور جو تصنیف ہے اپنے باب میں بے نظیر ہے سچ ہے:

ایں سعادت بزور بازو نیست (۹)

امام غزالی کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں:

''امام غزالی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ وہ سب سے پہلے شخص ہیں جنہوں نے یونانی فلسفے کے مفروضات پر جرح کرنے اور اس پر عملی تنقید کرنے کی جرأت کی۔ فلسفۂ یونانی کے روج نے اعتقاد کی بنیادیں بنادی تھیں اور اس کی اشاعت سے ملت کی ذہنی زندگی میں جو انتشار پیدا ہو چکا تھا انہوں نے فلسفے کی پیدا کردہ ایک ایک الجھن کو اسلامی نقطہ نظر سے سلجھایا۔ انہوں نے اس حقیقت کو سمجھایا کہ وہ مادی ترقی جو انسان کو معبود حقیقی سے دور لے جائے ترقی نہیں زوال ہے۔ ان کی دو کتابیں مقاصد الفلاسفہ اور تہافتہ الفلاسفہ، ان کے اسی نقطہ کی آئینہ دار ہیں۔ ان کا دوسرا اصلاحی کارنامہ جس نے عالم اسلامی میں ان کے نام کو روشن کر دیا اور جس کا شمار اسلام کی اعلیٰ ترین تصنیفات میں ہوتا ہے وہ ان کی معرکتہ آلاء کتاب احیاء العلوم ہے۔ انہوں نے یہ اپنی عظیم تصنیف بارہویں صدی عیسوی کے بالکل ابتداء میں مکمل کر لی۔ عبد الغافر فارسی جو امام غزالی کے ہمعصر اور امام الحرمین کے شاگرد ہیں، کہتے ہیں کہ احیاء العلوم کے مثل کوئی کتاب اس سے پہلے تصنیف نہیں ہوئی۔ امام غزالی نے یہ کتاب خاص حالات و کیفیات اور خاص جذبے کے ساتھ لکھی۔ جو ان کے قلبی تاثرات، علمی تجربات، اصلاحی خیالات اور وجدانی کیفیات کا آئینہ ہے''۔(۱۰)

مولانا شبلی احیاء العلوم کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس کے پڑھنے سے دل پر عجیب اثر ہوتا ہے۔ ہر فقرہ نشتر کی طرح

دل میں چبھ جاتا ہے۔ یہ بات جادو کی طرح تاثیر کرتی ہے ہر لفظ پر وجد کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ یہ کتاب جس زمانے میں لکھی گئی امام صاحب تاثیر کے نشے میں سرشار تھے۔ بغداد میں ان کو تحقیق حق کا شوق پیدا ہوا۔تمام مذاہب کو چھانا، کسی سے تسلی نہیں ہوئی۔آخر تصوف کی طرف رخ کیا لیکن وہ قال کی چیز نہ تھی بلکہ سرتاپا چال کا کام تھا۔اوراس کا پہلا زینہ اصلاح باطن اور تزکیہ نفس تھا...........آخر سب چھوڑ چھاڑ کر ایک کمل پہن کر بغداد سے نکلے اور دشت پیمائی شروع کی۔ سخت مجاہدات اور ریاضات کے بعد بزم راز تک رسائی پائی۔ یہاں پہنچ کر ممکن تھا کہ اپنی حالات میں مست ہو کر تمام عالم سے بے خبر ہو جاتے لیکن ....افادہ عام پر نظری پڑی تو آوے کا آو بگڑا ہوا ہے۔امیر وغریب، عام وخاص، عالم وجاہل، زندہ وزاہد سب کے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں اور ہوتے جاتے ہیں۔علماء جو دلیل راہ بن سکتے تھے طلب جاہ میں مصروف ہیں۔ یہ دیکھ کر ضبط نہ کر سکے اوراسی حالت میں یہ کتاب لکھی۔ دیباچہ میں خود لکھتے ہیں ’’میں نے دیکھا کہ مرض نے تمام عالم کو چھالیا ہےاور سعادت اخروی کی راہیں بند ہو گئی ہیں۔علماء جو دلیل راہ تھے زمانہ ان سے خالی ہوتا جاتا ہے جو رہ گئے وہ نام کے عالم ہیں۔جن کو ذاتی اغراض نے اپنا گرویدہ بنالیا ہےاور جنہوں نے تمام عالم کو یقین دلایا ہے کہ علم صرف تین چیزوں کا نام ہے مناظرہ (جو فخر اورغور کا ذریعہ ہے) وعظ و پند (جس میں عوام کی دلفریبی کے لیے رنگین اور مسجع فقرے استعمال کئے جاتے ہیں) فتوئ دنیا جو مقدمات کے فیصل کرنے کا ذریعہ ہے۔باقی آخرت کا علم تو وہ تمام عالم سے ناپید ہو گیا ہےاور لوگ اس کو بھول بھلا چکے، یہ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور مہر سکوت ٹوٹ گئی‘‘۔(۱۱)

احیاء العلوم کے علاوہ نصیحت الملوک ایک اہم تصنیف ہے جس میں عدل وانصاف اور امور سلطنت کے احکام کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ کیمائے سعادت ایک ایسی کتاب ہے جس نے احیاء العلوم کے بعد غیر معمولی شہرت ومقبولیت حاصل کی ہے۔ یہ کتاب اخلاقی اور دینی مضامین پر مشتمل ہے۔

امام غزالی کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں:

''.......... امام غزالی کی مثبت خوبیوں کا مطالعہ کریں تو ایک بڑی دل کش، لائق صد احترام شخصیت نظر آتی ہے اور ان کی محبت دینی جرات، قابلیت، بصیرت اور انسان دوستی پر بے ساختہ دل سے آفرین نکلتی ہے جن کی بدولت مسلمانوں کی ذہنی اور روحانی زندگی میں اس قدر وسعت، گہرائی، ٹھہراؤ اور توازن کا اضافہ ہو.......... علامہ شبلی نے امام صاحب کی مشہور تصانیف کو مضامین کے لحاظ سے ترتیب دیا ہے یوں تو انہوں نے زمین علم کی کتنی کھیتوں مثلاً فقہ، اصول فقہ، کلام، منطق، فلسفہ وغیرہ کو سیراب کیا۔ لیکن ان کی محنتوں کا اصل میدان تصوف و اخلاق تھا۔ جس میں انہوں نے احیاء العلوم، کیمیائے سعادت، اخلاق الابرار، نصیحت الملوک، مشکوۃ الانوار جیسے شاہکار چھوڑے ہیں''۔(۱۲)

فقہ اور اصول فقہ میں امام غزالی کی متعدد اعلیٰ درجے کی تصانیف ہیں۔ امام صاحب شافعی تھے اور شبلی لکھتے ہیں کہ فقہ میں ان کی چاروں تصانیف یعنی بسیط، وسیط، وجیز اور وسائل فقہ شافعی کے چار ارکان ہیں۔[۱۳] علم الکلام میں ان کا مقام اس سے بھی بلند ہے اور غالباً ان کے

متکلمانہ کارنامے تھے جن کی وجہ سے ان کی زندگی ہی مین ان کو حجۃ الاسلام کا لقب دیا گیا جو آج تک قائم ہے۔شبلی نے ان کارناموں کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔اس سلسلے میں ان کی سب سے مشہور کتاب، تہافت الفلاسفہ یعنی فلاسفہ کی گمراہی ہے جس میں ان فلاسفروں کی تردید کی ہے جو عقل و ذہن اور حکمت و فلسفہ کے زعم میں مذہب کو باطل اور غیر ضروری سمجھتے ہیں۔اس سلسلے میں امام صاحب کے مقصد تالیف کا جو خلاصہ شبلی نے تہافتہ کے مقدم سے الغزالی میں درج کیا ہے وہ تمام کا تمام دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے[14] مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''ہمارے زمانے میں ایسے لوگ پیدا ہو گئے ہیں جن کو یہ زعم ہے کہ ان کا دل و دماغ عام آدمیوں سے ممتاز ہے۔ یہ لوگ مذہبی احکام اور قیود کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ حکمائے قدیم مثلاً افلاطون، ارسطو وغیرہ مذہب کو لغو سمجھتے تھے اور چونکہ یہ حکماء تمام علوم و فنون کے بانی اور موجد تھے اور عقل و ذہن میں ان کا کوئی ہمسر نہیں ہوا۔اس لیے ان کا انکار مذہب اس بات کی دلیل بین ہے کہ مذہب حقیقت میں لغو اور باطل ہے اور اسی کے اصول وقواعد فرضی اور مصنوعی ہیں جو صرف ظاہر میں خوش نما اور دلفریب ہیں۔
>
> اس بنا پر میں نے ارادہ کیا کہ ان حکماء نے الہیات پر جو کچھ لکھا ہے اس کی غلطیاں دکھاؤں اور ثابت کروں کہ ان کے مسائل اور اصول بازیچۂ اطفال ہیں''۔(۱۵)

تہافتہ الفلاسفہ کے بارے میں علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ امام صاحب کی یہ محنت چنداں سود مند نہیں ہوتی[16] لیکن انہیں بھی اعتراف ہے کہ اس

کتاب نے فلسفہ یونان کی عظمت دلوں سے کم کردی اور لوگ اس کے عیب و ہنر کی جانچ کی طرف متوجہ ہوئے۔ [۱۷] حکمت اور فلسفہ میں جو باتیں اسلام کے خلاف نہ تھیں اور مفید تھیں انہیں امام صاحب نے اختیار کرلیا۔ انہوں نے فلاسفہ کے رو میں اپنی شہرۂ آفاق کتاب تہافتہ الفلاسفہ لکھی لیکن انہوں نے خود فلسفیوں کی کئی قابل قبول چیزیں اخذ کرلیں [۱۸]

چنانچہ ایک جگہ امام صاحب فرماتے ہیں:

''اچھا فرض کرلو جو باتیں میں نے لکھیں وہ حکماء کی کتابوں کے سوا اور کہیں نہیں پائی جاتیں لیکن اگر وہ باتیں معقول ہیں اور دلائل سے ثابت ہیں اور قرآن اور حدیث کے خلاف نہیں ہیں تو پھر ان کے چھوڑے اور ان سے انکار کرنے کی کیا وجہ ہے اگر ہم ایسا کرنے پر آئیں اور ان تمام سچی باتوں کو رد کردیا کریں جو پہلے کسی بدعقیدہ کے خیال میں گزریں تو ہم کو بہت ہی سچی اور حق باتوں کو چھوڑ دینا پڑے گا''۔(۱۹)

ایک جگہ عقل ونقل کی تطبیق کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جو شخص عقل کو باطل معزول کرکے محض تقلید کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے وہ جاہل ہے اور جو شخص صرف عقل پر بھروسہ کرکے قرآن وحدیث سے بے پروا بنتا ہے وہ مغرور ہے خبردار! تم ان میں سے ایک فریق نہ بن جانا۔ تم کو دونوں کا جامع ہونا چاہیے کیونکہ علوم عقلیہ غذا کی طرح ہیں اور علوم شرعیہ دوا کی طرح''۔(۲۰)

امام صاحب پر کئے گئے اعتراضات اور نکتہ چینیوں کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''اس بات کا بھی اعتراف کرنا ضروری ہے کہ امام صاحب کی بعض تصانیف میں واقعی بعض باتیں مواخذہ کے قابل ہیں۔ مثلاً احیاء العلوم میں احادیث کے نقل کرنے میں نہایت بے احتیاطی کی ہے سینکڑوں ہزاروں حدیثیں موضوع اور ضعیف نقل کردی ہیں جس کا کتب احادیث میں کہیں پتہ نہیں، احادیث پر موقوف نہیں۔ بزرگان سلف کے متعلق جو واقعات لکھے ہیں اکثر دور از کار اور بعید از عقل ہیں اور بجز عوام کے کوئی شخص ان پر یقین نہیں کرسکتا۔ اسی کے ساتھ زہدہ اور مجاہدہ کے بیان میں ایسی باتیں لکھ دی ہیں جو اعتدال سے متجاوز ہیں، علامہ ابن القیم نے نہایت سختی سے اس پر دارو گیر کی ہے۔ چنانچہ علامہ مرتضٰی نے احیاء العلوم کی شرح میں امام صاحب کے اقوال اور ابن القیم کا رد تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ علامہ موصوف نے ابن القیم کے ہر اعتراض کا جواب بھی دیا ہے۔ لیکن انصاف یہ ہے کہ بعض اعتراضات لاجواب ہیں۔ بہرحال امام صاحب امام تھے پیغمبر کے سوا کسی شخص کو عظمت کا رتبہ حاصل نہیں ہوسکتا''۔(۲۱)

علامہ اقبال نے امام غزالی کا ذکر اپنی شاعری اور نثر دونوں میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اس عظیم المرتبت شخصیت کی سحر گاہی کو وہ ایک نمونہ و مثال بنا کر اس طرح پیش کرتے ہیں:

عطار ہو رومی ہو رازی ہو غزالی
کچھ ہاتھ نہیں آتا ہے بے آہ سحر گاہی [۲۲]

''بانگ درا'' کی نظم جواب شکوہ میں غزالی کا نام یوں عقیدت سے پیش کیا ہے:

واعظ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی　　برق طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی　　فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی[۲۳]

ارمغان حجاز کی غزل نمبر ۱۴ میں غزالی کا ذکر یوں ملتا ہے

دگر بمدرسہ ہائے حرم نمی بینم
دل جنید و نگاہ غزالی و رازی[۲۴]

علامہ اقبال نے امام غزالی کا ذکر اپنے انگریزی خطبات میں بھی کیا ہے:

''غزالی کے ذاتی حالات کا تقاضا تھا کہ امام موصوف نے مذہب کی بنا فلسفیانہ تشکک پر رکھی حالانکہ یہ مذہب کی کوئی محکم اساس ہے نہ تعلیمات قرآنی کے مطابق......... بایں ہمہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غزالی کی دعوت میں ایک پیغمبرانہ شان پائی جاتی تھی۔...... یہ اور بات ہے کہ امام موصوف اپنے تشکک میں کسی قدر آگے بڑھ گئے تھے۔ غزالی نے بھی اس بلند مگر بے روح عقلیت کا زور ہمیشہ کے لیے توڑ دیا جس کا رجحان ٹھیک اسی جانب تھا جس طرح کانٹ سے پہلے جرمنی میں لیکن کانٹ اور غزالی کے درمیان ایک ہم فرق ہے اور وہ یہ کہ کانٹ نے اپنے اصول وکلیات کے ساتھ دیتے ہوئے یہ تسلیم نہیں کیا کہ ذات الٰہی کا ادارک ممکن ہے۔ برعکس اس کے غزالی نے فکر تحلیلی سے مایوس ہوکر صوفیانہ واردات کا رخ کیا اور یہ رائے قائم کی کہ ان کے اندر مذہب کا ایک مستقل سرمایہ موجود ہے لیکن جس کا مطلب گویا یہ تھا کہ مذہب کو سائنس اور مابعد الطبیعات سے الگ رکھتے ہوئے بھی (خواہ ان سے مذہب کی تائید کا پہلو نکلتا ہو یا تردید کا) اپنا آزاد اور مستقل وجود برقرار رکھنے کا حق حاصل ہے''۔(۲۵)

اقبال نے اپنے کلام میں سینا اور فارابی کے ذکر کے ساتھ ساتھ امام غزالی کا ذکر نہایت عقیدت واحترام کے ساتھ کیا ہے اگرچہ سینا اور فارابی کے مقابلے میں کلام اقبال میں غزالی کا ذکر کم ملتا ہے( ) مگر پھر بھی عقیدت میں تینوں کا ذکر ایک ساتھ ملتا ہے۔

علامہ اقبال اور سعید حلیم پاشا

سعید حلیم پاشا ۱۸۶۵ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوئے۔آپ کے والد شہزادہ ابراہیم حلیم پاشا محمد علی پاشا (خدیو مصر) کے ولی عہد تھے مگر اپنی روشن فکری تیز انقلابی سرگرمیوں کے نتیجے میں جلاوطن کردئے گئے اور ان کے بجائے توفیق پاشا خدیو مصر بنے۔(۱)

سعید حلیم پاشا نے ابتدائی تعلیم قسطنطیہ میں حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ قاہرہ اور یورپ گئے۔آپ نے اسلامی اور مغربی علوم وفنون میں کمال حاصل کرلیا۔قدرت نے آپ کو بلند دماغ عطا کیا تھا۔ترکی اور عربی آپ کی مادری زبانیں تھیں۔اس کے علاوہ عربی فارسی اور فرانسیسی پر آپ کو قدرت حاصل تھی۔تقریر اور تحریر میں آپ بے مثال تھے۔آپ کو لوگ کافی پسند کرتے تھے۔

جب توفیق پاشا (خدیو مصر) کے طرزعمل سے لوگ تنگ آگئے تو آپ کو لوگوں نے خدیو مصر بنانا چاہا مگر انگریزوں نے لوگوں کی اس امید کو پورا ہونے نہ دیا اور آپ کو قدم جمانے نہ دیا گیا۔بہر حال آپ ۱۸۸۹ء میں قسطنطنیہ لوٹ آئے۔

عثمانی سلطان عبدالحمید دوم نے سعید حلیم پاشا کو وزارت کی پیشکش

کی۔ چنانچہ آپ نے مختلف قلمدان ہائے وزارت سنبھالے۔۱۹۰۲ء میں انہیں پاشا کا اعزاز دیا گیا۔ ان کی استعداد اور خدمات کا مخالف بھی اعتراف کرتے تھے اور اپنے اصلاحی اور سیاسی عزائم میں رکاوٹ کے پیش نظر ۱۹۰۵ء میں انہوں نے وزارت سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ حزب اصلاحی کے رکن تھے۔ (جسے انجمن اتحاد و ترقی بھی کہتے ہیں) ان کا حزب ہمہ گیر ترقی اور انقلاب کا داعی تھا مگر اس انقلاب و ترقی کے نشے سے سرشار ہو کر دین و مذہب کو خیر باد کہنے کا حامی نہ تھا۔ سعید حلیم پاشا نے اس حزب کے نوجوانوں کی بطراز احسن تربیت کی تھی مگر بعض جذباتی ارکان سے اختلاف کر کے ۱۹۰۵ء میں مصر چلے گئے[2]۔ ۱۹۰۸ء میں آپ کو پھر طلب کر کے واپس لایا گیا۔ ۱۹۱۱ء آپ کونسل آف اسٹیٹ کے صدر مقرر کیے گئے۔ ۱۹۱۲ء میں انجمن اتحاد ترقی کے صدر مقرر کیے گئے اور وزارت خارجہ کا عہدہ پیش کیا گیا۔ ۱۹۱۲ء میں مارشل محمود شوکت پاشا کی شہادت کے بعد وہ ترکی کے وزیر اعظم مقرر ہوئے۔

۱۹۱۴ء میں جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے مجبور ہو کر انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کیا۔ ۱۹۱۹ء میں جب انگریز قسطنطنیہ پر قابض ہوئے تو انہوں نے پاشا اور ان کے رفقاء پر مقدمہ چلایا اور ان کو مالٹا میں نظر بند کر دیا۔ ایک سال بعد رہا ہونے پر وہ روم (اطالیہ) میں سکونت پذیر ہو گئے۔ یہاں انہوں نے ۱۹۲۱ء کے آخری مہینوں میں فرانسیسی زبان میں ایک مقالہ لکھا جس کا عنوان ''مسلمان معاشرے کی اصلاح''

تھا۔ ۶ ر دسمبر کو ایک بد طینت ارمنی نوجوان نے انہیں گولی کا نشانہ بنایا[۳]
اور اس طرح اس شہزادے کا انتقال ہو گیا۔

سعید حلیم پاشا ایک بلند پایہ دیندار تھے اور متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ جب ۱۹۱۷ء میں آپ کی صحت خراب ہوئی اور آپ نے وزارت اعظمیٰ کے عہدہ سے استعفیٰ دیا تب آپ قسطنطنیہ میں خانہ نشین ہو گئے اور صحت کی بحالی پر آپ نے ترکی زبان میں ایک کتاب ''اسلام الشمق'' تصنیف کی۔ اسلام اور عصر حاضر کے تقاضوں پر لکھی گئی اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اسلام ایک بہترین ضابطۂ حیات ہے۔ سعید حلیم پاشا کی یہ تصانیف کافی اہمیت کی حامل ہے۔ ان کی مذکورہ کتاب اور مقالہ اس قابل ہیں کہ انہیں اسلامی مفکرین کی صف اول میں جگہ دی جائے۔ (۴)

علامہ اقبال نے سعید حلیم پاشا کی عظیم المرتبت شخصیت کا ذکر اپنے کلام میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ ترکی جہاں مختلف اصحاف فکر کی نظروں میں خاص اہمیت کا مرکز رہا ہے وہاں علامہ اقبال کی نگاہ بھی اس خاص حصے پر رہی اور اس سے بڑھ کر ''جس ترک رہنما کی شخصیت اور دینی افکار نے علامہ مرحوم کی فکر و نظر کو خاص طور پر متاثر کیا۔ بلکہ جسے وہ سید جمال الدین افغانی کے بعد عصر حاضر میں سرزمین مشرق کا سب سے بڑا نابغۂ تسلیم کرتے ہیں۔ وہ شہزادہ سعید حلیم پاشا (م ۶ ر دسمبر ۱۹۲۱ء) ہیں۔ علامہ نے اپنی دو بلند پایہ تصانیف ''اسلامی مذہبی فکر کی تشکیل نو'' اور ''جاوید نامہ'' میں اس ترک راہبر کی

خدمات وافکار کو سراہا ہے۔(۵)

تشکیل جدید الہیات اسلامیہ کے چھٹے خطبے میں علامہ لکھتے ہیں:

''ابھی زیادہ نہیں گزرے جب ترکی فکر نے دو راستے اختیار کر رکھے تھے ایک وہ جس کی نمائندگی حزب وطنی نے کی تھی۔ دوسرا حزب اصلاحی کا راستہ۔ حزب وطنی کو دلچسپی تھی تو ریاست سے مذہب سے انہیں کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ریاست سے الگ مذہب کا کوئی وظیفہ نہیں...... برعکس اس کے حزب اصلاحی نے جس کی زمام قیادت سعید حلیم پاشا کے ہاتھ میں تھی۔ اس بنیادی حقیقت پر زور دیا کہ اسلام میں عینیت اور اثباتیت دونوں کا امتزاج نہایت خوبی سے ہو چکا ہے۔ یوں بھی اس نے حریت، مساوات اور استحکامی انسانیت کی ابدی صداقتوں کو چونکہ ایک وحدت میں سمو دیا لہٰذا اس کا کوئی وطن نہیں پھر جیسے نہ تو کوئی انگریزی ریاضیات ہے نہ فرانسیسی کیمیا، وزیر اعظم ترکی کے نزدیک نہ تو کسی ترکی اسلام کا وجود ہے نہ عربی۔ ایرانی اور ہندی اسلام کا۔ چنانچہ اس بڑے ہی بالبصر اہل قلم کا خیال ہے کہ تہذیب جدید کو جس کی بناء وطنی انانیت پر ہے انسان کے دور وحشت اور بربریت ہی کی ایک شکل تصور کرنا چاہیے۔ سعید حلیم کو افسوس ہے کہ اسلام کے اخلاقی اور اجتماعی مقاصد بھی بعض ایسے توہمات کے زیر اثر جوامم اسلامیہ کے اندر زمانہ قبل اسلام سے کام کر رہے تھے غیر اسلامی شکل اختیار کرتے چلے گئے۔ ان کے مقاصد بھی اسلامی کم ہیں اور عجمی عربی یا ترکی زیادہ۔ نہ توحید کا صاف ستھرا اور پاکیزہ چہرہ کفر و شرک کے غبار سے محفوظ رہ سکا۔ نہ قیود مقامی کی روز افزوں پابندیوں نے اسلام کے اخلاقی مقاصد کی غیر شخصی اور عالمگیر نوعیت کو قائم اور برقرار رہنے دیا''۔(٦)

سعید حلیم پاشا سے بالخصوص قومیت اور تہذیب و معاشرت میں اس کے خیالات سے اقبال بہت متاثر تھے۔ ترکی وطن پرستوں کے لادینی نظریات کی تردید کرتے ہوئے اس ضمن میں سعید حلیم پاشا کے خیالات کی تائید اور تعریف کی ہے خصوصاً قومیت کے تعلق سے ان کے خیالات کہ اسلام کا کوئی وطن نہیں اور نہ کسی ترک اسلام کا کوئی وجود ہے نہ عربی، ایرانی، ہندی اسلام کا اقبال کے خیال میں وہ نہایت ہی بالبصیرت اہل قلم تھا اور اس کا طرز فکر سراسر اسلامی تھا۔ (۷)

علامہ اقبال نے سعید حلیم پاشا کا ذکر ''جاوید نامہ'' میں نہایت ہی عقیدے کے ساتھ کیا ہے۔ جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کا ذکر جاوید نامہ کے ''فلک عطارد'' میں موجود ہے۔ یہاں اس کی تعلیمات کا معنی خیز ذکر موجود ہے۔ ''جاوید نامہ'' کا یہ حصہ اقبالیات کے اہم ترین مباحث پر مشتمل ہے۔ قرآن مجید کی ابدی تعلیمات خصوصاً سیاسی تعلیمات جس قدر جامع و مانی طور پر ''فلک عطارد'' میں سید جمال الدین افغانی اور سعید حلیم پاشا کی زبانی مذکور ہیں اقبال کی کسی دوسری کتاب میں یکجا نظر نہیں آتیں۔ (۸)

جاوید نامہ میں فلک عطارد پر پہنچتے ہی علامہ اقبال رومی سے کہتے ہیں:

من بہ رومی گفتم ایں صحرا خوش است   در کہستان شورش دریا خوش است
من نیابم از حیات ایں جانشاں   از کجامی آید آواز اذاں

گفت رومی ایں مقام اولیاست　　آشنا ایں خاکداں با خاک ماست
بوالبشر چوں رفت از فردوس بست　　یک دو روزے اندریں عالم نشت
ایں فضا ہا سوز آہش دیدہ است　　نالہ ہائے صبحگاہش دیدہ است
زائران ایں مقام ارجمند　　پاک مرداں از مقامات بلند
پاک مرداں چو فضیل و بو سعید　　عارفاں مثل جنید و بایزید
خیز تا مارا نماز آید بدست
یک دو دم سوز و گداز آید بدست[9]

یہاں سے آگے نکل کر علامہ دو آدمیوں کو دیکھتے ہیں ایک جمال الدین افغانی اور دوسرا سعید حلیم پاشا۔ چنانچہ رومی علامہ سے ان ہی دو آدمیوں کے ساتھ نماز ادا کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔

رفتم و دیدم دو مرد اندر قیام　　مقتدی تا تار و افغانی امام
پیر رومی ہر زماں اندر حضور　　طلعش برتافت از ذوق و سرور
گفت مشرق زیں دو کس بہتر نزاد　　ناخن شان عقد ہائے ما کشاد
سید السادات مولانا جمال　　زندہ از گفتار او سنگ سفال
ترک سالار آں حلیم و دردمند　　فکر او مثل مقام او بلند
با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است[10]

یہاں مسئلہ وطنیت پر بحث ہوتی ہے اور مسئلہ اشتراکیت پر بھی ہوتی ہے۔ جمال الدین اور علامہ کے درمیان یہ گفتگو سعید حلیم پاشا سنتے ہیں۔

سعید حلیم پاشا ''شرق وغرب'' عنوان کے تحت فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو قرآن مجید کی تعلیمات سے فیض یاب ہونا چاہیے اور مغرب کی اندھی تقلید کو چھوڑ کر عشق رسول ﷺ کا جذبہ دلوں میں پیدا کرنا چاہیے اور یہی ان کے لیے صحیح راستہ ہے۔ اگرچہ مغربی علوم سے فائدہ بھی اٹھایا جاسکتا ہے مگر قرآنی تعلیمات ضروری ہیں اور امور سلطنت اور باقی ساری زندگی انہی اصولوں کے تحت بسر کرنی چاہیے تاکہ مسلمانوں کی زندگی بہتر بن سکے۔

غریبان را زیرکی ساز حیات　　شرقیاں را عشق راز کائنات
زیرکی از عشق گردد حق شناس　　کار عشق از زیرکی محکم اساس
عشق چوں با زیرکی ہمبر شود　　نقشبند عالم دیگر شود
زندگی را سوز و ساز از نار تست　　عالم نو آفریدن کار تست
چوں مسلمانان اگر داری جگر　　در ضمیر خویش و در قرآن نگر
صد جہاں تازہ در آیات اوست　　عصر ہا پیچیدہ در انات اوست
بندۂ مومن ز آیات خداست　　ہر جہاں اندر براو چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش
می دہد قرآن جہانے دیگرش[11]

علامہ اقبال سعید حلیم پاشا کی گفتگو سنتے ہیں اور جمال الدین افغانی سے کہتے ہیں کہ کیا وجہ ہے کہ قرآن مجید کے حقائق سے لوگ بے خبر ہیں۔ جمال الدین افغانی محکمات عالم قرآنی کی تفصیل سے آگاہ کرتے ہیں۔ مختلف عنوانات مثلاً خلافت آدم، حکومت الٰہی ارض ملک خداست اور

حکمت خیر کثیر است کے موضوعات کو افغانی فکر انگیز اور مجتہدانہ انداز سے پیش کرتے ہیں۔ علامہ کہتے ہیں ان مسائل پر غور کرنے کے بعد بھی سمجھ نہیں آتا ہے قوم کیوں زوال پذیر ہے۔ یہاں تک کہ ترک کرد وغیرہ باغیرت اقوام بھی بے حس و حرکت ہیں۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے سعید حلیم پاشا کہتے ہیں:

دین حق از کافری رسوا تر است　　زانکہ ملا مومن کافر گر است
شبنم مادر نگاہ مایم است　　از نگاہ ادیم ما شبنم است
زاں سوئے گردون دلش بیگانہ　　نزد او ام الکتاب افسانہ
کم نگاہ و کور ذوق دہر زہ گرد　　ملت از قال و اقوالش فرد فرد
مکتب و ملا و اسرار کتاب　　کور مادر زاد نور آفتاب
دین کافر فکر و تدبیر جہاد
دین ملا فی سبیل اللہ جہاد[12]

مرد حق جاں جہاں چار سوے　　آں بخلوت رفتہ را از من بگوے
اے ز افکار تو مومن را حیات　　از نفسہائے تو ملت را ثبات
حفظ قرآن عظیم آئین تست　　حرف حق را فاش گفتن دین تست
فطرت تو ستیز از مصطفیٰ است
باز گو آخر مقام کجاست
مرد حق از کس نگیرد رنگ بو　　مرد حق از حق پزیرد رنگ بو
ہر زماں اندر تنش جانے دگر　　ہر زماں اورا چو حق شانے دگر

راز ہا با مرد مومن باز گوے　　　شرح رمز کلّ یومٍ باز گوے

جز حرم منزل ندارد کارواں　　　غیر حق در دل ندارد کارواں

من نمی گویم کہ راہش دیگر است

کارواں دیگر نگاہش دیگر است[۱۳]

علامہ اقبال نے سعید حلیم پاشا کی زبانی ان اصولوں کی وضاحت کی ہے کہ مسلمانوں کے زوال کا سبب وہ تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو لوگوں کی صحیح تربیت نہیں کرسکتا ہے کیونکہ وہ مغرب کی تعلیم کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ حالانکہ اسلامی تعلیمات اور قرآنی تعلیمات بے حد ضروری ہیں۔ دوسرے وہ ''ملا'' جو دین واسلام کو صحیح ڈھنگ سے پیش نہیں کرتے ہیں۔ علامہ کے نزدیک مسلمانوں کا مرکز مکہ معظّمہ ہے اور کسی بھی جگہ یہ حق حاصل نہیں۔ ایک ہی مرکز کی طرف رجوع کرنے سے ہی اتحاد قائم ہوسکتا ہے۔

اور یہی واحد مرکز تسلیم کرنا ضروری ہے۔

❁❁❁

علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان

سلطان ٹیپو میسور کے معروف حکمران اور بانی سلطنت حیدر علی کے فرزند تھے۔ آپ ۱۰ر نومبر ۱۷۵۵ء بمطابق ۲۰ ذی الحجہ (۱۱۶۳ھ) بنگلور سے بیس میل شمال دیون ھلی مین پیدا ہوئے۔ اس جگہ کا نام بعد میں ٹیپو سلطان نے یوسف آباد رکھا۔

ٹیپو سلطان کی تعلیم و تربیت پانچویں سال سے شروع ہوئی۔ اسلامی علوم کے علاوہ عربی اور فارسی میں خاصی مہارت حاصل کرلی۔ انگریزی اور فرانسیسی بھی سیکھ لی تھی۔ کنڑی مقامی بولی تھی۔ جس سے سلطان بخوبی واقف تھا۔ اردو رائج ہو رہی تھی۔ فوج کے لیے جو ترانے تجویز ہوئے تھے ان میں فارسی ترانوں کے علاوہ اردو ترانے بھی شامل تھے گویا سلطان اسکے درباری اور سپاہی اردو بھی جانتے تھے۔ ٹیپو سلطان کے استادوں کے نام معلوم نہیں مگر یہ معلوم ہے کہ حیدر علی خان نے علم و ادب کی ہر شاخ اور دانش و ہنر کے ہر شعبے کے استادان کامل و ماہر بیٹے کی تعلیم کے لیے بلا لیے تھے اور ٹیپو سلطان نے بہ عہد صغر سنی ہی تمام علوم میں بہرہ وافی حاصل کرلیا تھا۔ (۱)

شمشیر زنی، تیر افگنی، شہسواری اور تیراکی میں کمال حاصل کرلیا۔

ولکس (Wilks) کے مطابق شہسواری میں سلطان کو خاص برتری حاصل تھی اور اسے اسپ سواری ہی پسند تھی۔......حیدر علی جب فوج کا معائنہ کرتا ٹیپو کو ساتھ رکھتا تاکہ اسے عسکری ضبط و نظم اور فنون حرب خصوصاً مغربی فنون حرب کی تربیت ملتی جائے۔(۲)

ٹیپو سلطان ابتداء ہی سے حیدر علی کے ساتھ مل کر تمام فنون سپہ گری سے مہارت حاصل کرتا رہا۔اس وجہ سے ۱۷۶۶ء میں حیدر علی نے ٹیپو کو فوج کی ایک رجمنٹ کا افسر بنا دیا۔ٹیپو نے کافی مہارت سے بہت سی لڑائیوں میں کامیابی کے جوہر دکھائے۔

حیدر علی کی وفات ذی الحجہ ۱۱۹۶ھ کی آخری تاریخ کو شام کے وقت ۷/دسمبر ۱۷۸۲ء کو ہوئی[۳]۔۲۰/محرم ۱۱۹۷ بمطابق ۲۶/دسمبر ۱۷۸۲ء کو جمعرات کے دن[۴] مسند نشینی کی رسم ادا ہوئی اور ٹیپو سلطان سلطنت کا مالک بنا۔

ٹیپو جس سلطنت کا مالک بنا وہ (شمال میں) دریائے کرشنا جنوب میں ریاست بڑوانکور اور ضلع تناول تک پھیلی ہوئی تھی۔مشرق میں مشرقی گھاٹ اس کی حد تھی اور مغرب میں اس کا دامن سمندر کو بوسہ دے رہا تھا۔یقیناً ایک بڑی اور شاندار سلطنت تھی پھر آبادی زرخیزی اور حسن انتظام کے علاوہ قدرتی دولت کی فراوانی اعتبار سے بھی اس کا پایہ بہت بلند تھا۔نظام اور مرہٹے کھا جانے کے درپے تھے۔انگریز اسے ہندوستان پر اقتدار کامل میں سب سے بڑی بلکہ واحد رکاوٹ سمجھتے تھے۔ٹیپو سلطان

شہزادگی کے زمانے میں ان جواہروں کے ثبوت پے در پے پیش کر چکا تھا اور سترہ سال کی مدت حکومت میں بھی اس کے عزم حوصلہ کی کوئی قوت شکست نہ دے سکی۔ یہاں تک کہ خون شہادت سے ان پر دائمی مہر لگ گئی۔(۵)

سلطان ٹیپو نے سرنگا پٹنم میں مسجد اعلیٰ تعمیر کی۔ یہاں پہلے ایک معمولی بت خانہ تھا۔سلطان نے یہ جگہ خریدی اور ۱۲۰۴ھ کی نماز عید الفطر ۱۴/ جون ۱۷۹۰ء کو اسی مسجد میں ادا کی۔ سنہ ہجری کی جگہ سنہ محمدی جاری کیا۔(۶)

سرنگا پٹنم کی شان اور ٹیپو سلطان کی شخصیت انگریزوں کے لیے ایک خطرہ تھی۔ اس لیے انہوں نے سلطان کو قبضے میں لانے یا انہیں شہید کرنے کی مختلف تدابیر کیں۔ اس لیے انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ یا سلطان کو شہید کیا جائے یا غلام بنایا جائے۔

سلطان کے ساتھیوں میں سید غفار جیسے وفادار شامل تھے اور پورنیا، میر صادق اور قمر الدین خان غداروں میں شامل تھے۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر وہ سلطان کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔

انگریزوں نے ۲۲/اپریل ۱۷۹۹ء کو سرنگا پٹنم پر گولہ باری سے پہلے دوسرا مسودہ صالحیت سلطان کے حوالے کیا۔ جس کی بہت شرطیں تھیں مگر سلطان نے انکار کر دیا۔ آخر پر انگریزوں نے سرنگا پٹنم پر دھاوا بول دیا۔ سلطان ایک بہادر سپاہی کی طرح آخر تک لڑتا رہا۔فوجی افسران غداری کر

چکے تھے اور انگریزوں کا ساتھ دے رہے تھے مگر ٹیپو سلطان آخر تک بہادری اور شجاعت کے جوہر دکھا رہا تھا۔ بہت سے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہاں تک کہ روئے مبارک پر کاری زخم کھا کر شہادت پائی۔ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ موت گولی سے ہوئی جو دائیں کان سے ذرا اوپر لگی تھی۔ میت کو حیدر علی کے پہلو میں اعزاز کے ساتھ دفن کیا گیا۔(۷)

ٹیپو نے اپنے دارالسلطنت کا نام ٹیپو نگر یا ٹیپو ٹین نہ رکھا بلکہ گنج عام رکھا جو عوام میں اب تک گنجام مشہور ہے یہ وہ مقام تھا جہاں ہر ملک، ہر فرقے، ہر قوم اور ہر قسم کے فنکار آ کر بسنے لگے۔ جہاں عالی شان محلات فوجی و دیوانی و عدالتی دفاتر تعمیر کئے گئے تھے۔(۸)

ٹیپو سلطان شہید کی انہی خوبیوں کو سراہتے ہوئے علامہ اقبال نے اس مردمجاہد کا ذکر اپنے کلام اردو اور فارسی میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ علامہ نے سلطان کے کمالات، کردار، فن، سیرت، حوصلہ اور ہمت کی کافی داد دی ہے۔ ''ضرب کلیم'' کی ایک نظم بعنوان ''سلطان ٹیپو کی وصیت میں'' سلطان کے کمالات کا نہایت فنکارانہ عظمت سے بیان کیا ہے۔ یہاں سلطان کے ان اصولوں کو سراہا گیا ہے جن پر وہ عمر بھر کاربند رہے۔ علامہ کو سلطان شہید کے یہ اصول کافی پسند تھے کہ انہوں نے کسی بھی فضول چیز کو حق پر ترجیح نہ دی۔

سلطان نے ساری عمر محنت اور کوشش میں گزاری اور وہ ہمیشہ جدوجہد میں رہے۔ سلطان کا اصلی مقصد ذات باری تعالیٰ سے عشق

ہے۔اس لیے وہ کہتے ہیں:

صبح ازل مجھ سے کہا جبریل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول[9]

علامہ نے سلطان کی حق پسند کا ذکر یوں کیا ہے:

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانہ حق و باطل نہ کر قبول[10]

نظم ''سلطان ٹیپو کی وصیت'' کے علاوہ علامہ اقبال نے ٹیپو سلطان کا ذکر ''جاوید نامہ'' میں کافی احترام سے کیا ہے۔ ''آنسوئے افلاک'' زیر عنوان ''حرت بہ کاخ سلاطین مشرق'' میں سلطان شہید کا ذکر یوں کیا گیا ہے:

آں شہیدان محبت را امام — آبروئے ہند و چین و روم و شام
نامش از خورشید و مہ تابندہ تر — خاک قبرش از من وتو زندہ تر
عشق رازے بود بر صحرا نہاد — تو ندانی جان چہ مشتاقانہ داد
از نگاہ خواجہ بدر و حنین — فقر سلطان وارث جذب حسینؓ

رفت سلطان زین سرائے ہفت روز
نوبت او در دکن باقی ہنوز[11]

علامہ اقبال سے جنت الفردوس میں سلطان شہید ملاقات کرتے ہیں اور اس ملاقات کے دوران سلطان علامہ سے ہندوستان کا حال پوچھتے ہیں۔

باز گو از ہندو از ہندوستان
آنکہ با کاہش نیر زد بوستان

آنکہ اندر مسجدش ہنگامہ مرد
آنکہ اندر دیر او آتش فسرد
آنکہ دل از بہر او خوں کردہ ایم
آنکہ یادش را بجاں پروردہ ایم
از غم ماکن غم او را قیاس
آہ! ازاں معشوق عاشق ناشناس[12]

زندہ رود ان سوالات کا جواب دیتا ہے۔

ہندیاں منکر ز قانون فرنگ در نگیرد سحر و افسون فرنگ
روح را بار گراں آئین غیر گرچہ آید ز آسمان آئین غیر

سلطان شہید پھر کہتے ہیں:

چوں بردید آدم از مشت گلے
بادلے با آرزوئے در دلے
لذت عصیاں چشیدن کار اوست
غیر خود چیزے ندیدن کار اوست
زانکہ بے عصیان خودی ناید بدست
تا خودی باید بدست آید شکست
زائر شہر و دیارم بودۂ
چشم خود رابر مزارم سودۂ!
اے شناسائے حدود سے کائنات

درد کن دیدی ز آثار حیات [۱۳]

دکن کے بدلتے ہوئے حالات کا ذکر علامہ یوں کرتے ہیں:

تخم اشکے ریختم اندر دکن لالہ ہا رروید ز خاک آں چمن
رود کاویرے مدام اندر سفر دیدہ ام در جاں او شور دیگر [۱۴]

اقبال کے کلام سے سلطان شہید کافی متاثر ہوتے ہیں اوران کے کلام کا ذکر حضوراکرم ﷺ کی بارگاہ میں کرتے ہیں۔ حضور ﷺ یہ کلام سن کر کہتے ہیں کہ یہ کلام کس کا ہے اس میں زندگی کے ہنگامے موجود ہیں۔

پھر علامہ سلطان کا پیغام رود کاویری کو سنا دیتے ہیں۔

بودہ ام در حضرت مولائے کل
آنکہ بے او طے نمی گردد سبل
گرچہ آنجا جرأت گفتار نیست
روح را کارے بجز دیدار نیست
گفت ''این بیتے کہ برخواندی ز کیست
اندر و ہنگامہ ہائے زندگی است''
باہمہ سوزے کہ در سازد بجان
یک دو حرفہ اذ مابہ کاویری رسان
در جہاں تو زندہ رود او زندہ رود
خوشترک آید سرود اندر سرور [۱۵]

علامہ نے ان سوالات کا جواب نہایت ہی فنکارانہ انداز میں سلطان شہید کی (حقیقت حیات و مرگ وشہادت) میں بیان کیا ہے۔ یہ پیغام

علامہ کی زبانی سلطان شہید نے رود کاویری کو پہنچا دیا ہے۔اس پورے نظم میں چار بند ہیں اور پورے تسلسل کے ساتھ حقیقت حیات و مرگ و شہادت کو بیان کیا گیا ہے۔ پہلے بند میں سلطان شہید کی زندگی کے اصولوں اور ان کے صفات کو ظاہر کیا گیا ہے۔جن میں خودی،خودداری، وطن پرستی،شوق شہادت استقلال، جان بازی، وطن پرستی بھی شامل ہیں۔

اے ترا سازے کہ سوز زندگی است ہیچ می دانی کہ ایں پیغام کیست
آنکہ صحرا ہاز تدبیرش بہشت آنکہ نقش خود بخون خود نوشت
آنکہ خاکش مرجع صد آرزدست اضطراب موج تو از خون اوست
آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق اندر خواب او بیدار بود[۱۶]

دوسرے بند میں زندگی کی حقیقت کو ظاہر کیا گیا ہے۔

زندگانی انقلاب ہر دمے است زانکہ او اندر سراغ عالمے است

تیسرے بند میں سلطان شہید کا پیغام شروع ہوتا ہے اس میں سلطان شہید کے اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جب سلطان کو انگریزوں نے کہا تھا کہ یا ہماری غلامی اختیار کرو یا پھر جنگ کے لیے تیار ہو جاؤ۔تو سلطان نے کہا تھا:

"انگریزوں کا غلام بن کر سو سال تک دکن پر حکومت کرنے کے مقابلے میں آزار رہ کر صرف ایک دن حکومت کرنا ہزار درجہ بہتر ہے"۔(۱۷)

ایک اور جگہ سلطان نے کہا تھا گیڈر کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے اور سلطان کا یہی پیغام علامہ نے یوں پیش کیا ہے:

زندگی را چیست رسم و دین کیش
یک دم شیری بہ از صد سال میش [۱۸]

چوتھے بند میں زندگی کی حقیقت، موت اور شہادت کو بیان کیا گیا ہے۔

زندگی محکم ز تسلیم و رضاست — موت نیرنج و طلسم و سیمیاست

اس بند میں موت کی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے:

بگذر از مرگ کہ سازد بالحد — زانکہ ایں مرگ است مرگ دام ودو
مرد مومن خواہد از یزدان پاک — آں دگر مرگے کہ باگیرد ز خاک
آں دگر مرگ انتہائے راہ شوق — آخرین تکبیر در جنگاہ شوق
گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر — مرگ پور مرتضیٰ چیزے دگر [۱۹]

دنیاوی زندگی موت سے ختم ہوتی ہے مگر موت رضا الٰہی کے لیے ہی ہونی چاہیے تاکہ انسان کو حقیقی زندگی مرنے کے بعد نصیب ہو۔ یہی سلطان کا پیغام ہے۔ علامہ لکھتے ہیں:

جنگ شاہاں جہاں غارت گری است
جنگ مومن سنت پیغمبری است
جنگ مومن چیست ہجرت سوئے دوست
ترک عالم اختیار کوے دوست
آنکہ حرف شوق باقوام گفت
جنگ را رہبانی اسلام گفت

کس نداند جز شہید ایں نکتہ را
کہ بخون خود خرید ایں نکتہ را[20]

''جاوید نامہ'' میں علامہ اقبال نے جس فنکارانہ انداز سے سلطان ٹیپو کی ان خوبیوں اور حقائق کو پیش کیا ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں:

''سلطان شہید کا نام تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا لیکن ''جاوید نامہ'' میں علامہ اقبال نے سلطان کا تذکرہ جس انداز سے کیا ہے اس کی بدولت سلطان کی حقیقی حیثیت دنیا پر واضح ہوگی اور چونکہ اس زندہ جاوید کتاب کا ترجمہ رفتہ رفتہ یورپ کی تمام زبانوں میں ہو جائے گا اس لیے غلط فہمی کا ازالہ بھی ہو جائے گا جو انگریزوں نے اپنے مقاصد مشومہ کی تکمیل کے لیے اس مرد مجاہد کے متعلق اپنی تصانیف کے ذریعہ علمی طبقوں میں پھیلا دی تھی۔ انگریزوں کو سلطان شہید سے جس قدر عداوت اور نفرت تھی اس کا کچھ اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کُتوں کا نام ٹیپو رکھا اور سلطان کے لباس کو اپنے چپراسیوں اور اردلیوں کا یونیفارم قرار دیا اور دنیا کا کوئی عیب ایسا نہیں جو انگریزوں نے اس بطل جلیل کی ذات والا صفات سے منسوب نہ کیا ہو۔ علامہ نے ''جاوید نامہ'' میں ان دشمنان ملت کے ہر طلسم کو پاش پاش کر دیا اور صرف اس ایک شعر کے ذریعے سے ان کی غلط بیانیوں کی تردید کر دی:

''آنکہ گفتارش ہمہ کردار بود
مشرق اندر خواب او بیدار بود''[21]

علامہ اقبال اور نادر شاہ افغان

نادر محمد خان نے ابتدائی تعلیم دہرہ دون کے ملٹری کالج میں حاصل کی۔ پھر انگلستان میں مزید تعلیم حاصل کرنے کے بعد نادر خان امان اللہ خان کے وزیر اور سپہ سالار رہے۔ امان اللہ خان نے ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تو نادر خان نے اپنی بہادری، ذہانت اور دلیری کا ثبوت دیا۔ امان اللہ خان اور نادر خان کے درمیان اختلافات کی بناء پر نادر خان کو فرانس میں سفیر مملکت مقرر کر کے بھیج دیا۔ امان اللہ خان کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہوئی اور ان حالات میں بچہ سقہ نے کابل پر قبضہ کرلیا۔ نادر خان نے بچہ سقہ کو شکست دے کر افغانستان پر قبضہ کرلیا اور نادر شاہ کا لقب اختیار کیا۔

پیرس سے آتے ہوئے نادر خان لاہور کے راستے افغانستان روانہ ہوئے۔ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر دیگر شخصیات کے علاوہ نادر خان کے استقبال کے لیے علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ علامہ اقبال نے گاڑی کی روانگی سے پہلے نادر شاہ کو علیحدگی میں لے جا کر کہا:

> ”تم ایک بڑی مہم سر کرنے جا رہے ہو۔ میں ایک فقیر آدمی ہوں۔ صرف دعاؤں سے ہی تمہاری خدمت کرسکتا ہوں۔ اس وقت میرے پاس صرف پانچ ہزار روپیہ موجود ہیں اگر یہ حقیر سی رقم تمہارے کسی کام

آئے تو مجھے خوشی ہوگی''۔(۱)

چنانچہ نادر خان جو اس وقت چشم پر آب تھے ''فقیر'' کی اس دین کو نیک شگون سمجھتے ہوئے اسے بڑے احترام سے قبول کرلیا۔(۲)

علامہ اقبال کو نادر شاہ افغان سے کافی عقیدت تھی۔ وہ انہیں کافی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔انہوں نے نادر شاہ کا ذکر اپنے اردو اور فارسی کلام میں نہایت ہی عقیدت سے کیا ہے اس کے علاوہ ان کی تقاریر میں بھی نادر خان کا ذکر نہایت ہی عقیدت اور احترام سے ملتا ہے۔

مسلمان قوم اور مسلم مملکت کے لیے علامہ اقبال نادر شاہ جیسی عظیم المرتبت شخصیات کو اہم سمجھتے ہیں۔نادر شاہ کی بہادری، شجاعت اور دلیری علامہ کو کافی پسند تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے نادر شاہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔

نادر شاہ جب دوبارہ تخت نشین ہوا تو ملک کی وسیع تر اصلاحات کا آغاز کیا گیا۔ ان حالات میں سب سے پہلے ملک کی تعلیمی حالات کا جائزہ لیا گیا۔ چنانچہ نادر خان نے ہندوستان کی کچھ بلند ہستیوں کو اس سلسلے میں افغانستان کا دورہ کرنے کی دعوت دی۔ اس دعوت کا مقصد افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کا خاکہ تیار کرنا تھا۔ اس سلسلے میں سید سلیمان ندوی، سر راس مسعود، سر محمد اقبال کا انتخاب عمل میں لایا گیا۔ چنانچہ تینوں حضرات ۲۱/ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل کے لیے روانہ ہوگئے۔ نادر شاہ سے اس وفد کی ملاقات ''فقر دلکش'' میں ہوئی۔ علامہ اقبال نے

لاہور سے روانہ ہوتے وقت نادر شاہ کے لیے ایک قرآن مجید کا نسخہ ساتھ لیا تھا۔ چنانچہ علامہ اقبال نے نادر شاہ کو قرآن مجید کا یہ نسخہ پیش کیا اور فرمایا:

''اہل حق کی یہی دولت و ثروت ہے اس کے باطن میں حیات مطلق کے چشمے بہتے ہیں۔ یہ ہر ابتداء کی انتہا اور ہر آغاز کی تکمیل ہے اس کی بدولت مومن خیبر شکن بنتا ہے۔ میرے کلام میں تاثیر اور میرے دل کا سوز و گداز سب اسی کا فیضان ہے''۔ (۳)

قرآن مجید کا یہ نسخہ نادر شاہ نے جب وصول کیا تو ان کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا، آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور جواب میں علامہ سے کہا:

''جب میں جلا وطن تھا اور کوہ صحرا میں غم زدہ وقت کاٹ رہا تھا جب میرے پاس زندگی کے وسائل کی کمی تھی اور مادی طاقت کا فقدان تھا۔ جب میرا کوئی ساتھی اور غمخوار نہ تھا تو یہی کتاب میری رفیق و رہنما اور ہمدرد و غمگسار تھی''۔ (۴)

نادر شاہ اور علامہ اقبال ایک دوسرے کو کافی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ایک دوسرے سے دونوں کو کافی عقیدت تھی۔ جب دونوں کی پہلی ملاقات ہوئی تو مغرب کی نماز کے وقت نادر شاہ نے علامہ اقبال سے درخوات کی کہ وہ اس وقت نماز پڑھائیں لیکن اقبال نے اس موقعہ پر نادر شاہ سے کہا:

''نادر شاہ میں نے اپنی عمر کسی عادل بادشاہ کی اقتداء میں نماز پڑھنے کی تمنا میں گزاری۔ آج جب کہ خدا نے فقیر کی اس مراد کو پورا کرنے کے

اسباب مہیا کر دیئے ہیں تو کیا مجھے اس نعمت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔
آج میں تیری اقتداء میں نماز پڑھوں گا۔ امامت تجھے ہی کرنا پڑے گی''۔(۵)

''قصر دلکش'' میں مختلف معاملات پر تبصرہ ہوئے۔ انگلستان کی کئی علمی و ادبی شخصیتوں سے کئی مسائل پر بحث ہوئی۔ ملک کی تعلیمی بہتری کے لیے بھی اصلاحات کا ایک خاکہ تیار کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک دو انجمنوں نے سپاسنامے بھی پیش کئے۔ ان مسائل پر غور وفکر کرنے کے بعد علامہ اقبال نے سلطان محمود کے مزار پر نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد غزنی کی سیر کی۔ حکیم سنائی کا مزار بھی دیکھا۔ بابر کے مزار پر حاضری دینے کے بعد قندھار چلے گئے اور یہاں حضور ﷺ کے خرقہ مبارک کی زیارت بھی کی۔ کئی اور مصروفیات سے فارغ ہو کر ایک ہفتہ بعد واپس وطن لوٹے۔

وطن واپس لوٹنے پر اور اس سے پہلے بھی آپ نے بہت سی تقاریر میں نادر شاہ کی خدمات کا جائزہ لیا اور انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ ایک تقریر میں آپ نے نادر شاہ کی خدمات کا یوں ذکر کیا۔

''مسولینی نے ایک اچھا نظریہ قائم کیا ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ اٹلی کو چاہیے کہ اپنی نجات حاصل کرنے کے لیے ایک کروڑ پتی کو پیدا کرے جو اٹلی کے گریبان کو اینگلو سیکشن اقوام کے قرضہ جات کے چنگل سے چھڑا سکے۔ یا کسی دوسرے دانتے کو جنم دے جو نئی جنت پیش کرے یا کسی نئے کولمبس کو پیدا کرے جو ایک نئے براعظم کا پتہ لگائے اگر آپ

مجھ سے افغانستان کے بارے میں دریافت کریں تو میں کہوں گا کہ افغانستان کو ایک ایسے مرد کی ضرورت ہے جو اس ملک کو اس کی قبائلی زندگی سے نکال کر وحدت ملی کی زندگی سے آشنا کرے لیکن مجھے خوشی ہے کہ افغانستان کو ایک مرد کامل مل گیا ہے جس کا وہ ایک عرصہ سے انتظار کر رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ (آپ معزول صدر ظاہر شاہ کے والد تھے" کی شخصیت کو اسی لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ افغانستان کو ایشیاء میں ایک نئی قوم بنا کر دنیا سے متعارف کرائیں۔اس وطن کے جوانوں کو چاہیے کہ اس بزرگ رہنما کو اپنی تعلیم و تربیت کا معلم سمجھیں کیونکہ ان کی تمام زندگی ایثار، اخلاص اور اپنے ملک کے ساتھ صداقت اور اسلام کے ساتھ عشق و محبت سے لبریز ہے"۔(۶)

علامہ اقبال کو افغان قوم سے کافی ہمدردی تھی کیونکہ یہ قوم اپنی بہادری، دلیری اور شجاعت کے لیے دنیا میں اپنی مثال قائم کر چکی ہے۔ علامہ کے خیال میں قوم کی بیداری کے لیے افغان قوم کی بیداری لازمی ہے۔اس لیے ایک ایسی قوم جو پشاور اور کابل کے درمیانی علاقہ میں رہتی ہے ہی مسلمانوں کو اپنی عظمت واپس دلا سکتی ہے۔قوم کی بیداری کا انحصار تعلیم و تربیت پر ہی ہے اس لیے ایسے قوم کی صحیح تعلیم و تربیت ہونی لازمی ہے۔اس قسم کی تربیت افغانستان کو صرف نادر شاہ ہی کی ذات سے ممکن ہو سکتی ہے۔

بال جبریل کی نظم بعنوان "نادر شاہ افغان" میں علامہ نادر شاہ کا ذکر یوں کرتے ہیں:

حضور حق سے چلا لے کے لولوئے لالہ
وہ ابر جس سے رگ گل ہے مثل تار نفس
بہشت راہ میں دیکھا تو ہوگیا بیتاب
عجب مقام ہے جی چاہتا ہوں جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے تیرا
ہرات و کابل و غزنی کا سبزۂ نورس
سر شک دیدہ نادر بہ داغ لالہ فشاں
چناں کہ آتش او را دگر فرو نہ نشاں [7]

نادر شاہ کی واحد ذات ہی ایسی ہے جس کی بدولت افغان قوم کی عظمت لوٹ آسکتی ہے اور اس مردہ قوم کو نئی زندگی مل سکتی ہے۔

علامہ نے ''محراب گل افغان کے افکار'' کے عنوان کے تحت اس کوہستانی، صحرائی وطن کے لیے اپنے قلبی تاثرات ظاہر کر کے اس ملک کی بہی خواہوں کا یوں اظہار کیا ہے:

میرے کہستان تجھے چھوڑ کر جاؤں کہاں
تیرے چٹانوں میں ہے میرے اب وجد کی خاک
تیری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا
عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائیں [8]

علامہ اقبال نے اپنے فارسی کلام میں بھی نادر شاہ افغان کا ذکر کافی احترام سے کیا ہے۔ چنانچہ مثنوی مسافر میں ان کے بارے میں لکھتے

ہیں:

نادر افغان شہ درویش خو　　رحمت حق بر روان پاک او
کار ملت محکم از تدبیر او　　حافظ دین مبین شمشیر او
چوں ابو ذر خود گداز اندر نماز　　ضربتش ہنگام کین خارا گداز
عہد صدیق از جمالش تازہ شد　　عہد فاروق از جلالش تازہ شد
فقر نادر آخر اندر خون تپید　　آفرین بر فقر آن مرد شہید
اے صبا اے رہ نورد تیز گام　　در طواف مرقدش نرمک خرام
شاہ در خواب است پا آہستہ نہ　　غنچہ را آہستہ تر بکشا گرہ[9]

مثنوی مسافر میں علامہ اقبال نے نادر شاہ کی سیرت کے بعض پہلوؤں کو واضح کیا ہے اس کے بعد اقوام سرحد سے خطاب کیا ہے۔ پھر نادر شاہ سے ملاقات کا حال لکھا ہے۔ شہنشاہ بابر کے مزار پر حاضری کا اشارہ کرنے کے علاوہ حکیم سنائی کے مزار پر حاضری کا تذکرہ بھی کیا ہے۔ اس کے فقر و فلسفہ کا ذکر بھی ملتا ہے۔ محمود غزنوی کے مزار پر حاضری کا حال بھی لکھا گیا ہے۔ مسلمانوں کی حالت کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ قندہار کے سفر کی طرف اشارہ بھی ملتا ہے۔ خرقہ مبارک کی زیارت کا تذکرہ کرنے کے علاوہ احمد شاہ ابدالی کے مزار کی زیارت کا حال اور ظاہر شاہ سے خطاب کا ذکر بھی اس مثنوی میں ملتا ہے۔ فصل سوم میں علامہ اقبال نادر شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ذکر یوں کرتے ہیں:

بادشاہے خوش کلام و سادہ پوش　　سخت کوش و نرم خوئے و گرم جوش

صدق و اخلاص از نگاہش آشکار دین و دولت از وجودش استوار
خاکی و از نور یان پاکیزہ تر از مقام فقر و شاہی باخبر
در حضور آں مسلمانے کریم ہدیہ آوردم ز قرآن عظیم
گفتم ایں سرمایہ اہل حق است در ضمیر او حیات مطلق است
نشۂ حرفم بخون او ووید دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت نادر در جہاں بیچارہ بود از غم دین و وطن آوارہ بود
غیر قرآن غم گسار من نبود قوتش ہر باب را برمن کشود
گفتگوے حسرو والا نژاد باز بامن جذبۂ سرشار داد[10]

جاوید نامے میں علامہ اقبال نے نادر شاہ کا ذکر یوں کیا ہے:

آنچہ بر تقدیر مشرق قادر است عزم و حزم پہلوی و نادر است
نادر آں سرمایہ درانیاں آں نظام ملت افغانیاں
از غم دین و وطن زار و زبوں لشکرش از کوہسار آمد بروں
ہم سپاہی ہم سپہ گر ہم امیر باعدو فولاد با یاراں حریر
من فدائے آنکہ خود را دیدہ است عصر حاضر رانکو سنجیدہ است
غربیاں را شیوہ ہائے ساحری است تکیہ جز بر خویش کردن کافر است[11]

نادر شاہ اور رضا شاہ پہلوی کا ذکر کر کے ان کی عظمت بیان کی گئی ہے۔ چنانچہ نادر شاہ افغان نے بچہ سقہ کا خاتمہ کر کے افغانستان کو ترقی کی راہ پر ڈال دیا ہے اور اس قوم کو ظلم و جبر سے نجات دلائی۔ چونکہ نادر شاہ کو سپہ گر بادشاہ اور عصر حاضر کے تقاضوں سے باخبر شخصیت قرار دیا

گیا ہے۔ وہ مغرب کی مکاری اور عیاری سے باخبر ہیں۔ وہ اپنی بصیرت اور حکمت عملی سے دشمنوں کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکتا ہے۔ نادر شاہ کے اوصاف بیان کر کے علامہ نے نہایت ہی فنکارانہ انداز سے ان کی عظمت ظاہر کی ہے۔

✿✿

مذہب کے اعلام ومشاہیر

(۱) اقبال رسالت مآب میں

(۲) اقبال اور میر سید علی ہمدانی

(۳) اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیری

(۴) اقبال اور گورو نانک

علامہ اقبال حضور رسالت مآبؐ میں

حضور رسالت مآب ﷺ کا ذکر علامہ نے اپنے کلام میں نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔ اپنے کلام میں علامہ نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ قرآن کریم کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ حضور اکرم ﷺ کی اطاعت ہی زندگی کو کامیاب بنا سکتی ہے۔ حضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ انسان کے لیے بہترین شمع ہدایت ہے۔ اقبال کی پوری شاعری اپنے ارتقاء کے ہر دور میں اسی شمع کے اجالے سے روشن ہے۔

اقبال کو رسول پاک ﷺ کی ذات اقدس سے جو والہانہ عشق ہے اس کا اظہار ان کی اردو اور فارسی شاعری کے ہر دور میں ہوتا رہتا ہے۔ اردو میں ''بانگ درا'' اور ''ارمغان حجاز'' تک اور فارسی میں ''اسرار رموز'' سے ''پس چہ باید کرد'' اور ''ارمغان حجاز'' کے حصہ فارسی تک کوئی مجموعہ کلام ایسا نہیں جہاں اس عشق کا جلوہ نظر نہ آتا ہو۔ اس جلوے کے انداز اور رنگ البتہ ہر جگہ ایک سے نہیں۔ (۱)

حضرت علامہ کے کلام بالخصوص فارسی کلام پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہی اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ ذات رسالت مآب سے عشق کی جو چاشنی، جذبات کی جدت اور فراوانی ان کے یہاں ملتی ہے دوسروں

کے ہاں کم ملے گی۔ حضرت علامہ کے کلام میں گہرائی بھی ہے اور اثر آفرینی بھی۔ ان کے اشعار کا ہر لفظ قاری کے دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ (۲)

علامہ اقبال نے شروع سے ہی دینی ماحول میں پرورش پائی، ان کے والدین متقی، خداترس اور دیندار تھے۔ والدین کے علاوہ علامہ اقبال کو نیک اور مذہب پرست اساتذہ ملے۔ جنہوں نے علامہ کی پرورش دینی ماحول میں کی۔ علامہ کی اس دینی تربیت میں ان کے ماحول والدین اور اساتذہ کا حاصل عمل دخل رہا۔ عربی فارسی اور قرآنی تعلیمات علامہ کو گھر کے علاوہ اساتذہ سے حاصل ہوئیں۔ علامہ کے والدین نیک سیرت اور دیندار تھے۔ انہوں نے علامہ اقبال کی صحیح تربیت بچپن سے ہی شروع کی۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو:

> اقبال ابھی چوتھی جماعت میں پڑھتے تھے کہ ایک دن ان کے والد صبح سویرے مولوی میر حسن صاحب کے ہاں پہنچے اور کہنے لگے ''مولوی صاحب! میں سوچتا ہوں اقبال آخر انگریزی کی تعلیم پا کر کیا کرے گا! اسے مذہب کی تعلیم کیوں نہ دی جائے جس سے اس کی عاقبت سدھر جائے اور دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو۔ میرے خیال میں یہی اچھا ہے کہ اقبال اسکول جانے کے بجائے مسجد میں آپ سے دینیات پڑھ لیا کرے''۔ (۳)

اپنے والد کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

............ایک صبح کو جب میں حسب معمول قرآن مجید کی تلاوت کر رہا تھا وہ میرے پاس آئے اور فرمایا۔ بیٹا کہنا یہ تھا کہ جب تم قرآن پڑھو تو یہ سمجھو کہ یہ قرآن کریم تم پر اترتا ہے یعنی اللہ تعالیٰ خود تم سے ہمکلام ہے''۔(۴)

والدین کی اس صحیح تربیت اور احسان کا اعتراف علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔

پھر آر کھوں قدم مادر و پدر پہ جبیں
کیا جنہوں نے محبت کا راز داں مجھ کو[۵]

نظم ''والدہ مرحوم کی یاد میں'' میں علامہ لکھتے ہیں:

دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا[۶]

والدین کے علاوہ علامہ اقبال کو استاد سید میر حسن کی تربیت بھی نصیب ہوئی جنہوں نے علامہ کو فارسی، عربی، قرآن کریم اور دینیات کی تعلیم سے مستفید کیا۔ چنانچہ علامہ نے اس بات کا ذکر ''التجائے مسافر'' والی نظم میں یوں کیا ہے:

وہ شمع بار گہہ خاندان مرتضوی
رہے گا مثل حرم جس کا آستان مجھ کو

نفس سے جس کے کھلی میری آرزو کی کلی
بنایا جس کی مروت نے نکتہ داں مجھ کو
دعا یہ ہے کہ خداوند آسمان و زمین
کرے پھر اس کی زیارت سے شادماں مجھکو[7]

علامہ اقبال نے مختلف مغربی اور مشرقی شعراء، ادیبوں اور دیگر بلند پایہ شخصیات سے بھی فائدہ اٹھایا اور ان سے متاثر بھی ہوئے۔ علامہ نے یورپ کے سفر کے دوران مختلف علوم سے فائدہ اٹھایا مگر اسلام کے مقابلے میں دیگر ادیان اور فلسفے ہیچ نظر آئے اور نبی کریم ﷺ کی انقلابی شخصیت کے سامنے بڑے بڑے انقلابی اور فلاسفہ نہ ٹھہر سکے۔ علاوہ فلسفہ اور عصری علوم کو درد سر قرار دیتے ہیں اور بہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ انہیں ان علوم سے کچھ نہ ملا۔ دین و دنیا کی فلاح و کامرانی والدین کی صحبت اور مرشدان کامل کی معیت ہی میں حاصل ہوئی۔

مرا درس حکیماں درد سر داد   کہ من پروردہ فیض نگاہم[8]

علامہ اقبال ایک اور جگہ اس طرح بیان کرتے ہیں:

مے از میخانہ مخرب چشیدم   بجان من کہ درد سر خریدم
نشستم   بانگویان   فرنگی   ازاں بے سود تر روزے ندیدم[9]

یورپ کی مادہ پرست دنیا نے اقبال کے تصور رسالت کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا بلکہ وہاں بھی علامہ اقبال نے اطاعت رسول ﷺ کو اپنایا اور قرآنی تعلیمات کا بغور مطالعہ کیا اور یہاں ان کا تصور دین زیادہ مستحکم

ہو گیا اور خود فرمایا کہ یورپ کی آب و ہوا نے مجھے مسلمان کر دیا۔[10]

اس بات کا اعتراف علامہ اقبال کی نظم ''سر عبدالقادر کے نام'' میں ملتا ہے۔ علامہ اقبال قوم کی خدمات کا بیڑا اٹھانے کی کوشش یورپ سے ہی شروع کرتے ہیں اور سر عبدالقادر ''مدیر مخزن'' کو بھی اس کام کے لیے تیار کرتے ہیں تاکہ دونوں مل کر قوم کی خدمات میں ہی زندگی کو صرف کریں، زندگی بسر کرنے کے لیے علامہ لوگوں کے دلوں میں عشق رسول ﷺ کا جذبہ پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہیں اور صرف اسی جذبے سے ہی قوم دنیا میں عظیم مقام پیدا کر سکتی ہے۔

اہل محفل کا دکھادیں اثر صیقل عشق
سنگ امروز کو آئینہ فردا کردیں
جلوہ یوسف گم گشتہ دکھا کر ان کو
تپش آمادہ تراز خون زلیخا کردیں
شمع کی طرح جئیں بزم گہہ عالم میں
خود جلیں دیدۂ اغیار کو بینا کردیں[11]

علامہ اقبال نے ان دونوں مثنویوں میں عشق رسول ﷺ کا جذبہ صاف ظاہر ہے۔ ایک خط میں علامہ مثنوی اسرار خودی اور رموز بے خودی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

یہ خط ۴ / اکتوبر ۱۹۱۵ء کو لکھا ہے۔

''ہندوستان کے مسلمان کئی صدیوں سے ایرانی تاثرات کے اثر

میں ہیں۔ ان کو عربی اسلام سے اور اس کے نصب العین اور غرض و غایت سے آشنائی نہیں۔ ان کے لٹریری آئیڈیل بھی ایرانی ہیں اور سوشل نصب العین بھی ایرانی۔ میں چاہتا ہوں کہ اس مثنوی میں حقیقی اسلام کو بے نقاب کروں جس کی اشاعت رسول ﷺ کے منہ سے ہوئی۔ صوفی لوگوں نے اسے تصوف پر ایک حملہ تصور کیا ہے اور یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہے۔ انشاء اللہ دوسرے حصے میں دکھاؤں گا کہ تصوف کیا ہے اور کہاں سے آیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کی زندگی سے کہاں تک ان تعلیمات کی تصدیق ہوتی ہے جس کا تصوف حامی ہے''۔(۱۲)

علامہ اقبال نے ان دونوں مثنویوں میں بڑے احترام سے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں خراج عقیدت یوں پیش کیا ہے۔''اسرار خودی'' کے مندرجہ ذیل اشعار میں کہتے ہیں:

در دل مومن مقام مصطفیٰ است — آبروئے ماز نام مصطفیٰ است
طور موجے از غبار خانہ اش — کعبہ را بیت الحرم کا شانہ اش
کمتر از آنے زاد قاتش ابد — کاسب افازیش از ذاتش ابد
بوریا ممنون خواب راحتش — تاج کسریٰ زیر پائے امتش
در شبستان حرا خلوت گزید — قوم و آئین وحکومت آفرید[۱۳]

رموز بے خودی میں لکھتے ہیں:

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید — وز رسالت درتن ماجاں دمید

حرف بے صورت اندریں عالم بدیم　　از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوین ما　　از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است　　جزو ما از جزو ما لاینفک است
آنکہ شان اوست یہتدی من یرید　　از رسالت حلقہ گرد ما کشید[۱۴]

''پیام مشرق'' میں علامہ نے اپنے اشعار کے ذریعے عقیدت کا اظہار یوں کیا ہے:

تنم گلے ز خیابانِ جنت کشمیر
دل از حریم حجاز و نواز شیراز است

یہاں حضور انور ﷺ کی خدمت میں علامہ اس طرح عرض کرتے ہیں:

با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار
یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من

اسی کتاب کی نظم ''خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا'' میں کہتے ہیں:

امئ بود کہ ماز اثر حکمت او
واقف از سر نہاں خانۂ تقدیر شدیم
اصل ما یک شرر باختہ رنگے بودہ است
نظرے کرد کہ خورشید جہانگیر شدیم[۱۵]

''جاوید نامہ'' میں بھی علامہ اقبال نے حضور اکرم ﷺ کے حضور عقیدت یوں پیش کیا ہے:

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید　　مدتے جز خویشتن کس را ندید

نقش مارا در دل او ریختند ملتے از خلوتش انگیختند
می توانی منکر یزدان شدن منکر از شان نبی نتوان شدن [16]

''مثنوی مسافر'' کے فصل چہار دہم ''در حضور رسالتمآب ﷺ'' میں یوں عرض کرتے ہیں:

اے ءتو ما بچارگاں را ساز و برگ وار ہاں ایں قوم را از ترس مرگ
سوختی لات و منات کہنہ را تازہ کردی کائنات کہنہ را
در جہاں ذکر و فکر انس و جاں تو صلوات صبح تو بانگ اذاں
اے مقام و منزل ہر راہرو جذب تو اندر دل ہر راہرو
ساز ما بے صوت گردید آنچناں زخمہ ہر رگہائے او آید گراں
در عجم گردیدم وہم در عرب مصطفےٰ نایاب و ارزاں بولہب
ایں مسلماں زادۂ روشن دماغ ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
در جوانی نرم و نازک چوں حریر آرزو در سینہ او زود میر [17]

''زبور عجم'' ۱۹۲۶ء میں مکمل ہوئی اور دوسرے سال شائع ہوئی اس میں حضور انور ﷺ کے نور عین حضرت امام حسین علیہ السلام کی حیات طیبہ سے جوش عمل حاصل کرنا چاہتے ہیں، لکھتے ہیں:

ریگ عراق منتظر کشت حجاز تشنہ کام
خون حسین بازدہ کوفہ و شام خویش را

ایک اور جگہ یوں بھی عرض کرتے ہیں:

حکمت و فلسفہ کردہ ست گراں خیز مرا
خضر من از سرم ایں بار گراں بیاک انداز

حضور انورﷺ کی ہجرت بڑی مصلحت رکھتی ہے۔

مصطفیٰ از کعبہ ہجرت کردہ با ام الکتاب

پھر حضورﷺ ہی کی سیرت مبارکہ ہے جس سے ''بے ہمہ'' اور ''باہمہ'' کا درس ملتا ہے۔

زندگی انجمن آراو نگہدار خود است

اے کہ در قافلۂ بے ہمہ شو باہمہ[18]

کلام اقبال کے اردو حصے میں بھی حضور اکرمﷺ کا ذکر نہایت عقیدت اور احترام کے ساتھ ملتا ہے۔''بانگ درا'' میں علامہ نے بہت سی نظموں میں اس کا ثبوت پیش کیا ہے۔ان میں بلاد اسلامیہ، ایک حاجی مدینے کے راستے، حضرت بلال، حضرت ابوبکر صدیق، ترانہ ملی وطنیت، خطاب بہ جوانان اسلام اور خاص کر نظم حضور رسالت مآبﷺ بھی شامل ہیں۔

نظم ''حضور رسالت مآبﷺ'' میں علامہ یوں عرض کرتے ہیں:

گراں مجھ پہ یہ ہنگامہ و زمانہ ہوا

جہاں سے باندھ کے رخت سفر روانہ ہوا

قیود شام و سحر میں بسر تو کی لیکن

نظام کہنہ عالم سے آشنا ہوا

فرشتے بزم رسالت میں لے گئے مجھ کو

حضور آیۂ رحمت میں لے گئے مجھ کو

کہا حضور نے اے عندلیب باغ حجاز
کلی کلی ہے تیری گرمی نوا سے گداز
ہمیشہ سر خوش جام والا ہے دل تیرا
فتادگی ہے تیری غیرت سجود نیاز
اڑا جو پستی دنیا سے تو سوے گردوں
سکھائی تجھ کو ملائک نے رفعت پرواز
نکل کے باغ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا؟
حضور! دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی
ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاض ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا لہو اس میں[19]

یہ نظم ۶؍اکتوبر ۱۹۰۱ء کو شاہی مسجد لاہور میں مسلمانوں کے مجمع عام کے سامنے پڑھی گئی۔ ۱۰؍اکتوبر کو زمیندار، اکتوبر ۱۹۱۱ء کے مخزن اور نومبر ۱۹۱۱ء کے کشمیری میگزین میں شائع ہوئی۔ نظر ثانی میں پہلے بند کا تیسرا

شعر کاٹ دیا گیا جو یہ تھا:

ہوا رفیق اجل اشتیاق آزادی
سمند عمر کو اک اور تازیانہ ہوا[20]

''بانگ درا'' کی نظم ''جواب شکوہ'' میں لکھتے ہیں:

کون ہے تارک آئین رسول مختار
مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار
کس کی آنکھوں میں سمایا شعار اغیار
ہوگئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار
قلب میں سوز نہیں روح میں احساس نہیں
کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

اسی نظم کے آخری شعر میں کہتے ہیں:

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح قلم تیرے ہیں[21]

ایک اور جگہ یہ شعر ملتا ہے:

اے باد صبا کملی والے سے جا کہیو یہ پیغام مرا
قبضے سے امت بیچاری کی دین بھی کیا دنیا بھی گئی

یہ عقیدت ہر مقام پر ملتی ہے بال جبریل میں مندرجہ ذیل اشعار ملتے ہیں:

محمدؐ بھی تیرا جبریل بھی قرآن بھی تیرا
مگر یہ حرف شیریں ترجمان تیرا ہے یا میرا[22]

وہ دانائے سبل ختم رسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

❁❁❁

سبق ملا ہے یہ معراج مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالم بشریت کی زد میں ہے گردوں

❁❁❁

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ
عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام[۲۳]

علامہ خدا کے ساتھ تو شوخیاں روا رکھتے ہیں اور یہاں تک کہہ دیتے ہیں:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیکن حضور رسالتمآب ﷺ میں خودی سرنگوں نظر آتی ہے اور علامہ عجز وانکسار کا پتلا بنے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ ان کا تو عقیدہ یہ تھا

می توانی منکر یزداں شدن
منکر از شان نبی نتواں شدن
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی ایں تمام ابولہبی است''[۲۴]

''ضرب کلیم'' کی ایک نظم ''ایک فلسفہ زدہ سید زادے کے نام'' میں لکھتے ہیں:

دل در سخن محمدی بند　　اے پور علی زبو علی چند
چوں دیدۂ راہ بین نہ داری　　قائد قرشی بہ از بخاری''

(کلیات اقبال ص۴۸۱)

''ضرب کلیم'' ہی کی نظم ''اے روح محمد ﷺ''

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر
اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!
وہ لذت آشوب نہیں بحر عرب میں
پوشیدہ جو ہے مجھ میں وہ طوفان کدھر جائے
ہر چند ہے بے قافلہ و راحلہ و زار
اس کوہ و بیاباں سے حدی خواں کدھر جائے
اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ
آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

(کلیات اقبال ص۵۱۰)

نظم ''شفاخانہ حجاز'' ''بانگ درا'' میں علامہ اقبال عرض کرتے ہیں:

اوروں کو دیں حضور یہ پیغام زندگی
میں موت ڈھونڈتا ہوں زمین حجاز میں

(کلیات اقبال ص۱۹۸)

ارمغان حجاز میں حضور رسالتمآب ﷺ کے عنوان سے جو فصل شروع ہوتی ہے اس کا آغاز عزت بخاری کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا[۲۵]

اس فصل کے کچھ اشعار یوں ہیں:

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تست　　سروش از می دیرینہ تست
جز ایں چیزی نمی دانم ز جبرئیل　　کہ او یک جوہر از آئینہ تست
بچشم من نگہ آوردہ تست　　فروغ لا الہ آوردۂ تست
دوچارم کن بہ صبح من رآنی　　شبم را تاب مہ آوردۂ تست
جبیں را پیش غیر اللہ سودیم　　چہ گبراں در حضور او سرودیم
نالم از کسے می نالم از خویش　　کہ ماشایان شان تو بنوویم
مرا ایں سوز از فیض دم تست　　سردرش از می دیرینہ تست
خجل ملک جسم از درویشی من　　کہ دل در سینۂ من محرم تست
در آں دریا کہ اورا ساحلی نیست　　دلیل عاشقان غیر از ولی نیست
تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم　　وگرنہ جز تو مارا منزے نیست
بگوئے تو گداز یک نوابس　　مرا ابن ابتداء این انتہا بس
خراب جرات این رند پاکم　　خدا را گفت مارا مصطفیٰ بس[۲۶]

کلام اقبال کے اردو اور فارسی دونوں حصوں میں عشق رسول ﷺ کا جذبہ نہایت ہی عقیدت اور خلوص کے ساتھ نمایاں ہے۔ علامہ اقبال اور

عشق رسول ﷺ کا ذکر کرتے ہوئے فقیر سید وحید الدین لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم کی سیرت اور زندگی کا سب سے زیادہ ممتاز محبوب اور قابل قدر وصف جذبۂ عشق رسول ﷺ ہے۔ ذات رسالت مآب کے ساتھ انہیں جو والہانہ عقیدت تھی اس کا اظہار ان کی چشم نمناک اور دیدۂ تر سے ہوتا تھا کہ جہاں کسی نے حضور ﷺ کا نام ان کے سامنے لیا۔ ان پر جذبات کی شدت اور رقت طاری ہوگئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو رواں ہوگئے۔ رسول اللہ ﷺ کا نام آتے ہی اور ان کا ذکر چھیڑتے ہی اقبال بے قابو ہو جائے.......... عشق رسول ﷺ ڈاکٹر اقبال کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا اور ان کے ذہن و فکر پر چھا گیا تھا، وہ کتنے بڑے فلسفی تھے اور فلسفہ کا سارا معاملہ عقل کے بل بوتے پر چلتا ہے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو وہ عقل کی کسوٹی پر جانچنے کی جرات نہ کرتے تھے۔ اس معاملہ میں وہ ایمان بالغیب کے قائل تھے۔ بس جو حضور ﷺ نے فرمایا وہ دین و ایمان اور سر آنکھوں پر۔ اس بارگاہ میں چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں، سمعنا و اطعنا اطاعت فرمانبرداری اور غلامی، یہی ایمان کی دلیل بلکہ بنیاد ہے۔

بہ مصطفٰے برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

اقبال کی شاعری کا خلاصہ جوہر اور لب لباب عشق رسول اور اطاعت رسول ﷺ ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے صحبتوں میں عشق رسول ﷺ

کے جو مناظر دیکھے ہیں، ان کا لفظوں میں پوری طرح اظہار بہت مشکل ہے وہ کیفیتیں بس محسوس کرنے کی تھیں، جب یہ مقدس ذکر چھیڑ ہی گیا ہے تو جی چاہتا ہے کہ ایک واقعہ بیان کر ہی دوں۔

ایک دن سیرت نبوی ﷺ پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز میں ایک واقعہ سنایا۔ فرمانے لگے:

ایک معرکہ میں مسلمان سپہ سالار کا گھوڑا زخمی ہو گیا، زخموں کی یہ حالت تھی کہ گھوڑے کا میدان کارزار میں کھڑا رہنا دشوار تھا۔ وہ بیٹھنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف کافر یلغار کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ اس عالم میں امیر العسکر نے گھوڑے کو مخاطب کر کے کہا اگر تم نے اس نازک وقت میں میرا ساتھ چھوڑ دیا تو اس جہان فانی سے رخصت ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ سے تمہاری شکایت کروں گا۔

یہ واقعہ بیان کر کے ڈاکٹر صاحب زار و قطار رونے لگے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ اس واقعہ سے سپہ سالار کے عشق رسول ﷺ کا بھی اظہار ہوتا ہے۔ (۲۷)

❁❁❁

علامہ اقبال اور میر سید علی ہمدانیؒ

شاہ ہمدان کا پورا نام میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ ہے۔امیر کبیر، علی الثانی اور شاہ ہمدان ان کے معروف القاب ہیں۔آپ آخری لقب سے ہی کشمیر اور برصغیر میں زیادہ مشہور ہیں۔اقبال نے ''امیر کبیر'' کو ایک جگہ نام کے ساتھ لکھا ہے اور باقی ہر جگہ ''شاہ ہمدان'' کے لقب سے ہی ان کو یاد کیا ہے۔آپ کی ولادت کے بارے میں ڈاکٹر محمد ریاض لکھتے ہیں:

''آپ کی ۱۲ر رجب ۷۱۴ھ مطابق ۲۱ر اکتوبر ۱۳۱۴ء کو ہمدان میں ہوئی۔آپ حسینی سید تھے اور ہمدان میں آپ کے خاندان کو بڑا اقتدار حاصل تھا۔آپ کے والد سید شہاب الدین ہمدان کے حاکم تھے اور سمنان کے حاکم (اور بعد میں وادی عرفان کے معروف عارف) سید علاؤ الدین سمنانی وفات (۷۳۶ھ) ان کے ماموں اور مربی تھے۔شاہ صاحب نے پہلے قرآن مجید حفظ کیا، پھر مروجہ علوم دین میں تبحر حاصل کیا۔علوم معقول اور منقول میں بھی آپ نے دسترس حاصل کی۔۱۲ر برس کی عمر سے ہی وادی سلوک میں قدم رکھا۔اخی علی دوستی (وفات ۷۳۳ یا ۷۳۴) اور شیخ محمود مزدقانی (وفات ۷۶۶ھ) سے روحانی اور باطنی فیض حاصل کیا۔شاہ صاحب کا تعلق سہروردیہ کی ایک

شاخ کبرویہ سے ہے جن کا سلسلہ شیخ نجم الدین الکبریٰ (وفات ۶۱۸ھ) سے جاملتا ہے"۔(۱)

تاریخ کشمیر میں آپ کی ولادت یوں لکھی گئی ہے:

حضرت امیر کی ولادت ۱۲/ماہ رجب ۷۱۴ھ ہمدان میں سوموار کو ہوئی۔(۲)

آپ کی ولادت کے بارے میں اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں:

"حضرت سید علی ہمدانی ۱۲/رجب روز دوشنبہ ۷۱۴ھ/۱۳۱۴ء کو بی بی فاطمہ کے بطن سے ہمدان میں پیدا ہوئے۔ رحمۃ اللہ سے آپ کی تاریخ ولادت نکلتی ہے۔ خلاصہ المناقب میں ہے کہ آپ کا سلسلہ نسب ۱۶/واسطوں سے حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے جاملتا ہے۔ حضرت علاؤ الدین سمنانی آپ کے چچا تھے۔ سید علی ہمدانی شاگرد اور مرید شیخ ابوالبرکات تقی الدین علی دوستی کے تھے۔ ان کی وفات کے بعد آپ نے شیخ شرف الدین محمود مزدقانی سے بیعت کی تھی۔(۳)

میر سید علی ہمدانی کے والد ہمدان کے گورنر تھے۔ میر سید علی ہمدانی نے اپنے والد کے منصب سے کوئی دلچسپی نہ دکھائی۔ بچپن میں ہی قرآن حفظ کرلیا۔ اپنی قابلیت، ذاتی تدبر، آہنی ارادوں، حکمت عملی، فراخ دلی اور دور بینی کی وجہ سے آپ نے ابتداء ہی سے ایک اعلیٰ مقام حاصل کرلیا۔ آپ نے سارا وقت دین اسلام کی اشاعت، تبلیغ اور خدمت میں گزارا۔ اس سلسلے میں آپ نے بہت سے ممالک کا سفر کیا۔ جن میں کشمیر بھی شامل

ہے۔ کشمیر میں آپ کو اسلامی خدمات کے پیش نظر ایک بلند مقام حاصل ہے۔ اگر چہ کشمیر میں شاہ ہمدان سے پہلے بھی حضرت بلبل شاہ نے دین اسلام کی روشنی پھیلا دی تھی مگر شاہ ہمدان نے کشمیر میں آ کر ایک انقلاب پیدا کر دیا اور اسلام کی ایسی ساخت قائم کر دی جو آج تک موجود ہے۔ کشمیر میں ان کی وجہ سے تقریباً ۳۷۰۰۰ لوگ مشرب بہ اسلام ہو گئے۔

امیر کبیر میر سید علی ہمدانی نے تین بار کشمیر کا سفر کیا۔ پہلا سفر آپ نے سات سو سادات کے ساتھ سلطان شہاب الدین کے عہد میں ۷۷۴ھ بمطابق ۱۳۷۲-۷۳ء میں کیا۔ اس دور میں آپ نے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی۔ اس وقت تقریباً ۳۷۰۰۰ لوگ مسلمان ہو گئے۔

آپ کے دوسرے سفر کے بارے میں اعجاز الحق قدوسی لکھتے ہیں:

''حضرت علی ہمدانی قطب الدین کے زمانے میں ۷۸۱ھ مطابق ۱۳۸۰ء میں کشمیر جنت بے نظیر تشریف لائے۔ آپ کی کشمیر میں تشریف آوری کی تاریخ نکلتی ہے۔

مقدم شریف او

۷۸۱ھ

شاہ ہمدان کے دوسرے سفر کے بارے میں تاریخ حسن میں لکھا گیا ہے کہ آپ ماہ ربیع الاول ۷۷۴ھ میں شہاب الدین پورہ میں قیام پذیر ہو گئے۔ سید محمد خاوری نے کشمیر میں وارد ہونے کی تاریخ لکھی۔

میر سید علی ہمدانی شہ ہمدان   سیر اقلیم شعبہ کردہ نکو

شد مشرف ز مقدس کشمیر   اہل آں شد از و ہدایت جو
سال تاریخ مقدم او را   گفتم از مقدمہ شریف بجو[۵]

دوسرے دور میں خاص کام مسجدیں تعمیر کرانا اور بدعات کا خاتمہ کرانا تھا اور اہل اسلام کو پکے دیندار بنانا تھا۔

تیسرا اور آخری مرحلہ دعوت اسلامی کی تکمیلی مرحلہ تھا۔ اس وقت امیر کبیر کشمیر کی بدلی ہوئی صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے آئے تھے۔ اس وقت آپ کی تعلیم و تربیت سے کافی لوگ متاثر ہوئے۔ آپ نے لوگوں کی صحیح تعلیم اور تربیت فرمائی۔

تیسرا اور آخری دورہ کرنے کے بعد امیر کبیر میر سید علی ہمدانی انتقال راستے میں وطن واپس جاتے ہوئے ہوا۔ مختلف بدظن اشخاص کے دلوں میں آپ کے کارناموں کی وجہ سے حسد کی آگ بھڑک اٹھی اور آپ کو زہر دلانے کی سازش کی گئی۔ اگر چہ زہر سے شاہ ہمدان کی موت واقع نہ ہوئی مگر صحت پر کافی برا اثر ہوا اور آخر کار ۲۷ سال کے سن میں ۶/ ذی الحجہ ۷۸۶ھ سے ہی آپ کی تاریخ وفات ماخوذ ہے[۶]۔ وہاں سے آپ کی نعش کو ختلان (لولاب) لے جایا گیا جہاں آپ مدفون ہوئے۔ پاکھلی میں جہاں آپ نے وفات پائی تھی ایک خوبصورت اور شاندار خانقاہ تعمیر کی گئی جو اب تک موجود ہے۔ (۷)

شیخ محمد بسواشی نے جو اپنے وقت کے صالحین اور بلند پایہ شعراء میں تھے، آپ کی تاریخ وفات یوں نکالی ہے:

عقل تاریخ سال رحلت او
سید ما علی ثانی گفت
۷۸۶ھ

خانقاہ معلیٰ جو کشمیر کے سرینگر میں واقع ہے۔ اسلامی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے۔ میر سید علی یہاں عبادت کرتے تھے اور نماز پڑھاتے تھے۔ اس کے علاوہ وعظ و تبلیغ فرماتے تھے۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو بھی اس جگہ کا احترام کرتے ہیں۔ اس مقام کا نام علاؤالدین پورہ ہے جہاں سید صاحب پہلی بار تشریف فرما ہوئے تھے۔ ۷۹۸ھ مطابق ۱۳۹۵ء میں ان کے صاحبزادے میر سید محمد ہمدانی نے اس کو تعمیر کرایا تھا۔

کشمیر آنے سے پہلے ہی شاہ ہمدان نے اپنے مشن کو کامیاب بنانے اور کشمیر کی تاریکی کو اجالے میں تبدیل کرنے کا خاص طریقہ اختیار کیا۔ اس سلسلے کی ایک کڑی یہ تھی کہ انہوں نے کچھ رفقاء کو قاصد بنا کر کشمیر روانہ کیا۔ جن میں سید حسین سمنانی جو شاہ ہمدان کے چچا تھے اور سید تاج الدین کے علاوہ سید حسین بہادر بھی شامل ہیں۔ ان حضرات نے حالات کا مشاہدہ کیا اور اس کے بعد حضرت شاہ ہمدان نے کشمیر کا رخ کیا۔ عام لوگوں کے علاوہ جو لوگ شاہ ہمدان کے ساتھ مل گئے ان میں امراء، وزراء اور بادشاہ بھی شامل ہیں۔ چنانچہ دوسری بار جب حضرت شاہ ہمدان کشمیر آئے اس وقت سلطان قطب الدین کشمیر کا بادشاہ تھا۔ ان کا حال یہ تھا کہ محرمات شریعت سے پرہیز نہیں کرتا۔ دو سگی بہنیں بیک وقت اس کے عقد

میں تھیں۔ جناب امیر رحمۃ اللہ علیہ کے ارشاد کے مطابق اس نے بڑی بہن کو مالا مال کر کے طلاق دی اور دوسری بہن سودا کے ساتھ اسلامی شریعت کے مطابق از سر نو نکاح کیا۔ اس کے بطن سے سلطان سکندر اور مہبت خان تولد ہوئے۔ یہ زمانہ اصلاحات کا زمانہ تھا۔(۹)

حضرت میر سید علی ہمدانی نے تمام مسجدوں میں اورادفتحیہ پڑھنے کی اجازت دی۔ میر سید علی ہمدانی نے نہ صرف عملی طور طریقہ اپنا کر اپنا کام پایۂ تکمیل تک پہنچایا بلکہ انہوں نے علمی اور ادبی لحاظ سے بھی اسلام کی سربلندی کے لیے نہایت ہی عظیم کارنامے انجام دئے۔

انہوں نے ۱۷۵ کتابیں اور رسالے تصنیف فرمائے جو عربی اور فارسی ادب کے جوہر پارے اور شعریت، طریقت، معرفت اور حقیقت کے آئینہ دار ہیں۔ سب سے مشہور تصنیف اورادفتحیہ ہے اس میں ایمان، عرفان، علم، توحید، مناجات اور استغفار کے تمام اجزاء موجود ہیں اور اس کا جہری زمزمہ مسلمانوں کی روح کو تازہ کرتا ہے[۱۰]۔ ذخیرۃ الملوک فارسی میں ہے۔ یہ دس ابواب پر مشتمل ہے۔ ۱۳۲۱ھ میں امرتسر سے چھپی، ۱۸۲۵ء میں اس کتاب کا ترجمہ لیٹن (Latin) میں E.F.C Rosenmucner نے کیا، نیز فرانسیسی (French) میں اس کا ترجمہ C.Sainet نے کیا جو ۱۸۲۹ء میں چھپا۔(۱۱)

(۲) رسالہ نوریہ (۳) رسالہ مکتوبات (۴) رسالہ در معرفت صورت وسیرت (۵) رسالہ در حقائق توبہ (۶) حل النصوص علی الفصوص: شرح

فصوص الحکم (۷) شرح قصیدہ، خمرہ، فارضیہ (۸) رسالہ الاصطلاحات، دراصطلاحات تصوف............ رسالہ منہاج العارفین حضرت سید علی ہمدانی کے ارشادات عالیہ اور اقوال حکیمانہ کا گنجینۂ گراں مایہ ہے۔[۱۲] اس کے علاوہ چہل اسرار سے آپ کی شاعری کا ثبوت بھی ملتا ہے۔

میر سید علی ہمدانی ایک جامع شخصیت کے مالک تھے۔ آپ بیک وقت مقرر، مفکر، فلسفی، ادیب، شاعر، علم منطق کے ماہر، نثر نگار، مصنف، مفسر، محدث، فقیہہ بھی مجتہد بھی خطوط نگار بھی اور مضمون نویس بھی تھے۔ روحانی مرشد، شریعت، طریقت اور حقیقت کے اسرار و رموز کے عالم کامل اس کے علاوہ سیاسی لیڈر بھی تھے[۱۳]۔ ان کی سیاحت کی بڑی جولاں گاہ اور سرگرمیوں کا مقام وادی کشمیر رہی ہے اور آپ کو بجا طور پر مرشد کشمیر The Apostle of Kashmir کہا جاتا ہے۔[۱۴]

علامہ اقبال نے جن بلند پایہ مذہبی شخصیات کا تذکرہ اپنی شاعری اور نثر میں کیا ہے ان میں میر سید علی ہمدانی کی عظمت کا اعتراف علامہ نے اپنے کلام میں کیا ہے۔ علامہ اقبال نے میر سید علی ہمدانی کا ذکر نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ اپنی شاعری میں کیا ہے۔

چنانچہ جاوید نامہ (آنسوئے افلاک) میں غنی کاشمیری کے علاوہ میر سید علی ہمدانی کا ذکر ملتا ہے۔ یہاں علامہ مولانا رومی کی معیت میں جنت الفردوس میں پہنچتے ہیں اور وہاں امیر کبیر میر سید علی ہمدانی کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ علامہ نے نہایت ہی فنکارانہ انداز سے دونوں عظیم

المرتبت ہستیوں کا تذکرہ یوں کیا ہے:

شاعر رنگین نوا طاہر غنی　　فقر او باطن غنی ظاہر غنی
نغمہ می خواند آں مست مدام　　در حضور سید والا مقام
سید السادات سالار عجم　　دست او معمار تقدیر امم
تا غزالی درس اللہ ہو گرفت　　ذکر و فکر از دودمان او گرفت
مرشد آں کشور مینو نظیر　　میر و درویش و سلاطین را مشیر
خط را آں شاہ دریا آستین　　داد علم و صنعت و تہذیب دیں
آفرید آں مرد ایران صغیر　　باہنر ہائے غریب و دل پذیر

یک نگاہ او کشاید صد گرہ
خیز و تیرش را بدل را ہے بدہ[15]

علامہ اقبال نے اس نظم میں شاہ ہمدان کا تذکرہ کر کے کشمیر اور کشمیریوں کی حالت کا تذکرہ کیا ہے، چنانچہ علامہ کو اس وطن عزیز سے کافی لگاؤ تھا اس لیے انہوں نے شاہ ہمدان کے حضور میں آتے ہی مسئلہ خیر وشر، مسئلہ کشمیر اور مسئلہ روح بدن کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ شاہ صاحب سے کہتے ہیں اگر چہ انسان کو نیکی کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ تو پھر شیطان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی جو اس چیز سے انسان کو روکتا ہے۔ اس بات کا جواب دیتے ہوئے شاہ ہمدان کہتے ہیں کہ اپنی خودی کو مستحکم کرنے کے لیے شیطانی قوتوں سے لڑنا ضروری ہے تا کہ تیغ خودی کو زنگ نہ لگ جائے۔

خویش را براہر من باید زدن   تو ہمہ تیغ آں ہمہ سنگ فسن
تیز تر شو تا فتد ضرب تو سخت   ورنہ باشی ورد گیتی تیرہ بخت[16]

میر سید علی ہمدانی اور اقبال کے اس سوال و جواب کے بارے میں ڈاکٹر محمد ریاض لکھتے ہیں:

''سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے یہ سوال آخر شاہ صاحب سے ہی کیوں پوچھا۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ شاہ صاحب کی زندگی شیطان اور اس کی قوتوں سے نبرد آزمائی کی امثلہ سے حیرت انگیز طور پر مملو ہے اور دور آخر کے بزرگان دین میں شاید وہ جہاد بالنفس اور جہاد بالانسان کا بہترین نمونہ ہیں۔ ان کی بیشتر تصانیف بھی اس موضوع پر روشنی ڈالتی ہیں''۔ (۱۷)

اقبال اس کے بعد کشمیریوں کی حالت بے عملی، غلامی پسندی اور خود فراموشی کا ذکر کرتے ہیں۔ پھر اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جس کے نتیجے میں وادی کشمیر کو انگریزوں نے صرف پچھتر لاکھ روپیہ میں مہاراجہ کو فروخت کیا تھا۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''یہ ۱۹۳۱ء کی نظم ہے اور اقبال اس نظم کے ذریعے اس وقت کے مسئلہ کشمیر کو باد صبا کے ذریعے سے لیگ آف نیشنز (مجلس اقوام) تک پہنچاتے ہیں۔ ''شاعری جزوے ایست از پیغمبری'' کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہوگی کہ سولہ برس کے بعد یہ مسئلہ واقعی مجلس اقوام متحدہ (United Nations) میں پہنچا ہے۔ دنیائے شاعری میں کوئی پیشن گوئی کا قائل ہو یا نہ ہو لیکن اقبال

کی شاعری میں اس قسم کی مثالیں دیکھ کر اس مصرعے

دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں
پر ایمان لائے بغیر چارہ نہیں''[۱۸]

اس نظم میں علامہ اقبال نے کشمیر کی حالت کا ذکر یوں کیا ہے:

باد صبا اگر جینوا گزر کنی
حرفے زما بہ مجلس اقوام باز گوے
دہقان و کشت و جوئے خیابان فروختند
قومے فروختند و چہ ارزاں فروختند[۱۹]

مذکورہ نظم میں شہاب الدین کا ذکر کر کے کشمیر کی گزشتہ عظمت کو بیان کیا گیا ہے۔

مسئلہ کشمیر کے بعد ''مسئلہ روح و بدن'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسانی وجود کی خاطر اس مسئلہ کو ضروری قرار دیا گیا ہے اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ روح کی تربیت کے لیے بدن کو کافی محنت کرنی چاہیے۔ علامہ اقبال نے واضح کر دیا ہے کہ جسم کے بجائے روح کی تربیت اور ترقی کی کوشش کرنی چاہیے۔ خدا کی راہ میں جان دینے سے ہی روح ہمیشہ زندہ رہ سکتی ہے اور انسان ہمیشہ کی زندگی پا لیتا ہے۔ روح کی بیداری سے ہی انسان کی تقدیر بدل سکتی ہے۔

تاز جان بگذشت جانش جان اوست
ور ز جانش یک دو دم مہمان اوست[۲۰]

آخر پر علامہ اقبال شاہ ہمدان سے ایک سوال کرتے ہیں کہ خراج

کس پر جائز ہے اور تخت و تاج کی اصلیت کیا ہے:

ما فقیر و حکمراں خواہد خراج چیست اصل اعتبار تخت و تاج [21]

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے شاہ ہمدان فرماتے ہیں:

فاش گویم با تو اے والا مقام باج راجز بادو کس دادن حرام
یا اولی الامرے کہ منکم شان اوست آیۂ حق حجت و برہان اوست
یا جواں مردے چو صرصر تند خیز شہر گیرو خویش باز اندر ستیز
روز کین کشور کشا از قاہری روز صلح از شیوہ ہائے دلبری
می تواں ایراں و ہندوستان خرید پادشاہی راز کس نتواں خرید
جام جم را اے جوان با ہنر کس نگیر داز دکان شیشہ گر
در بیگرد مال او جز شیشہ نیست شیشہ را غیر از شکستن پیشہ نیست [22]

غرض ان مسائل کا حل پیش کر کے علامہ اقبال نے شاہ ہمدان کے تیئں اپنی عقیدت اور احترام کا ذکر کیا ہے۔

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ کاشمیری

وادیٔ کشمیر نے جن عظیم المرتبت شخصیات کو جنم دیا ہے۔ ان میں حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری کو ایک اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ مولانا انور شاہ ۲۷/شوال المکرّم ۱۲۹۲ھ بروز شنبہ بوقت صبح اپنے ننہال، بمقام دودھواں (علاقہ لولاب) کشمیر میں پیدا ہوئے۔[1] عبد الرحمان کوندو آپ کی پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

فخر المحدثین حضرت علامہ انور شاہ ۲۷ شوال المکرّم ۱۲۹۲ھ مطابق ۱۷/اکتوبر ۱۸۷۵ء بروز شنبہ بوقت سحر اپنے ننہال موضع دودھواں علاقہ لولاب میں تولد ہوئے۔[2] آپ کے والد کا نام پیر معظم شاہ اور والدہ کا نام مال دیدی تھا۔

کلیم اختر آپ کی پیدائش کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مولانا انور شاہ شیخ مسعود نروری کی ساتویں پشت میں تھے۔ آپ کا خاندان بغداد سے ہجرت کرکے برصغیر ہندو پاک اور تھوڑے ہی عرصہ میں ملتان اور لاہور میں قیام کرکے آخر کشمیر میں سکونت پذیر ہوگیا۔ چنانچہ آپ کی ولادت سے کافی عرصہ پہلے یہ خاندان کشمیر میں

رہ رہا ہے وہیں ایک قریہ دودھواں (لولاب) کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا انور شاہ ۲۷ر شوال ۱۲۹۷ھ (لولاب) کو آپ کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ مولانا انور شاہ ۲۷ر شوال ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۸۷۵ء کو پیدا ہوئے۔ (۳)

علامہ انور شاہ کی تعلیم و تربیت گھر میں ہی ہوئی۔ آپ کے والد محترم محمد معظم شاہ بن عبد الکبیر نے آپ کو محنت اور لگن سے تعلیم دی اور ابتدائی تعلیم کے ساتھ قرآن حکیم بھی پڑھایا۔ چنانچہ چھ برس کی عمر میں آپ نے قرآن شریف حفظ کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ زبان فارسی کے چند رسائل بھی پڑھ لیے۔ آپ کی ذہنی و علمی تعلیم و تربیت اور علوم شرقیہ سے آگاہی میں مولانا عبد الجبار اور مولوی غلام محمد کا بھی حصہ ہے۔ اول الذکر فارسی کے عالم تھے اور موخر الذکر زبان عربی اور علوم فارسی کے علاوہ دینی مسائل پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ان اساتذہ کی صحبت نے مولانا کے دل میں مزید علم حاصل کرنے کا شوق پیدا کیا اور پھر یہی شوق انہیں وطن کی بہاروں سے وداع کر کے دیار غیر میں لے گیا۔ (۴)

مولانا نے سب سے پہلے کاکول ہزارہ میں قیام کیا۔ یہاں مختلف علماء کرام سے علم صرف و نحو، فقہ، منطق کے اسباق پڑھے۔ کاکول سے استفادہ کرنے کے بعد ۱۸۹۳ء میں دار العلوم دیوبند چلے گئے۔ یہاں آپ نے کافی محنت کی۔ اساتذہ نے آپ کی کافی قدر کی اور بقول محمد الدین فوق اہل دیوبند کو گوڑی کے اس لعل کی بات معلوم ہوا کہ یہ سنگریزہ

نہیں بلکہ لعل بدخشاں ہے تو وہ ان کی تعلیم وتربیت کا خاص خیال رکھنے لگے۔(۵)

دارالعلوم دیوبند میں جن علماء وفضلاء نے آپ کی تعلیم وتربیت میں حصہ لیا، ان میں خاص طور سے مولانا الحافظ خلیل احمد صاحب سہارنپوری، شیخ الحدیث محمود الحسن، محمد اسحاق امرتسری، مولانا حبیب الرحمٰن دیوبندی قابل ذکر ہیں۔ تعلیم وتربیت سے فراغت حاصل کرنے کے بعد آپ نے درس وتدریس کا مشغلہ اختیار کیا۔ اس سے پہلے آپ گنگوہ تشریف لے گئے جہاں آپ نے مولانا عبدالرشید گنگوہی سے حدیث کی سند لی اور ان سے بیعت کر کے رخصت ہوئے۔ آپ نے دہلی کے مدرسہ امینیہ میں جو ان کے دوست مولانا محمد امین صاحب نے قائم کیا تھا۔ مدرس اعلیٰ مقرر ہوئے۔ یہاں آپ بارہ برس تک درس وتدریس میں مصروف رہے۔

۱۹۰۳ء میں بڑے بھائی کی وفات پر آپ کشمیر آئے۔ والدین نے واپس جانے اجازت نہ دی۔ یہاں آپ کی شاگردی میں ہزاروں طالب علم رہے۔ جس کے باعث آپ عوام الناس میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے۔ آپ کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ۱۹۰۶ء میں آپ حجاز گئے اور فریضہ حج ادا کیا۔ چند رفقاء بالخصوص بارہمولہ کے رئیس عبدالصمد ککرو کے ہمراہ بلاد اسلامیہ کی سیر کو گئے۔ حجاز، مصر، طرابلس اور بصرہ کی سیاحت کی۔ اس سفر کے دوران آپ نے دنیائے اسلام کے بعض مستند عالموں سے بھی دینی علوم پر سندات حدیث حاصل کیں۔ آپ نے حرمین

شریفین میں قیام کے دوران وہاں کے کتب خانوں کو بھی کھنگالا۔ سید اسد اللہ شاہ دوار کی راوی ہیں کہ جب آپ مصر میں پہنچے تو آپ نے وہاں ایک نادر دینی کتاب دیکھی جس کا دنیا بھر میں صرف ایک ہی نسخہ تھا۔ شاہ صاحب نے لائبریرین سے کتاب پڑھنے کی درخواست کی جو اس نے منظور کر لی۔ آپ نے کتاب کو بغور پڑھا اور پھر اپنی بے پناہ قوت حافظہ اور یادداشت کی بناء پر تحریر کر لیا، اصل کتاب سے جب اس کا متن ملایا گیا تو اس میں ایک غلطی بھی نہ تھی۔ (۶)

کشمیر میں آپ نے سفر حج سے واپسی پر اپنے رفیق خواجہ عبدالصمد ککرو کے اسرار پر ایک مدرسہ ''فیض عام'' قائم کیا اور یہ مدرسہ تین سال تک چلاتے رہے لیکن اپنے ہم وطنوں کی مایوسی نے انہیں پھر دیوبند تشریف لے جانے پر مجبور کیا۔ محمد الدین فوق مشاہیر کشمیر میں لکھتے ہیں:

''میں نے دیوبند کی نسبت جہاں بہت سے اور علماء دارالعلوم میں کام کر رہے ہیں کشمیر کے زیادہ حقوق عرض کئے۔ جہاں چاروں طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کوئی ایسا آدمی پیدا کیجئے جو ہماری باتیں سن سکے ہمیں خدمت وطن سے کوئی انکار نہیں''۔ (۷)

۱۹۱۰ء میں آپ فضلائے دارالعلوم کے جلسہ دستار بندی میں شرکت کے لیے دیوبند گئے۔ شیخ الہند نے درس و تدریس کے فرائض پر مامور کر دیا۔ کوئی معاوضہ قبول نہ کیا۔ منتظمین نے چاہا کہ آپ کم از کم کوئی معاوضہ لے لیں مگر آپ راضی نہ ہوئے البتہ حافظ احمد صاحب مہتمم

دیوبند کے اصرار پر دونوں وقت ان کے ساتھ طعام میں شرکت کرنا قبول کرلیا اور دارالعلوم کے احاطے میں ایک مختصر سے حجرے میں جو رہائش کے لیے مل گیا تھا آپ خود بھی دینی مسائل پر غور وفکر کرتے رہے اور دوسروں کو بھی فیضیاب کرتے رہے۔

۱۹۱۵ء کو شیخ الہند نے سفر حجاز اختیار کیا اور آپ کو شیخ الحدیث کی منصب پر فائز کر کے اپنا جانشین بنایا۔ چالیس یا اکتالیس سال کی عمر میں آپ اس منصب اعلیٰ پر فائز ہوئے اپنی قابلیت اور عبادت گزاری کے سبب مولانا نے جلد ہی اپنا مقام علماء کرام کی صف اول میں پیدا کرلیا۔ ان کے ہم عصران کی دینی فضیلت اور علمی صلاحیت کے اتنے قائل ہوئے کہ کسی نے ''بخاری وقت'' کے نام سے پکارا، کسی نے ''ابوحنیفہ ثانی'' کے لقب سے۔(۸)

آخر کار ناخوشگوار واقعہ پیش آیا کہ شاہ صاحب اپنے بہت سے ساتھیوں اور ۲۷۵ طلباء سمیت دار العلوم دیوبند سے علاحدہ ہونے اور دیوبند کے بجائے آپ نے سرزمین ڈابھیل کو اپنے فیوض و برکات کا مرکز بنایا بقول محمد منظور نعمانی بظاہر یہ واقعہ بہت ہی نامبارک تھا لیکن اللہ تعالیٰ کی حکمت اور رحمت نے اس شر سے یہ خیر پیدا فرمایا کہ ڈابھیل ضلع سورت (گجرات) کے ایک معمولی سے مدرسہ تعلیم الدین کے ذمہ داروں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو ہندوستان کا دوسرا دارالعلوم دیوبند یا جامعہ اسلامیہ بنانے کا فیصلہ کرلیا۔(۹)

مولانا انورشاہ نے دینی خدمات کے پیش نظر ۴۴ برس کی عمر تک شادی نہ کی۔ بالآخر آپ صحت کی خرابی کی وجہ سے دیوبند پہنچے اور وہاں ۲۹ رمئی ۱۹۳۳کو انتقال کر گئے۔

علامہ انورشاہ کے انتقال پر مختلف اشخاص نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ نامور محدث علامہ راہد بن الحسن الکوثری کی شہادت ہے۔

''علامہ ابن الہمام متوفی (۸۶۱ھ) کے بعد انورشاہ کشمیری کا پایہ کوئی دوسرا شخص پیدا نہیں ہوا جو متن حدیث سے نئے نئے مباحث و نکات کے استنباط و استخراج کی اہلیت رکھتا ہو اور یہ وقفہ شاہ صاحب اور ابن ہمہام کے درمیان کوئی معمولی وقفہ نہیں ہے۔'' (۱۰)

علامہ انورشاہ نے بہت ساری کتابیں تصنیف کی ہیں جن کی فہرست لمبی ہے ان کی وفات پر شبیر احمد عثمانی نے ان کی عظمت یوں بیان فرمائی:

''میں محسوس کر رہا ہوں کہ حافظ ابن حجر، شیخ تقی الدین اور سلطان العلماء کا انتقال آج ہو رہا ہے''۔ (۱۱)

سید سلیمان ندوی نے لکھا:

''مرحوم کم سخن لیکن وسیع النظر عالم تھے۔ ان کی مثال اس سمندر کی سی تھی جس کے اوپر کی سطح ساکن لیکن اندر کی سطح موتیوں کے گراں قیمت خزانوں سے معمور ہوتی ہے۔ وہ وسعت نظر قوت حافظ اور کثرت حفظ میں اس عہد میں بے مثال تھے۔ علم وحدیث کے حافظ و نکتہ شناس، علوم وادب میں بلند پایہ، معقولات میں ماہر، شعر وسخن سے

بہرہ مند اور زہد وتقویٰ میں کامل تھے‘‘۔(۱۲)

علامہ انور شاہ ایک عظیم المرتبت شخصیت تھی۔ مولانا مرحوم نہایت ہی خوبرو اور وجیہہ تھے۔قوت حافظ بے پناہ تھا۔شخصیت جاذب نظر بھی تھی اور پرکشش بھی جو کوئی ایک بار دیکھ لیتا پھر نظریں چہرے سے نہ اٹھاتا۔ باتیں بہت کم کرتے لیکن ہر بات سے وقار ٹپکتا تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنتے تھے۔ کھانے پینے کے معاملے میں جو چیزیں زیادہ پسند آجاتی اسے سیر ہو کر کھاتے جاتے تھے۔ طبیعت شگفتہ تھی اور جان محفل تھے اپنی کم گوئی کے باوجود بڑی پیاری اور پرلطف باتیں کرتے تھے۔ ایک بار سبق پڑھا رہے تھے کہنے لگے چلو اپنے گھر کا راستہ لو۔ بھائی شمس الدین ہی چلے گئے ہیں۔ پڑھنے والوں نے حیرانی سے پوچھا کون شمس الدین؟ تو ڈوبتے ہوئے سورج کی طرف اشارہ کر کے کہا جاہلو! دیکھتے نہیں وہ بھائی شمس الدین رخصت ہو رہے ہیں۔ اندھیرے میں پڑھ کر کیا کرو گے اس میں تو لطف نہیں آئے گا۔(۱۳)

اشرف علی تھانوی لکھتے ہیں:

’’ایک انگریز کا قول تھا کہ اسلام کی حقانیت کا اس لیے قائل ہوا کہ غزالی جیسا مدبر اسلام کو حق سمجھتا ہے میں کہتا ہوں جب انور شاہ ایسا محقق اور مدقق عالم اسلام کو حق سمجھتا ہے تو میرے نزدیک اسلام کی حقانیت کی یہ ایک بڑی دلیل ہے‘‘۔(۱۴)

دیگر مشاہیر کی طرح علامہ اقبال نے مولانا انور شاہ کا بھی ذکر نہایت

ہی عقیدت کے اور احترام کے ساتھ کیا ہے۔اس کے علاوہ علامہ اقبال نے مولانا انور شاہ کاشمیری سے کچھ فیض بھی حاصل کیا۔

عبدالصمد صارم لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر اقبال مرحوم خود بڑے پایہ کے فلسفی تھے۔فلسفہ قدیم و جدید پر ان کی یکساں نظر تھی۔علوم جدید میں ان کو کمال حاصل تھا۔لیکن وہ شاہ صاحب کے نگاہ التفات کے خواستگاروں میں سے تھے۔ڈاکٹر اقبال مرحوم نے شاہ صاحب سے بہت کچھ فیض حاصل کیا اور اس کا اعتراف انہوں نے خود بھی کیا ہے۔''(۱۵)

''دیوبند کی عہد ساز شخصیتیں'' میں ضیاء الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں:

''انہیں کے متعلق علامہ اقبال نے کہا تھا کہ اس وقت روئے زمین پر انور شاہ سے بڑا کوئی عالم نہیں''۔(۱۶)

علامہ اقبال نے انور شاہ کے تعزیتی اجلاس میں خود کہا:

''اسلام کی ادھر کی پانچ سو سالہ تاریخ شاہ صاحب کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے''۔ [۱۷] علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ کے ابتدائی تعلقات کا باقاعدہ آغاز اکتوبر ۱۹۲۱ء میں ہوا۔محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں سیاسی طور پر ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۲ء تک کا زمانہ بڑے ابتلاء کا زمانہ تھا۔چنانچہ جمعیۃ العلماء دیوبند نے تجویز کیا کہ ایک عام جلسہ ان سیاسی حالات کے تحت کیا جائے،اس کے روح رواں اور ہر دلعزیز مولوی عبدالقادر قصوری وکیل تھے اور یہ عظیم الشان جلسہ اکتوبر ۱۹۲۱ء میں

لاہور کے پریڈ ہال میں منعقد ہوا جو موجودہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے عقب میں ہے راقم نے اتنے علماء دین کا مجموعہ پھر نہیں دیکھا اور نہ آج تک ایسا جلسہ ہی ہوا جس کی صدارت مولانا ابوالکلام آزاد نے کی تھی مجھے خوب یاد ہے کہ اس جلسہ کے افتتاح پر قرأت مولانا ظاہر دیوبندی نے کی تھی اور صدر مولانا آزاد کی تجویز کی تائید میں کئی علماء نے تقریریں کی تھیں مگر وہ تقریر جو مرحوم مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا فاخر کانپوری کی تھی۔ وہ ایک شاہکار تھی۔ خطبہ صدارت کو مولانا آزاد نے خود اور کچھ حصہ کو مولانا عبد الرزاق ملیح آبادی اور کچھ حصہ کو مولانا عبدالحلیم انصاری نے پڑھا تھا اسی جلسہ میں اول مرتبہ میں نے خود اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیری کا تعارف کرایا تھا''۔(۱۸)

علامہ اور انور شاہ کی ملاقاتوں کا جو سلسلہ یہاں شروع ہوا وہ تادم آخر قائم رہا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو کافی خطوط بھی لکھے۔ علامہ اقبال کی خواہش مولانا انور شاہ کو لاہور بلانے کی تھی۔ جس کا ذکر انہوں نے اکبر آبادی کے نام ایک خط میں کیا ہے۔

''یہاں لاہور میں ضروریات اسلامی سے ایک تنفس بھی آگاہ نہیں۔ یہاں انجمن اور کالج اور فکر مناسب کے سوا اور کچھ نہیں۔ پنجاب میں علماء کا پیدا ہونا بند ہو گیا ہے۔ صوفیاء کی دکانیں ہیں مگر وہاں سیرت اسلامی کی متاع نہیں بکتی''۔(۱۹)

علامہ اقبال مولانا انور شاہ یا سید سلیمان ندوی کو اسلامی خدمات کے

لیے لاہور بلانا چاہتے تھے مگر دونوں شخصیات میں ایک بھی اس کام کے لیے اس وقت تیار نہ تھا حالانکہ علامہ نے مولانا انور شاہ کے آنے کے لیے انتظامات بھی کیے تھے۔ محمد عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں:

''ایک مرتبہ علامہ سید انور شاہ صاحب لاہور میں تشریف لے آئے اور راقم کے مکان کے قریب تکیہ سادھواں (اندرونی موچی دروازہ رنگ محل لاہور) پیر عبدالغفار شاہ ۲؍ جمادی الثانی ۱۳۴۰ کے ہاں مہمان تھے اس وقت ادھر آپ کی موجودگی میں علامہ نے ہر دو متذکرہ بالا انجمنوں [۲۰] سے معاملہ فہمی بھی کر لی تھی کہ اگر آپ یہاں بھی تشریف لے آئیں تو آپ خطیب بادشاہ مسجد اور ادھر اسلامیہ کالج میں علوم دین اسلام کے سربراہ ہوں گے''۔(۲۱)

۱۳؍ مارچ ۱۹۲۵ء کو علامہ اقبال نے مولانا انور شاہ کو ایک خط لکھا۔ اقبال نامہ میں اس خط کی تاریخ ۱۹۳۵ء درج ہے مگر علامہ انور شاہ کا انتقال ۱۹۳۳ء کو ہوا اس لیے یہ سن ۱۹۲۵ء صحیح ہے۔[۲۲] اس موقعہ پر علامہ انور شاہ انجمن خدام الدین کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور آئے تھے علامہ نے انہیں خط میں لکھا:

مخدوم و مکرم حضرت قبلہ مولانا السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ!

''مجھے ماسٹر عبداللہ صاحب سے ابھی معلوم ہوا کہ آپ انجمن خدام الدین کے جلسہ میں ابھی تشریف لائے ہیں اور ایک دو روز قیام فرماویں گے۔ میں اسے اپنی بڑی سعادت تصور کروں گا۔ اگر آپ کل

شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے
حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب قبلہ عثمانی حضرت مولوی بشیر احمد
صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت یہی التماس
ہے مجھے امید ہے کہ جناب اسے عریضے کو شریف قبولیت بخشیں گے۔
آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لیے سواری یہاں سے بھیج دی جائے
گی۔'' (۲۳)

علامہ انور شاہ صاحب نے جب دارلعلوم دیو بند سے استعفیٰ دیا تو علامہ اس بات پر خوش ہوئے کہ اب مولانا انور شاہ کو لاہور بلایا جاسکے گا کیونکہ ان کے خیال میں فقہ کی جدید تدوین کے لیے مولانا انور شاہ صاحب سے زیادہ کوئی دوسرا عالم اس وقت موجود نہیں۔اس بارے میں مولانا سعید اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''دارالعلوم دیو بند میں اختلافات کے باعث حضرت لاستاد نے اپنے عہدہ صدر الساتذہ سے استعفیٰ دیا اور یہ خبر اخبارات میں چھپی تو اس کے چند روز بعد ایک دن ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا فرمانے لگے۔آپ کا اور باقی مسلمانوں کا جو بھی تاثر ہو بہر حال شاہ صاحب کے استعفیٰ کی خبر پڑھ کر بہت خوش ہوا ہوں میں نے بڑے تعجب سے عرض کیا۔کیا آپ کو دارالعلوم دیو بند کے نقصان کا کچھ ملال نہیں؟ فرمایا کیوں نہیں مگر دارالعلوم کو تو صدر المدرسین اور بھی مل جائیں گے اور یہ جگہ خالی نہ رہے گی۔لیکن اسلام کے لیے جو کام میں

شاہ صاحب سے لینا چاہتوں ہوں اس کوسوائے شاہ صاحب کے کوئی دوسرا انجام نہیں دے سکتا۔اس کے بعد اس اجمال کی تفصیل یہ بیان کی کہ آج اسلام کی سب سے بڑی ضرورت فقہ کی جدید تدوین ہے جس سے زندگی کے ان سینکڑوں ہزاروں مسائل کا صحیح اسلامی حل پیش کیا گیا ہو جن کو دنیا کے موجودہ قومی اور بین الاقوامی سیاسی، معاشی اور سماجی احوال وظروف نے پیدا کر دیا ہے۔ مجھ کو پورا یقین ہے کہ اس کام کے لیے میں اور شاہ صاحب دونوں مل کر ہی کر سکتے ہیں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی شخص اس وقت عالم اسلام میں ایسا نظر نہیں آتا جو اس عظیم الشان ذمہ داری کا حامل ہو سکے۔ پھر فرمایا یہ مسائل کیا ہیں؟ ان کا سر چشمہ کیا ہے میں ایک عرصہ سے ان کا بڑے غور سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ یہ سب مسائل میں شاہ صاحب کے سامنے پیش کر دوں گا ان کا صحیح اسلامی حل کیا ہے یہ شاہ صاحب بتائیں گے اس طرح ہم دونوں کے اشتراک و تعاون سے فقہ جدید کی تدوین عمل میں آجائے گی۔'' (۲۴)

اگر چہ دونوں بزرگوں کی خط و کتاب پوری طرح معلوم نہیں مگر پھر بھی یہ خطوط دونوں شخصیات کے درمیانی تعلقات کی پوری عکاسی کرتے ہیں۔ اگر چہ مولانا انور شاہ لاہور نہ آسکے مگر پھر بھی علامہ اقبال نے مختلف مسائل پر ان کو خطوط لکھے اور حل طلب مسائل سے استفادہ کرتے رہے۔

ان کے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط سوالات وشبہات سے پر

آتے تھے اور حضرت ان کے شافعی جوابات لکھتے جس سے ان کے قلب کی راہ بنتی چلی گئی''۔(۲۵)

جب مولانا کا رسالہ ''ضرب الخاتم علی حدوث العالم'' چھپا تو اس کا ایک نسخہ اقبال کو بھی بھیجا۔ یہ چار سو اشعار کا منظوم رسالہ ہے جس میں علم کلام و فلسفہ کے معرکۃ الآراء موضوع ''حدوث عالم'' پر دلائل قائم کیے ہیں۔اقبال نے اسے بہت پسند کیا۔اس بارے میں سعید احمد اکبر آبادی لکھتے ہیں:

''انور شاہ کا رسالہ پڑھ کر دنگ رہ گیا ہوں کہ رات دن قال اللہ اور قال رسول ﷺ سے واسطہ رکھنے کے باوجود فلسفہ میں بھی ان کو اس درجہ درک و بصیرت اور اس کے مسئلہ پر اس قدر گہری نگاہ ہے کہ حدوث عالم پر اس رسالہ میں انہوں نے جو کچھ لکھا دیا ہے حق یہ ہے کہ آج یورپ کا بڑے سے بڑا فلسفی بھی اس مسئلہ پر اس سے زیادہ نہیں کر سکتا''۔(۲۶)

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ کے درمیان زمان و مکان کی تحقیق کے موضوع پر بھی خط و کتابت ہوئی ہے۔اس بارے میں مولانا محمد شاہ انور لکھتے ہیں:

''............سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے ایک پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ حضرت شاہ صاحب کے احسان کا ڈاکٹر صاحب اس سلسلے میں ذکر فرما رہے تھے کہ انہوں نے ایک مجلس میں حضرت شاہ صاحب

سے زمان ومکان کی تحقیق کے متعلق استفسار فرمایا تو حضرت نے اس پر ایک مبسوط تقریر فرمانے کے بعد علامہ عراقی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ (فارسی) غایۃ البیان فی تحقیق الزمان والمکان کی طرف متوجہ فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب فرمارہے تھے کہ میں نے شاہ صاحب سے عرض کی کہ یوروپین محققین نے اسکی پوری تحقیق کی ہے۔ چنانچہ نیوٹن پہلا محقق ہے جس نے اس پر بسیط سے بحث کی ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ میں نے نیوٹن کے بیس کے قریب تصانیف دیکھی ہیں زمان ومکان پر جو کچھ لکھا ہے وہ علامہ عراقی کے مذکرۃ الصدر رسالہ سے لیا ہے لیکن حوالہ نہیں دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی متعجب ہوئے اور اس رسالہ کا اشتیاق ظاہر فرمایا۔ حضرت نے دیوبند جاکر وہ رسالہ ڈاکٹر صاحب کے پاس ارسال فرمادیا''۔(۲۷)

علامہ اقبال نے اس بارے میں خود لکھا ہے:

''مشہور حدیث لا تسبو الدھر ان الدھر ھو اللہ میں (دھر بمعنی Time) کا جو لفظ آیا ہے اسکے متعلق مولوی سید انور شاہ صاحب سے جو دنیائے اسلام کے جید ترین محدثین وقت میں سے ہیں میری خط وکتابت ہوئی''۔(۲۸)

اقبال اور انور شاہ کی آخری ملاقات اگست ۱۹۳۲ء میں ہوئی، مقدمہ بہاؤلپور کے سلسلے میں مولانا ۱۹/اگست ۱۹۲۲ء کو یہاں پہنچے۔ ۲۵/اگست کو ان کا بیان شروع ہوا جو متواتر پانچ روز تک جاری رہا۔ اس دوران لاہور

میں دو روز قیام کیا۔ جامع آسٹریلیا میں صبح کی نماز کے بعد وعظ کرتے جن میں دیگر لوگوں کے علاوہ اقبال بالخصوص حاضر ہوتے۔[29] یہ سفر مولانا نے بیماری کے دوران کیا۔ اس دوران ختم نبوت اور رد قادنیت پر حضرت کا بیان ہوا۔ ڈاکٹر صاحب پر اس قدر اثر ہوا کہ ردقانیت کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب کا آخری دور کا کلام نظم ونثر اردو و فارسی ان حقائق کی ترجمانی کر رہا ہے ردقادیانیت میں نہایت بلند پایہ مضامین سپرد قلم فرماتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے انجمن حمایت اسلام لاہور سے انجمن کے کالج اور تمام اسکولوں سے قادیانی لاہوری تمام ملازم برطرف کرائے۔ یہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کھلی کرامت ہے۔(۳۰)

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ کے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے محمد ازہر شاہ لکھتے ہیں:

''علامۃ العصر مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے اقبال کے تعلقات کی ابتداء ۱۹۲۴ء میں ہوئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال ۱۹۳۳ء تک یہ تعلقات قائم رہے اس عرصہ میں انہوں نے خط و کتابت کے ذریعہ بھی حضرت علامہ انور شاہ کشمیری سے استفسار کیا۔ مسئلہ وحدت الوجود، وحدت الشہو د، زمان ومکان، ختم النبوت، قرآن کے اعجاز کلام اور ایسے بہت سے مسائل پر انہوں نے تحریری طور پر حضرت رحمۃ اللہ علیہ سے بار بار استفسارات کئے اور حضرت علامہ نے انہیں اطمینان بخش جوابات دئے۔ افسوس کہ دونوں کی یہ طویل خط و

کتابت محفوظ نہ رہی ورنہ کلام اقبال کے شائقین کے سامنے علم ونظر کی نئی وادیاں اور خوش منظر سبزہ زار سامنے آتے۔ حضرت علامہ انور شاہ صاحب سال میں ایک دو دفعہ کشمیر آتے جاتے۔ پنجاب کے متعدد شہروں لاہور، راولپنڈی، گوجرانوالہ، ملتان، گجرات، لدھیانہ فردکش ہوتے ہوئے لاہور میں آپ کا قیام کئی کئی دن رہتا اور ان مواقع پر علامہ اقبال بڑی نیازمندی کے ساتھ حضرت علامہ کی مجلس میں حاضری دیتے اور ان کی تحقیقات علمیہ اور انفاس قدسیہ سے اپنے دل وضمیر کو منور کرتے تھے۔ اقبال کے سوانح نگار ڈاکٹر سید محمد عبداللہ، میاں امیر الدین، پروفیسر یوسف سلیم چشتی وغیرہ نے اپنی اپنی کتابوں میں ان ملاقاتوں کا حل بیان کیا ہے''۔(۳۱)

❀❀❀

علامہ اقبال اور گورونانک

سکھ مذہب کے بانی گورونانک (۱۴۶۹۔۱۵۳۹ء) اپنے گاؤں تلونڈی میں پیدا ہوئے۔ان کے باپ کا نام مہتا کلیان داس بیدی تھا۔ (تلونڈی بعد میں گورونانک کے نام پر ننکانہ صاحب کے نام سے مشہور ہوا۔اب یہ مغربی پاکستان میں ہے) نانک کے باپ اس گاؤں میں غالباً پٹواری تھے۔تلونڈی جولاہور سے تقریباً ۴۰ میل دور تھااور آج بھی موجود ہے۔اس کی زیادہ تر آبادی مسلمانوں پر مشتمل تھی۔اس طرح گورونانک نے مسلم ثقافت کے ماحول میں نشوونما پائی۔بعض مسلم ماخذوں سے پتہ چلتا ہے کہ گورونانک کو ابتدائی تعلیم ایک مسلمان سید حسن نے (جو نانک کے پڑوسی تھے) دی تھی۔وہ نوجوان نانک پر بہت شفقت کرتے تھے اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔نانک نے انہیں کے اثر سے تصور توحید کو اپنایا۔(۱)

سکھ مذہب کی ابتداء کے بارے میں مختلف نظریات سامنے آتے

ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں خوشونت سنگھ لکھتے ہیں:

"Sikhism was born out of a wedlock betwen Hinduism and Islam after they had known each other for a period of nine hundred years. But once it had taken birth it began to develop a personality of its own and in due course grew into a faith which had some semblance to Hinduism, some to Islam, and yet had features which born not resemblance to either."(2)

گورونانک نے جس سکھ مذہب کی بنیاد ڈالی اس کو باقی گرووں نے اور بھی مستحکم بنایا۔ مذہب کے لیے نئی روایتیں اور رواج بنائے۔ گروانگد نے پنجابی زبان کے لیے سنسکرت کے بجائے گورمکھی رسم الخط ایجاد کیا۔ گروامرداس نے پیدائش اور موت کے لیے نئی رسمیں ایجاد کیں۔ گوارجن نے امرتسر میں سکھوں کے لیے ایک گردوار تعمیر کیا۔ گروگوبند نے سکھوں کے لیے پانچ چیزیں کڑا، کچھا، کرپان، کیس اور کنگھا لازمی قرار دیئے۔ اسلام اور سکھ مذہب پر تبصرہ کرتے ہوئے حفیظ ملک لکھتے ہیں:

''اسلام اور سکھ مذہب کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ بات منکشف ہوگی کہ سکھ مذہب کے بنیادی عقائد ہندو مذہب کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ قریب ہیں۔ سکھ مذہب کی نمایاں خصوصیات پر نظر ڈالنے سے اس حقیقت کی تائید ہوتی ہے''۔(۳)

سکھ مذہب کے بانی گورونانک نے خالص توحید کی تبلیغ اسی طرح کی جس طرح پیغمبر اسلام ﷺ نے دی۔ گورونانک نے ذات پات اور چھوت چھات کی مخالفت کی وہ مساوات پر زور دیتے ہیں۔ یہ اصول

قرآنی تعلیمات کے پیشِ نظر بیان کئے گئے ہیں۔

قرآن کریم کے سورۂ اخلاص میں توحید الٰہی کے بارے میں وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

1) Say! He, Allah is one
2) Allah is He on whon all depend
3) He gets not, nor is He begotten.
4) And none is like him(4)

گورونانک نے توحید کے تصور کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے:

There is non other God but
The one manifesting Supreme being
The eternal (is His) Name
(He is) The Indwelling Creative Person
Devoid of fear, without ill will
The timeless being, unborn, self existent.
The Guru's Grace (is also He) (5)

گورونانک نے توحید کی تعلیم دیتے ہوئے بت پرستی کی مخالفت کی ہے۔ انہوں نے خدا کو صرف حق سمجھا۔ وہ خدا کا وجود کائنات کے پہلے اور کائنات کے بعد بھی مانتے ہیں۔ یہ وجود خدا کا نانک کے مطابق ہمیشہ قائم رہے گا۔ قرآن کریم کے سورۂ حدید میں خدا کے بارے میں آیا ہے:

In the name of Allah, The Benificent the merciful
What ever is in the heaens and the Earth declares,
The glory of Allah and he is the mighty, The Wise,
He is the first and the last and the manifest and
the hidden and He is Knower of all Things.(6)

کلام اقبال میں گرونانک کا ذکر توحید کے حوالے سے ہی ملتا ہے۔ علامہ اقبال نے نہایت ہی عقیدت اور احترام کے ساتھ گرونانک کا ذکر

اپنے کلام میں کیا ہے۔علامہ نے اپنے کلام میں گورونا ک کا ذکر اسی توحید پرستی کی وجہ سے کیا ہے اور انہوں نے گورونا نک کے ان ہی اصولوں کی وضاحت کی ہے جو مذہب اسلام سے میل کھاتے ہیں۔نا نک کے علاوہ علامہ نے بدھ مت، ہندو مذہب اور دیگر مذاہب کی شخصیات کا بھی ذکر اپنے کلام میں کیا ہے۔ دراصل علامہ کو مختلف مذاہب کی ان بلند پایہ شخصیات سے اس لیے عقیدہ تھا کیونکہ ان شخصیات نے عظمت انسانی کے اصولوں کی پیروی کی ہے۔عظمت انسانی کے یہ اصول علامہ نے جس شخص میں بھی بغیر رنگ ونسب اور مذہب وملت دیکھے اس شخص کی عظمت کا اعتراف علامہ نے اپنی شاعری میں یا نثر میں کیا ہے۔کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ علامہ نے صرف حب الوطنی اور اتحاد کے لحاظ سے ہی ان شخصیات کا ذکر کیا ہے جیسا کہ سید عابد علی عابد لکھتے ہیں:

''۱۹۰۵ء تک یعنی حب الوطنی کے دور میں اقبال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کو بے حد ضروری سمجھا تو لازم آیا کہ اقبال یک جہتی کی فضا پیدا کرنے کے لیے ہندوؤں کے مذہبی اور ان کے قوم کی جلیل القدر شخصیتوں کا نام احترام سے لیں ُرام پر، نا نک پر، سوامی رام تیرتھ پر جو نظمیں لکھی گئیں ان کی تخلیق کی رمز یہی ہے''۔(۷)

مگر اس خیال کو ڈاکٹر عبدالحق یوں پیش کرتے ہیں:

''اقبال شروع سے آخر تک ہندوؤں اور مسلمانوں کی یکجہتی اور ہم آہنگی پر زور دیتے ہیں۔اسے کسی دور تک محدود کرنا مناسب نہیں

اگر ہندوؤں کے جلیل القدر انسانوں کا تذکرہ یکجہتی کے لیے تھا تو پھر بعد کی شاعری میں شنکر آچاریہ (زبور عجم) بھرتری ہری، طاسین گوتم، عارف ہندی (جاوید نامہ) کی تخلیق کے کیا رمز ہو سکتے ہیں''۔(۸)

گورونانک جیسی عظیم المرتبت شخصیت کا ذکر علامہ نے انہی توحید کے اصولوں کے تحت کیا ہے۔ علامہ نے نانک کی حق پسندی کا تذکرہ ''بانگ درا'' کی نظم ''نانک'' میں یوں کیا ہے:

پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو ایک مرد کامل نے جگایا خواب سے

اس نظم میں علامہ نے نانک کی خوبیوں کا تذکرہ یوں کیا ہے:

قوم نے پیغام گوتم کی ذرا پروا نہ کی
قدر پہچانی نہ اپنے گوہر یک دانہ کی
آہ! بدقسمت رہے آواز حق سے بے خبر
غافل اپنے پھل کی شیرینی سے ہوتا ہے شجر
آشکارا اس نے کیا جو زندگی کا راز تھا
ہند کو لیکن خیالی فلسفہ پر ناز تھا
شمع حق سے جو منور ہو یہ وہ محفل نہ تھی
بارش رحمت ہوئی لیکن زمین قابل نہ تھی
آہ! شودر کے لیے ہندوستان غم خانہ ہے
درد انسانی سے اس بستی کا دل بیگانہ ہے

برہمن سرشار ہے اب تک مے پندار میں
شمع گوتم جل رہی ہے محفل اغیار میں
بتکدہ وہ پھر بعد مدت کے مگر روشن ہوا
نور ابراہیم سے آزر کا گھر روشن ہوا
پھر اٹھی آخر صدا توحید کی پنجاب سے
ہند کو اک مرد کامل نے جگایا خواب سے[9]

''بانگ درا'' کی اس نظم کے ابتداء میں گیارہ اشعار تھے۔ کسی مجموعے میں شامل نہ ہونے والے آخری تین اشعار درج ذیل ہیں:

تیرے پیمانے میں اے ساقی شراب ناب تھی
تیری شخصیت نے کھینچا ہر دل آگاہ کو
اپنے میدانوں میں جب رزم ممالک عام تھی
زندگی تیری سراپا صلح کا پیغام تھی
ہند کے بت خانے میں کعبے کا تو معمار تھا
کتنا باطل سوز تیرا شعلۂ گفتار تھا[10]

مندرجہ بالا نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے حفیظ ملک لکھتے ہیں:

''بانگ درا'' کے تیسرے حصے میں یہ نظم موجود ہے جو انہوں نے یورپ سے واپس آنے (۱۹۰۸ء) کے بعد کسی وقت لکھی تھی......

''نانک'' نام کی نظم اقبال کی پختہ کاری اور اعلیٰ فنی قابلیت کی پیداوار ہے اس نظم میں محاوروں اور تاریخی تلمیحوں کے انتخاب میں بڑی نزاکت

احساس سے کام لیا گیا ہے۔اقبال نے ہندوستان کے تہذیبی ارتقاء کا تجزیہ نہایت خلوص سے کیا ہے۔ ایک طرف انہوں نے قدیم ہندو دانشوروں کے فلسفیانہ کمال کو سراہا ہے تو دوسری ان کے اندر ذات پات کے نظام پر کڑی تنقید کی ہے۔ چنانچہ مہاتما بدھ اس نظم میں مساوات کے علمبردار کی حیثیت سے اور گورونانک عقیدۂ توحید کے نمائندہ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں''۔(۱۱)

علامہ اقبال نے گورونانک پر لکھی گئی اس نظم میں گورونانک کے ساتھ گوتم بدھ کا بھی ذکر کیا ہے اور ان دونوں شخصیات کے تئیں خراج عقیدت پیش کر کے اس بدقسمت قوم کا ذکر کیا ہے جس نے ان دونوں شخصیات کی قدر نہ کی۔ اس کے علاوہ ان عظیم المرتبت شخصیات کی تعلیمات کا اس قوم پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ وہ ذات پات کے مسئلے میں الجھ گئے لیکن صدیوں کے بعد پنجاب سے ایک شخص نانک پیدا ہوا جس نے لوگوں کو توحید کا پیغام دیا۔

علامہ نے ایک اور نظم ''ہندوستانی بچوں کا گیت''میں نانک کے تصور توحید کا ذکر یوں کیا ہے:

چشتی نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا

میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے[۱۲]

گورونانک نے قوم کو مساوات، اتحاد اور محبت کا درس دیا تھا۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے پیغام میں ان باتوں پر زور دیا ہے۔

''سکھ مذہب ایک انتخابی مذہب ہے جس کی بنا گورونانک نے اس غرض ڈالی تھی کہ انسان اپنے ہم جنسوں سے محبت کرے''۔(۱۳)

علامہ اقبال کے نزدیک اسلام کی معاشرتی نظام کی بنیاد توحید کے تصور پر قائم ہے اور توحید کی عملی روح مساوات، اتحاد اور آزادی میں مضمر ہے۔(۱۴)

اقبال نے اتحاد، مساوات اور آزادی پر زور دیا ہے اقبال نے جو مشرق و مغرب کی پیداوار ہیں۔ اسی خیال کو نظم و نثر دونوں میں عصر حاضر کی زبان میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے یورپ اور ہندوستان کی قوم پرستی کی مخالفت کی کیونکہ اس تصور میں جو نسلی احساس کا آہنگ موجود ہے وہ انسان کو انسان سے اور قوم کو قوم سے لڑا دیتا ہے۔[۱۵] علامہ اقبال نظم ''طلوع اسلام'' میں لکھتے ہیں:

ہوس نے کر دیا ٹکڑے ٹکڑے نوع انسان کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا[۱۶]

اخوت اور اتحاد کی یہی مثال پیش کرتے ہوئے علامہ اقبال اسی نظم میں کہتے ہیں:

یہاں مقصود فطرت ہے یہی رمز مسلمانی
اخوت کی جہانگیری محبت کی فراوانی
بتان رنگ و بو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی [17]

اسلامی تعلیمات سے مماثلت کی بنا پر علامہ اقبال نے گورونانک کی ان تعلیمات کو پسند کیا ہے اور ان کے اصولوں کی قدر بھی کی ہے۔ سکھ اور مسلم دونوں الگ الگ قومیں ہیں۔ سیاسی لحاظ سے دونوں میں کشمکش رہی ہے اور دونوں نے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش بھی کی ہے مگر گورونانک کی اخلاقی تعلیمات کو مسلمان قدر کرتے ہیں اور محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

نظریاتی سطح پر برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت سکھوں سے تصور توحید کی بناء پر ایک روحانی رشتہ محسوس کرتی ہے۔[18] یہ سمجھنا کہ آج کل برصغیر ہند میں سکھ اور مسلمان اجتماعی طور پر محبت کے رشتے میں منسلک ہیں، ایک خیال خام ہے۔ تاریخی حوادث اپنے پیچھے دونوں کے لیے تلخ یادیں چھوڑ گئے ہیں۔ پھر بھی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ آج بھی پنجاب میں بہت سے مسلمان بڑے پیار سے کہتے ہیں:

بابا نانک شاہ فقیر سکھاں دا گرو مسلمانان دا پیر [19]

❁❁❁

کلام اقبال کے مغربی اور دیگر اعلام ومشاہیر

۱؍کارل مارکس
۲؍حکیم نطشے
۳؍لینن
۴؍مسولینی
۵؍آرنلڈ

علامہ اقبال اور کارل مارکس

کارل ماکس ۵ رمئی ۱۸۱۸ء کو جرمنی (رائنش پرشیا) کے شہر ٹریویس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ ایک یہودی وکیل تھا جو ۱۸۲۸ء میں مارٹن لوتھر کی تعلیمات کے زیر اثر پروٹسٹنٹ بن چکا تھا۔ کارل مارکس کا خاندان ایک خوشحال اور مہذب خاندان تھا۔ بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد مارکس برلن یونیورسٹی میں داخل ہوگیا جہاں اس نے فقہ، تاریخ اور فلسفے کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۴۱ء میں فارغ التحصیل ہو کر اس نے اپی کیورس کے فلسفے پر اپنا مقالہ ڈاکٹریٹ کے لیے پیش کیا۔ تعلیم کے ان مرحلوں سے فارغ ہو کے مارکس پھر بون آیا۔ ۱۸۴۳ء میں اپنے بچپن کے ایک دوست جینی واں ویسٹ فیلن نامی لڑکی سے شادی کی۔ یہ لڑکی جرمنی کی ایک رجعت پسند گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا بھائی اس زمانے میں پرشیا کا وزیر داخلہ تھا[1]۔ شادی کے بعد مارکس نے پیرس کا رُخ کیا اور وہاں ایک ریڈیکل میگزین جاری کیا۔ پیرس کے قیام کے دوران کارل مارکس کی علمی سرگرمیوں کا دائرہ وسیع ہوگیا۔ اس نے اپنے خیالات کی نشر و اشاعت

کے لیے متعدد کتابیں لکھیں اور یہاں اینگلز کے ساتھ اس کی دوستی کی بنیاد پڑی۔ مارکس کو پیرس سے شہر بدر کر دیا گیا اس پر الزام تھا کہ یہ انقلابی ہے۔ پیرس سے برسلز کا رُخ کیا۔ ۱۸۴۸ء میں مارکس اور اینگلز دونوں کمیونسٹ لیگ نامی ایک خفیہ پراپیگنڈا سوسائٹی کے ممبر بن گئے۔

پیرس سے مارکس نے لندن کا رخ کیا جہاں وہ اپنے انتقال کے وقت تک رہا۔ اس کی تصنیف سرمایہ سب سے زیادہ مشہور ہے اور بقول اقبالؒ اس کتاب کو مذہب اشتراک کی بائبل تصور کرنا چاہیے۔[۲]

مارکس کی زندگی جلاوطنی اور مفلسی میں گزری اگر اینگلز اس کی مدد نہ کرتا تو اس کی تصنیف ''سرمایہ'' کے مکمل ہونے کی کوئی صورت ہی نہ تھی۔ قیام لندن میں اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر مشہورِ عالم پہلی انٹرنیشنل کی بنیاد ڈالی۔ انٹرنیشنل کے قیام اور اس کی کامیابی کے لیے اور اپنے خیالات کو تحریری صورت میں پیش کرنے کے لیے مارکس کو جو دماغی اور جسمانی محنت کرنا پڑی اس سے اس کی صحت بڑی متاثر ہوئی۔ سرمایہ کی تکمیل کا کام اس کے علاوہ تھا۔ جس کے لیے اسے صرف گوشے گوشے سے نیا مواد ہی جمع نہیں کرنا پڑا بلکہ متعدد زبانیں جن میں روسی بھی شامل تھی سیکھنا پڑیں۔ یہ تمام محنت ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوئی اور بالآخر ۱۴ر مارچ ۱۸۸۳ء کو جب کہ وہ اپنی آرام کی کرسی میں محوِ فکر تھا اس کی روح عالم بالا کو پرواز کر گئی۔[۳]

مارکس کے فلسفے کی بنیاد اس نظریئے پر ہے کہ سرمایہ داروں کی بتدریج

گھٹتی ہوئی تعداد مزدور کو اس کے جائز نفع اور حق سے محروم کر کے اسے فلاکت میں مبتلا کر رہی ہے۔اس کا واحد علاج نجی سرمایہ کا خاتمہ ہے۔

علامہ اقبال نے مارکس کے افکار کو اس لئے اہمیت دی کہ وہ سرمایہ داری کی بیخ کنی کر کے انسان کو انسان کے استحصال سے نجات دِلانے کا حامی ہے۔

مارکسی نظریات کا علامہ نے اپنے کلام میں کئی جگہ تذکرہ کیا ہے اور ان نظریات کو علامہ نے کہاں تک اپنایا اور کہاں تک مسترد کیا اس بارے میں مختلف نظریات پیش کئے گئے ہیں۔ دراصل علامہ نے ہر اس چیز کو قبول کیا جس کے ڈانڈے اسلام سے ملتے ہیں۔مگر جہاں کہیں انہیں اسلام مخالف نظریات یا اصول سامنے آئے انہوں نے نہ صرف انہیں مسترد کیا بلکہ ان سے دور رہنے اور بچنے کی تلقین بھی کی۔

کارل مارکس کا نظریہ صرف مادے پر مبنی ہے۔اور عمل اور ردِعمل کا فلسفہ ہے جو غیر اسلامی ہے۔اسلام ''خدا'' کی ذات کا حامی ہے۔دونوں نظریات مزدور کو جگانے اور اس پر ہو رہے ظلم کے خلاف ہیں۔ دونوں سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ملوکیت اور کلیسائی نظام کے دشمن ہیں۔ دونوں مزدور اور محنت کش طبقہ کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ دونوں طبقہ واری کشمکش سے معاشرہ کو آزاد کرنا چاہتے ہیں

علامہ اقبال نے کارل مارکس کے نظریہ سے انحراف اور انکار اس لئے کیا کیونکہ مارکس نے خدا اور مذہب دونوں سے انکار کر دیا اور

کہدیا کہ:

''مذہب عوام کے حق میں بمنزلۂ افیون ہے''۔

کارل مارکس کا اقبال پر کیا اثر رہا ہے یا یہ کہ کارل مارکس کے نظریئے کو اقبال نے کہاں تک قبول کیا اور کس حد تک اسے مسترد کیا، اس کے متعلق ناقدین نے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے۔ڈاکٹر اعجاز حسین لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں غالباً اردو زبان نے سب زبانوں سے پہلے آگے بڑھ کر انقلاب روس کا خیر مقدم کیا۔ چنانچہ اقبال نے مسرت کے ساتھ اعلان کیا:

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا!
آسمان ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

اور''ساقی نامہ'' میں مسرت کے ساتھ عوام الناس کو یہ کہہ کر مبارکباد دی۔

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشا دکھا کر مداری گیا[44]

علامہ اقبال ایک انقلابی شاعر تھے۔ وہ سرمایہ داری کے خلاف تھے اور مزدور کے حق میں بات کرتے ہیں۔

چنانچہ پروفیسر آل احمد سرور لکھتے ہیں:

''اقبال سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ اردو شاعری میں سب سے پہلے انہوں نے مزدوروں کی حمایت میں آواز بلند کی۔ مارکس کی

وہ بڑی حمایت کرتے ہیں۔ مگر ایک تو وہ اشتراکیت کی انتہا پسندی کے خلاف ہیں اور زمین کو بجائے کسان یا زمیندار کی ملکیت سمجھنے کو خدا کی ملکیت سمجھتے ہیں۔ دوسری وہ ان مادی قدروں سے بیزار ہیں جن پر مارکس نے اپنے تصورات کی بنیاد رکھی۔ ورنہ ان کی روح اشتراکی ہے وہ اسلامی سوشلسٹ ہیں،،[۵]

پروفیسر آل احمد سرؔور اور ڈاکٹر اعجاز حسین کے نظریئے کے علاوہ علامہ نے خود بھی اپنی تحریروں میں اس نظریئے کو واضح کرتے ہوئے اس بات کو بیان کیا ہے کہ اسلام ایک مکمل نظریہ کا نام ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی بھی نظریہ ہو جو اسلام کے اصولوں کے خلاف ہے انہیں قابلِ قبول نہیں ہے اور وہ حقیقی نظریہ نہیں بلکہ غیر حقیقی ہے۔ ان کا خیال ہے:

''اسلام ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ کے اصول کی حیثیت میں کوئی لچک اپنے اندر نہیں رکھتا اور ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ ہر دستور العمل جو غیر اسلامی ہو، نا معقول و مردود ہے''[۶]

اقبال کے نزدیک سوشلزم کے ماننے والے مذہب اور روحانیت کے مُنکر ہیں۔ لکھتے ہیں:

''یہ لوگ مذہب کو افیون سمجھتے ہیں۔ سب سے پہلے جس شخص نے مذہب کو افیون کہا ہے وہ کارل مارکسؔ تھا۔ میں ایک مسلمان ہوں اور انشاء اللہ مسلمان ہی مروں گا۔ مرے نزدیک تاریخ کی مادی تعبیر

Interpretation قطعاً غلط ہے'' ۷

مندرجہ بالا حوالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال ہر ایک نظریہ کو اسلامی دائرے کے اندر ہی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے اسلام ہی ایک اصلی اور لا زوال نظریہ ہے۔ اشترا کی نظریہ جو بعد میں زوال پذیر ہوا علامہ نے اس میں صرف ان چیزوں کو قابلِ قبول سمجھا جو اسلام کے تابع ہیں۔ علامہ دراصل مظلوم عوام کی حوصلہ افزائی کرنا چاہتے ہیں اور سرمایہ داری کے زبردست مخالف ہیں۔ خواجہ غلام السیّدین کو ۱۷ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ''ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیۃً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی ہے یا اس سے بھی بدترین جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار بار لعنت بھیجتا ہے ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا، بولنا روپیہ صرف کرنا، لاٹھیاں کھانا، جیل جانا، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام ہے اور قطعی حرام سمجھتا ہوں'' ۸

دراصل روس میں جو انقلاب آیا اس کا اثر علامہ نے بھی ایک مفکر اور شاعر کی حیثیت سے قبول کیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ علامہ اس سے متاثر بھی ہوئے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ اس نظریئے میں بعض خصوصیات ایسی تھیں جو اسلام میں بھی موجود تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ نے ان اصولوں کو اپنایا جو مزدور کو اسلامی اصولوں کے تحت اپنا حق دے سکیں تاکہ مزدور کے ساتھ

انصاف ہو جائے۔ نظم بعنوان ''اشتراکیت'' میں لکھتے ہیں ۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمی رفتار
اندیشہ ہوا شوخی افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بے زار
انسان کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مرد مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدت کردار
جو حرف قل العفو میں پوشیدہ ہے اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار[9]

مندرجہ بالا نظم میں اقبال مادیت کے بجائے روحانیت پر زور دیتے ہیں۔ وہ ایسے نظام کے متلاشی ہیں جس میں مزدور کو اپنا حق مل سکے اور وہ جسم کے ساتھ روح کی تربیت بھی چاہتے ہیں۔ ان کے سامنے اسلام واحد فلسفہ ہے جو اس کمی کو پورا کر سکتا ہے۔ وہ قوانین اراضی اور زمین کی پیداوار کی تقسیم اسلامی اصولوں کے تحت کرانے کے خواہاں ہیں۔ ع

کھائے کیوں مزدور کی محنت کا پھل سرمایہ دار

اقبال سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔ سماجی ناانصافی اور نابرابری کے علاوہ مزدور پر ظلم اور جبر پر وہ بغاوت کرتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام اور

سرمایہ داری کے بارے میں وہ اعلان کرتے ہیں ۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو
سلطانی جمہوری کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کُہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو[۱۰]

اقبال سوشلزم اور اشتراکیت کے انہی اصولوں کو اپناتے ہیں جو اسلام کے تابع ہیں اور جہاں انہیں اسلامی نظریات کے خلاف کوئی اصول سامنے آتا ہے وہ یکسر مسترد کرتے ہیں۔ اقبال نے نہ اشتراکیت کو اپنایا نہ سوشلزم کو نہ کمینوزم کو، وہ صرف اسلامی نظریہ کو اپناتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔ جو ان کے مطابق حقیقی اور ابدی ہے۔

''جاوید نامے'' میں اشتراکیت وملوکیت کے نظریات پر یوں تنقید کرتے ہیں ۔

صاحب سرمایہ از نسل خلیل
یعنی آں پیغمبرے بے جبرئیل
زانکہ حق در باطل او مضمر است
قلب او مومن دماغش کافر است
غریباں گم کردہ اند افلاک را
در شکم جویند جانِ پاک را

رنگ و بو از تن نگیرد جان پاک
جز بہ تن کارے نہ دارد اشتراک
دین آں پیغمبر حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخ او در دل نہ در آب و گل است[11]

اس نظم کو اقبال نے اشتراکیت وملوکیت عنوان کے تحت ''جاوید نامہ'' میں جمال الدین افغانی کی زبانی پیش کیا ہے۔ یہاں اقبال نے مارکسی نظریئے کو ہدفِ تنقید بنا کر مارکس کو پیغمبر بے جبرئیل کہا ہے۔ ملک حسن اختر لکھتے ہیں:

''کارل مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف اپنی کتاب ''سرمایہ'' میں ایک پورا نظام پیش کیا ہے اس کے دل میں افلاس وغربت کو ختم کرنے کا جو جذبہ پایا جاتا ہے، اقبال کو اس نے متاثر کیا، اور انہوں نے جاوید نامے میں اس کو حضرت ابراہیم کی نسل سے ایک ایسا پیغمبر قرار دیا جو حق ناشناس تھا جس کا دل مومن مگر دماغ کافر تھا اور جس کے باطل میں حق پوشیدہ ہے ....مگر خرابی یہ ہے کہ اس نے مساوات کی بنیاد صرف پیٹ کو بنایا اور اخلاقیات کو خارج کر دیا۔ کارل مارکس نے مذہب سے بے زاری کا جو اظہار کیا ہے اقبال اس سے متفق نہیں ہے وہ جسم کے تقاضوں کے ساتھ روح کا بھی خیال رکھتے ہیں

البتہ وہ خود ایسے مذہب کے خلاف ہیں جو افیونی صفات رکھتا ہو۔ جو جگانے کے بجائے سلانے کی کوشش کرے اور عمل کے بجائے بے عملی کا درس دے،، [۱۲]

مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''وہ اشتراکیت اور ملوکیت پر شدید نکتہ چینی کے فوراً بعد محکمات عالم قرآنی کا باب لاتے ہیں اور خلافت آدم، حکومت الٰہی ارض ملکِ خدا است اور حکمت خیر کثیر است کی وضاحت کرتے ہیں تاکہ اشتراکیت اور اسلام کا فرق پوری طرح واضح ہو جائے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جمال الدین افغانی کی طرف سے روس کو مسلمان بن جانے کا پیغام بھی دلواتے ہیں'' [۱۳]

ضرب کلیم میں ایک نظم بعنوان ''کارل مارکس کی آواز'' درج ہے۔ اس میں علامہ اقبال مارکس کی تعلیمات کی خصوصیات کو واضح کر کے مزدور کو اپنی محنت کا ثمرہ حاصل کرنے کے خواہاں ہیں۔ علامہ کے مطابق مزدور کافی محنت کرتا ہے مگر نہ اس کو رہنے کے لیے جگہ میسر ہے نہ کھانے کے لیے روٹی اور نہ پہننے کے لیے کپڑا۔ وہ اس فن اور فلسفے پر گہری تنقید کرتے ہیں جو سرمایہ داروں کی حمایت کر کے مزدور کا استحصال کرتا ہے۔ اقبال کے مطابق اس فن اور فلسفے کی نمائش بے کار ہے۔

یہ علم و حکمت کی مہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمائش
نہیں ہے دنیا کو اب گوارا پرانے افکار کی نمائش

تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر
خطوط خمدار کی نمائش! مریز و کج دار کی نمائش
ہوس کی خونریزیاں چھپاتی ہے عقل عیار کی نمائش [14]

مندرجہ بالا نظم میں اقبال کارل مارکس کی زبانی سرمایہ داروں کے فن اور فلسفے کی بے کار نمایش کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق یہ علم اور فلسفہ مزدوروں کے مسائل کو پورے طور حل نہیں کر سکا ہے۔ اس لئے یہ سب بے کار ہے۔ ان کے مطابق مزدور کے لیے عملاً کچھ بھی نہیں کیا جاتا ہے۔ ان کے مطابق مزدور کو زیادہ سے زیادہ کمزور اور غلام بنانے کے منصوبے تیار کئے جاتے ہیں۔ ان کو جھوٹی باتوں سے بہلا کر دھوکہ دیا جاتا ہے۔

''ارمغان حجاز'' کی نظم ''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں علام نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ نہ سوشلزم نہ کمنیوزم اور نہ اشتراکیت سے زندگی کے مسائل کا حل ممکن ہے یہ صرف اور صرف اسلام کے ہاتھ میں ہے جو زندگی کے تمام مسائل کو حل کر سکتا ہے۔ چونکہ اس نظم میں ابلیس اپنے مشیروں کو مشورہ دیتا ہے اور صاف صاف کہتا ہے کہ اگر باطل کو ڈر ہے تو صرف اور صرف اسلامی قوانین اور عمل سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظم میں ابلیس اسلام کو اپنا اولین دشمن قرار دیتا ہے۔ اس نظم میں جمہوریت اور ملوکیت کے بارے میں سوال و جوابات ملتے ہیں۔ روس میں اشتراکیت کے عروج پر ابلیس کے مشیر پریشان نظر آتے ہیں اور اس کا اظہار یوں کرتے ہیں ؎

روح سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی شرارت کا جواب
وہ کلیم بے تجلی وہ مسیح بے صلیب
نیست پیغمبر ولیکن در بغل دارد کتاب
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب [۱۵]

ابلیس کے مشیروں کو اشتراکیت کا ڈر ہے اور باقی نظام ان کے لیے خطرناک نہیں ہیں۔ اگر کوئی چیز ان کے لیے خطرناک ہے تو بقول اقبال

ہے اگر مجھ کو خطرہ کوئی تو اس امت سے ہے
جس کی خاکستر میں ہے اب تک شرارِ آرزو
خال خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اِشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو

یہاں ابلیس کی پریشانی کا یہ عالم ہے کہ وہ کہتا ہے

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و نظر کا انقلاب
بادشاہوں کی نہیں اللہ کی ہے یہ زمین [۱۶]

ابلیس کو نہ اشتراکیت کا ڈر ہے نہ کمینوزم کا اس کا ڈر ہے تو صرف اسلام کا۔

ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات
مت رکھ ذکر و فکر صبح گاہی میں اُسے
پختہ تر کر دے مزاجِ خانقاہی میں اُسے [۱۷]

مذکورہ نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''اقبال کے ان اشعار کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقبال مغربی یورپ کے جمہوری نظام پر اشتراکی نظام کو ترجیح دیتے ہیں۔لیکن اشتراکی نظام کے مقابلے میں اسلام کو بدرجہا بہتر نظام سمجھتے ہیں'' [۱۸]

ابلیس کی زبان اقبال اسلام کے ہمہ گیر آفاقی نظامِ حیات کو حقیقی نظام قرار دیتے ہیں۔اس بارے میں اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

''یہ نظم ان کی اس بلوغتِ نظر کی بھی ترجمان ہے جو انہیں ہم عصری سیاسی تحریکات اور مظاہر میں حاصل تھی،اور اسلامی نظامِ حیات وکائنات میں ان کے ایمان وایقان کی بھی............ابلیس خود فریبی کا شکار بھی ہے اور ایک طرح کی جبلی حِس اور بصیرت بھی رکھتا ہے۔ ملوکیت،شہنشاہیت اور استعماریت سب اسی کی فطانت کے آفریدہ ہیں۔فاشزم ایک طور سے ان سب کا منطقی نقطۂ انجام بھی اور توڑ بھی۔ اشتمالیت میں ان سب کی نفی کرنے بلکہ انہیں مسمار کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔لیکن مستقبل کے لیے اسلام کا وہ اجتماعی نظام ہے جو اخوت،سماجی انصاف اور ایک متوازن معیشت کے تصور پر قائم ہے

اور یہی ابلیس کیلیے سب سے بڑھ کر روح فرسا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظم میں مارکسیت یا کمیونزم کی نہ صرف تضحیک ہی کی گئی ہے بلکہ مثبت اور حتمی طور پر اس کی ستائش کی گئی ہے اور مروجہ اسلام کی خامیوں کو چن چن کر گنایا جتایا گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہے کہ کمیونزم کی محدود افادیت کو تسلیم کرنے کے باوجود اسلام کی اساسی تعلیمات کی فوقیت اور برتری کو بھی بڑی حد تک نمایاں کیا گیا ہے۔ نظم کے بیرونی ڈھانچے اور اس کے مرکزی تصورات کے ساتھ ہی اس کے اندرونی دباؤ (Inner Compulsions) بھی کچھ کم اہم نہیں ہیں''[۱۹]

❁❁❁

علامہ اقبال اور حکیم نطشے

علامہ اقبال جرمنی کے مشہور فلسفی حکیم نطشے کا ذکر اپنے اردو اور فارسی کلام میں کیا ہے۔ اقبال نے نطشے کے مختلف فلسفیانہ پہلوؤں کا ذکر کر کے بعض پہلوؤں پر نکتہ چینی کی ہے اور اس کے علاوہ ان کے فلسفے سے اپنی دلچسپی کا اظہار بھی کیا ہے۔ فریڈرک ولیم نطشے ۱۸۴۴ء میں بمقام راکن جرمنی پیدا ہوا۔ اس کا باپ پادری تھا۔ وہ چار سال کی عمر میں یتیم ہو گیا۔ بان اور لائپزگ میں تعلیم حاصل کی۔ علم اللغۃ (فلالوجی) اس کا خاص مضمون تھا۔ اور خداداد ذہانت کی بدولت اس نے اس فن میں اس قدر اعلیٰ درجہ کی مہارت حاصل کر لی کہ ۲۴ سال کی عمر میں اسے BASLE یونیورسٹی میں لیکچرار مقرر کیا گیا۔ اور بعد میں پروفیسر بنا۔

۱۸۷۰ء میں جرمنی فرانس کی جنگ میں شرکت کرنے کے بعد اس کی صحت خراب ہو گئی اور تدریس و تعلیم کا سلسلہ شروع کیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۷۹ء میں مستعفی ہو گیا۔

۱۸۸۹ء تک اس کی زندگی اسی طرح بسر ہوئی کہ صحت کے حصول کی خاطر مختلف شہروں میں اقامت گزیں رہا۔ آمدنی قلیل، صحت خراب، خیالات باغیانہ، مزاج نازک، طبیعت شاہانہ، دولت عنقا، غمگسار ناپید

سب سے بڑی مصیبت یہ کہ تجرّد کی زندگی یعنی محبت سے محرومی۔ لیکن ان حالات میں بھی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

۱۸۸۹ء میں اس پر فالج کا حملہ ہوا اور اس نامراد مرض نے اسے مخبوط الحواس بنا دیا۔ دیوانگی یا اختلال دماغی کا یہ عالم تادم وفات قائم رہا۔ ۱۸۹۷ء تک اس کی ماں نے اس کی تیمارداری کی اور جب اس کی وفات ہوگئی تو اس کی بہن نے یہ فرض انجام دیا۔ ۱۹۰۰ء میں اس مجذوب فرنگی نے قیدِ حیات سے رہائی پائی۔[1]

نطشے ایک دہریہ اور علامہ اقبال خدا کی ہستی کے معترف تھے۔ مگر دونوں میں عظمت انسان کے مختلف تصورات اور طریقے مشترک ہیں۔ دونوں انسان کو فوق البشر اور مردِ مومن کی صورت میں دیکھنا چاہتے ہیں۔ اگرچہ نطشے کا فوق البشر اقبال کے مردِ مومن سے مختلف ہے مگر اس میں بعض اخلاقی تصورات قرآنی تعلیمات سے ضرور میل کھاتے ہیں۔ نطشے انسان میں اعلیٰ صفات دیکھنے کا آرزومند ہے اور اس لئے وہ فرد کو فوق البشر بننے کی تلقین کرتے ہیں۔ علام کا مردِ مومن اپنی صفات کے لحاظ سے نطشے کے فوق البشر سے مختلف ہے لیکن دونوں مجموعی طور پر فرد کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نطشے کے فوق البشر کو کسی مرد مومن کی صحبت نصیب نہیں اور وہ خدا کا منکر ہے جبکہ اقبال کے مردِ مومن کو یہ فیض حاصل ہو چکا ہے اور وہ احکام الٰہی کا پابند ہے۔ اقبال کے نزدیک نطشے کے فوق البشر کو ایک مردِ مومن یا

مرشدِ کامل کی ضرورت ہے جو انہیں منزل مقصود کی طرف صحیح رہنمائی کر سکے۔

کاش بودے در زمانِ احمدے
تا رسیدے بہ سرورے سرمدے

علامہ اقبال نے پیامِ مشرق میں نطشے کا ذکر تین مرتبہ کیا ہے۔ایک نظم ''شوپن ہار اور نطشے'' عنوان کے تحت ، دوسری نظم اور تیسری نظم کا عنوان ٹیشا ہے۔ان تینوں نظموں میں اقبال نے نطشے کے علاوہ شوپن ہار کے فلسفے کا ذکر بھی کیا ہے۔پہلی نظم میں شوپن ہار کے فلسفہ زندگی اور اس کی تعلیم کا ذکر کر کے یہ کہدیا ہے کہ شوپن ہار کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا بُری چیز ہے اور زندگی دُکھ ہے۔اس لئے دونوں سے قطع تعلق کر کے زندگی کی لذتوں اور خواہشات سے دور رہنا ہے۔اس کے برعکس نطشے کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا اچھی ہے اور زندگی راحت،ان دونوں چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے اپنے اندر طاقت پیدا کرو۔

گفتش کہ سودِ خویش ز جیب زیاں بر آر
گل از شگاف سینہ زرِ ناب آفرید
درماں ز درد ساز اگر خستہ تن شوی
خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی[2]

دوسری نظم ''ٹیشا'' عنوان کے تحت لکھی گئی ہے۔اس میں انسان کی کمزوریوں کا ذکر کر کے انسان کے تیئں ہمدردانہ رویہ اختیار کیا گیا ہے۔

یہاں نطشے ایک فوق البشر کی تلاش میں ہے جو کائنات پر حکمران بن سکے۔نطشے کے افکار نے یورپی تہذیب کے اصولوں پر جو اثرات ڈالے ان کا ذکر کر کے علامہ نے نطشے کو ایک دیوانہ قرار دیا ہے جو کانچ کے برتنوں کے کارخانوں میں جا گھسا اور وہاں توڑ پھوڑ کی۔ کانچ کے برتن سے مطلب یورپی تہذیب ہے۔

از سستی عناصر انساں دلش تپید
فکر حکیم پیکر محکم تر آفرید
افگند در فرنگ صد آشوب تازۂ
دیوانۂ بکار گہِ شیشہ گر رسید[3]

تیسری نظم میں نٹیشے کا ذکر یوں ملتا ہے۔

گرنوا خواہی ز پیش او گریز
در نئے کلکش غریو تند راست
نیشتر اندر دل مغرب فشرد
دستش از خونِ چلیپا احمر است
آنکہ ہر طرحِ حرم بتخانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است
خویش را در نار آن نمرود سوز
زانکہ بستان خلیل از آذر است[4]

علامہ اقبال نے اس نظم میں نطشے کو کارل مارکس کی طرح یہ کہہ کر بیان کیا

ہے کہ

"قلب او مومن دماغش کافر است"

"اس قطے" کے ساتھ علامہ اقبال کا شُذرہ بھی درج ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

"نٹشے نے مسیحی فلسفہ واخلاق پر زبردست حملہ کیا ہے اس کا دماغ اس لئے کافر ہے کہ وہ خدا کا منکر ہے مگر بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار مذہب اسلام کے بہت قریب ہیں۔" قلب او مومن دماغش کافر است" نبی کریمؐ نے اس قسم کا جملہ امیہ بن الطلت (عرب شاعر) کی نسبت کہا تھا۔" اٰمن لِسانه وكفر قلبه"

علامہ اقبال نے نطشے کا ذکر "ضربِ کلیم" کے علاوہ بالِ جبریل میں بھی کیا ہے۔ ضربِ کلیم کی نظم بعنوان "حکیم نطشے" میں اقبال نے نطشے کا ذکر یوں کیا ہے:

حریفِ نکتۂ توحید ہو سکا نہ حکیم
نگاہ چاہیے اسرارِ لا الٰہ الّا اللہ کے لئے
خُدنگِ سینۂ گردوں ہے اس کا فکرِ بلند
کمند اس کا تخیل ہے مہر و مہ کے لئے
اگرچہ پاک ہے طینت میں راہبی اس کی
ترس رہی ہے مگر لذتِ گنہ کے لیے[5]

نطشے کے افکار بلند ہیں اس نے مسیحی دنیا میں زلزلہ پیدا کر دیا مگر وہ ذاتِ الٰہی (توحید) کا اعتراف نہ کر سکا۔ کیونکہ اس کو کسی مردِ کامل یا مردِ خدا کی صحبت نصیب نہ ہوئی۔ اس لئے اس کے افکار بے کار ہوئے۔

بال جبرئیل کی ایک نظم بعنوان ''یورپ'' میں علامہ نے نطشے کے اس قیاس کو نظم کیا ہے کہ یہودی قوم ایسی عیاری سے کام لے کر یورپ پر مسلط ہو جائے گی۔ اقبال نے نٹشے کی اکثر شاعرانہ تحریروں سے اثر قبول کر لیا اور وہ ان کی شخصیت سے بھی متاثر رہے مگر نطشے کے فکر اور فلسفہ میں اگر ان کو کوئی کمی محسوس ہوئی تو وہ کمی اللہ تعالیٰ کی ذات سے انکار ہے۔ جس نے نطشے کو گمراہ کر دیا۔ اگر نطشے کو کسی مردِ مومن یا مرشدِ کامل کی صحبت نصیب ہوتی تو وہ مسلمان ہو جاتا۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے۔

مجذوب فرنگی کی وضاحت کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں:

''جرمنی کا مشہور مجذوب فلسفی نطشہ جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کر سکا اور اس کے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستے پر ڈال دیا''[6]

جاوید نامے میں اقبال نے مقام حکیم المانوی نطشہ عنوان کے تحت ایک نظم لکھی ہے جس میں نطشے کے فلسفے کے بعض پہلوؤں کو واضح کر دیا ہے۔ اقبال نے اسے مجذوب اور ''حلاج'' کہا ہے اور اسی وجہ سے ''جاوید نامہ'' میں ٹیٹشے کو مادی اور روحانی جہاتوں کے درمیان ......آں سوے افلاک..........ہی دکھایا ہے۔ مادی دنیا نٹیشے کا مقام اس لئے نہیں بن سکی کہ اس کا قلب مومن ہے اور روحانی دنیا کے قابل وہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ اس کا دماغ کافر ہے۔[7]

بر ثغورِ ایں جہاں چوں و چند
بُود مردے باصدائے درد مند
دیدۂ او از عقاباں تیز تر
طلعت او شاہد سوز جگر
دمبدم سوزِ دورن او فزود
بر لبش بیتے کہ صد بارش سرور
نہ جبریلے، نہ فردوسے، نہ حورے، نہ خداوندے
کفِ خاکے کہ می سوزد ز جان آرزو مندے[8]

نطشے کے بارے میں اقبال رومی (اپنے مرشد) سے پوچھتے ہیں:

من بہ رومی گفت این دیوانہ کیست
گفت ایں فرزانہ المانوی است
درمیان ایں دو عالم جائے اوست
نغمہ دیرینہ اندر نائے اوست
باز ایں حلاج بے دار و رسن
نوع دیگر گفتہ آں حرف کہن
حرف او بیباک افکارش عظیم
غربیاں از تیغ گفتارش دونیم[9]

چوتھے بند میں اقبال نے نطشے کو مجذوب قرار دیا ہے۔اقبال کے مطابق نطشے دیوانہ نہیں تھا البہ اس کو کسی مردِراہ داں کی ضرورت تھی جو اس وقت

یورپ میں موجود نہ تھا۔

مرد راہ دانے نبود اندر فرنگ
پس قروں شد نغمہ اش از تار چنگ
راہ رو کس را نشان از رہ نداد
صد خلل در وارادت او فتاد
نقد بود و کس عیار او رانہ کرد
کاروانے مردِ کار او را نہ کرد
عاشقے در آہ خود گم گشتۂ
سالکے در راہ خود گم گشتۂ [10]

نطشے نے خدا کا انکار کر دیا اور تمام مذاہب کا توڑ کر دیا۔ اس کی وجہ بقول اقبال یہی ہے کہ نطشے کو ایک مردِ راہ داں کی صحبت میسر نہ ہوئی جو اس کو راہ اعتدال دکھا کر اس کے دماغی توازن کو برقرار رکھتا۔ اس لئے اقبال نطشے کے بارے میں اس نظم کے آخر میں یوں فرماتے ہیں:

ورنہ او از خاکیاں بیزار بود
مثل موسیٰ طالب دیدار بود
کاش بودے در زماں احمدے
تا رسیدے بر سرورے سرمدے
عقل او با خویشتن در گفتگوست
تو رہ خود رو کہ راہ خود نکوست

پیش نہ گامے کہ آمد آں مقام
کاندرو بے حرف می روید کلام[11]

اقبال کے مطابق اگر نطشے حضرت مجدد الف ثانی کے زمانے میں پیدا ہوتا تو وہ ان کی صحبت کی بدولت واصلِ بحق ہو کر سرورِ سرمدی حاصل کر لیتا۔

نطشے اور اقبال دونوں انسان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک نے مرد کامل کا تصور پیش کیا تو دوسرے نے فوق البشر کا دونوں میں فرق بھی ہے اور مماثلت کے پہلو بھی ہیں۔ نطشے کے فوق البشر میں تخلیق آرزو اور قوت ارادی موجود ہیں اور یہی عناصر اقبال کے مردِ مومن میں بھی۔ مگر فوق البشر اور مردِ مومن میں ایک فرق طاقت اور شفقت کرم کا ہے نطشے طاقت پر بھروسہ کرتا ہے۔ اقبال شفقتِ کرم پر نطشے کا فوق البشر ظالم ترین جانور ہے مگر اقبال کا مرد مومن خودی کے ساتھ بے خودی کا رمز شناس ہے اور قوت و جبروت کا فوق البشر خودی سے آگاہ ہے۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد اس بارے میں رقمطراز ہیں:

> ''نطشے کا فوق البشر اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لیے اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے۔ وہ جبر اور تشدد کا مجموعہ ہے اور کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ اقبال کا مردِ مومن توحید پرست بھی ہے اور انسان دوست بھی''۔[12]

مرد سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لا الٰہ
سایہ شمشیر میں اس کی پناہ لا الٰہ

خاکی و نوری نہار بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز
اس کی اُمیدیں قلیل اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب اس کی نگاہ دل نواز
نرم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاک باز

عورت کے بارے میں دونوں کے نظریات کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''عورت کے بارے میں اقبال یہاں تک تو نٹشے کے ہم خیال ہیں کہ مرد اور عورت میں مساوات کا سوال پیدا نہیں ہوتا لیکن وہ نطشے کی طرح یہ نہیں کہتے کہ عورت مرد کے لیے ایک خطرناک کھلونا ہے نہ ہی وہ نطشے کی طرح یہ لکھتے ہیں کہ مرد کی تعلیم جنگی ماحول کے پیش نظر ہونی چاہیے اور عورت کی مرد کے دل بہلاوے کے پیش نظر بلکہ وہ اس نظریئے کی صاف مخالفت کرتے ہیں'' [۱۳]

اقبال اور نطشے کے درمیان ان مماثلتی اور اختلافی پہلوؤں کا اگر ذکر کیا جائے تو یہ بات عیاں ہے کہ دونوں فوق البشر اور مردِ مومن کے روپ میں انسان کی ہستی کو دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ دونوں میں یہ فرق ضرور ہے کہ اقبال کا مردِ مومن دنیا میں اللہ کا نائب ہے اور دنیا والوں کے لیے رحمت ہے لیکن نطشے کا فوق البشر کسی بالاتر ہستی کا معترف نہیں یعنی ایک

خدا کی ہستی کا قائل ہے اور دوسرا اس کا منکر اور اس انکار کی وجہ سے بندے کو بالاتر کر کے دنیا کے نظام میں ایک خلل پیدا کرتا ہے۔ اقبال کا مردِ مومن نیابتِ الٰہی کا فریضہ انجام دیتا ہے وہ خدا کے قانون کو مانتا ہے۔ وہ مذہبی قوانین اور اصولوں کے تابع ہے اور ان پر عمل کرتا ہے جہاں اسے عشق کی قوتوں کی ضرورت ہے وہاں عقل کا نور بھی اسے چاہیے۔ وہ خدا کے سامنے جواب دہ ہے اس کے برعکس نطشے کا فوق البشر آزاد ہے۔ نہ اس کو کسی کے سامنے جواب دینا ہے نہ ہی وہ کسی حکم کا پابند۔ وہ صرف طاقت کے بل بوتے پر دوسروں پر ظلم و جبر کر کے اپنے فوق البشر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ وہ دراصل اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہے۔ اس کے برعکس اقبال کا مردِ مومن وہ مثالی انسان ہے جو دنیا میں سب سے بلند مرتبہ رکھتا ہے اور ان کے نظریۂ خودی کے ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔

علامہ اقبالؒ اور لینن

علامہ اقبال نے تاریخ کے کئی مشاہیر پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔لینن کا شمار انہیں مشاہیر میں ہوتا ہے ۔ علامہ نے ''لینن خدا کے حضور میں'' عنوان کے تحت ایک نہایت ہی دلچسپ نظم لکھی ہے جوان کے مجموعۂ کلام ''بالِ جبریل'' میں موجود ہے۔ اس نظم میں لینن کے اشترا کی فلسفے اور نظریئے کوایک فکرانگیز تخلیق کے روپ میں پیش کردیا ہے۔

لینن ایک انقلاب پسند شخص تھا۔ روس کا پہلا صدر اور ڈکٹیٹر جو ۱۸۷۰ء میں بمقام سمبرسک واقع صوبہ قازان میں پیدا ہوا۔ ۱۸۸۷ء میں سکندر ثالث زار روس کے خلاف سازش میں اس کے بڑے بھائی کو پھانسی دی گئی نتیجہ کے طور پر لینن کی شخصیت پر اس کا اثر پڑا، اور وہ ایک انقلابی شخصیت بن گئی۔ اور اسی وجہ سے اس کی انقلابی شخصیت نے دنیا میں ایک نیا انقلاب برپا کردیا۔ ۱۸۹۷ء میں اشترا کیت کی اشاعت کو اپنی زندگی کا مقصداس لئے بنایا کیونکہ اس نے کارل مارکس کی تصانیف کا گہرا مطالعہ کیا۔ پھر لینن کو ۱۸۹۸ء میں سائبریا جلاوطن کردیا گیا۔ ۱۹۰۲ء میں روس کوخیر باد کہا۔ روس سے باہر رہ کر وہ انقلاب روس کے لیے سرگرمِ عمل رہا اور جب روس میں ۱۹۱۷ء میں انقلاب رونما ہوا تو لینن نے زار

روس کے محل کو اپنا آفس بنا دیا۔ اور پھر ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔

لینن کی انقلابی شخصیت اور اس کی تعلیمات نے اشتراکیت کے نظریئے کو موثر بنا دیا۔

علامہ اقبال نے لینن جیسی بلند پایہ شخصیت کو بھی اپنی شاعری میں پیش کر کے نہایت ہی فنکارانہ انداز سے خدا کے حضور میں پیش کیا ہے اور خدا کے حضور میں پیش کر کے لینن کو اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ خدا کی ذات ہی ایک ایسی لازوال شئے ہے جو کبھی فنا نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ لینن کو خدا کے حضور میں کھڑا کر کے کچھ ایسے دنیاوی حقائق کی طرف اشارہ کیا ہے جن سے پردہ اُٹھ چکا ہے لین کو خدا کی ذات کا یقین ہو چکا ہے اور اس کا اعتراف وہ خود کر رہے ہیں۔ اس پر تمام چیزوں کی حقیقت اور اصلیت ظاہر ہو چکی ہے۔ وہ خدا کی ذات کا اعتراف کر چکا ہے ؎

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پابندہ تیری ذات

نظم لینن خدا کے حضور میں، ایک ایسا لافانی شاہکار ہے جو علامہ کے قوتِ تخیل اور فکری بلندی کی اعلیٰ مثال ہے ؎

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات!
وہ قوم کی فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ہے دل کے لیے موت مشینوں کی حکومت!
احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات[1]

اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر جگن ناتھ آزاد لکھتے ہیں:

''یورپ کے سیاسی نظام میں مادیت پرستی کی انتہا ہمیں روس کے اشتراکی نظام میں نظر آتی ہے۔اقبال نے لینن کو خدا کے حضور میں پہنچا کر جو شاہکار اردو شاعری کو دیا ہے اس میں لینن کے دل کی تڑپ موجود ہو یا نہ ہو لیکن اس روح کی تڑپ ضرور موجود ہے جس سے مادہ پرستی کے بوجھ تلے دبے ہونے کا احساس ہے''[2]

نظم میں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن میں مغرب کی بے دینی اور بداخلاقی کے علاوہ موجودہ سیاست و معیشت کا ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ بعض اشعار میں معاشیات کے وہ سوالات پیش کئے گئے ہیں جن میں خاص کر سامراج، سرمایہ داری، میکانکی، صنعت و حرفت، بے روح سائنس پر بھی تنقید کی گئی ہے۔

رعنائی تعمیر میں ، رونق ، میں ، صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات!
ظاہر میں تجارت ہے ، حقیقت میں جُوا ہے
سُود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگِ مفاجات!
یہ علم ، یہ حکمت ، یہ تدبر ، یہ حکومت
پیتے ہیں لہو ، دیتے ہیں تعلیمِ مساوات!
بیکاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات؟

وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات![3]

مندرجہ بالا اشعار سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ یہ اشعار لینن کے نہیں بلکہ علامہ کے ہیں مگر دراصل ساری نظم لینن سے کہلوائی ہے۔ جو خدا کے حضور میں کھڑا ہے اور وہ اب سارے حقائق سے آگاہ ہے۔ اس نظم میں علامہ نے مغرب کے بے دین اور غیر اخلاقی نظریئے کو بے نقاب کیا ہے جو غریب مزدوروں کا خون چوستا ہے۔ دراصل دنیا مادہ پرست بن گئی ہے اور اس لئے بنکوں کی عمارات دینی جگہوں سے زیادہ عالیشان ہیں۔ اور یہ قوم کی بے دینی اور بداخلاقی کی تصویر ہے۔

لینن کو خدا کے حضور میں کھڑا کر کے علامہ نے لینن کی زبانی پہلے ہی شعر میں خدا کی ذات کا اعتراف کیا ہے۔

اے انفس و آفاق میں پیدا ترے آیات
حق یہ ہے کہ ہے زندہ و پائندہ تری ذات

اس کے بعد علامہ نے لینن کی زبانی مغربی سیاست اور سرمایہ داری پر تنقید کی ہے۔ اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ نے لینن کو اپنے ماحول اور معاشرے کے لحاظ سے ہی ایک ایسے کردار کے طور پر پیش کیا ہے جو خود اس ماحول اور معاشرے کی پیداوار ہے۔ اس نظم پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

''لینن خُدا کے حضور میں'' ایک دلچسپ اور فکر انگیز تخلیق ہے یہ

ایک کرداراوراس کے یک طرفہ مکالمے کی تمثیل ہے نوعیت نظم کے لحاظ سے ابتداء میں ایک مناسب موضوع تمہید ہے جس میں متعلقہ کرداراور اس کے ماحول کا پس منظر بڑی خوبصورتی سے مرتب ہوتا ہے

میں کیسے سمجھتا کہ تو ہے کہ نہیں ہے
ہر دم متغیر تھے خرد کے نظریات
محرم نہیں فطرت کی سرودِ ازلی سے
بینائے کواکب ہو کہ دانائے نباتات[۴]''

مندرجہ بالا اشعار میں لینن نے خدا کے حضور میں اُن دلائل کا اظہار کیا ہے جن کی وجہ سے وہ خدا کی ذات پر یقین نہ کرسکا۔ چونکہ عقل انسانی کی دلائل زمانے کے ساتھ ساتھ خدا کی ذات کے تصور کو بھی بدل دیتی ہیں۔ اسی غفلت کا شکار لینن بھی ہوا۔ چونکہ وہ اب خدا کی ذات اور خدا کا دیدار اپنی آنکھوں سے کررہا ہے۔ اس لئے اس پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے

آج آنکھ نے دیکھا تو وہ عالم ہوا ثابت
میں جس کو سمجھتا تھا کلیسا کے خرافات
ہم بندِ شب و روز میں جکڑے ہوئے بندے
تو خالقِ اعصار و نگارندۂ آفات

آگے چل کر لینن پھر وہی سوال کرتا ہے جس کو دنیا کے تمام فلسفی حکیم اور سائنسدان حل نہ کرسکے۔ یعنی ''خدا کی ذات'' چنانچہ علامہ نے اس بات کو شاعرانہ انداز میں یوں پیش کیا ہے:

اک بات اگر مجھ کو اجازت ہو تو پوچھوں
حل کر نہ سکے جس کو حکیموں کے مقالات
جب تک میں جیسا خیمۂ افلاک کے نیچے
کانٹے کی طرح دل میں کھٹکتی رہی یہ بات
گفتار کے اسلوب پر قابو نہیں رہتا
جب روح کے اندر متلاطم ہوں خیالات
وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود
وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات[5]

دراصل یہ سوال بھی کم حقیقت افروز نہیں ہے جس میں لینن اس آدم کی تلاش میں ہے جس کا معبود خدا ہے۔ مطلب یہ کہ اگر آدم مغربی ہے تو وہ مادہ پرست ہے اگر مشرقی ہے تو وہ مغرب پرست ہے اور یہی وجہ ہے کہ دونوں میں کوئی آدم ایسا نہیں جس کا معبود خدا ہے کیونکہ خدا کی بندگی کرنے کو کوئی بھی تیار نہیں۔ اور حقیقی طور کوئی بھی بندہ خدا کو معبود تصور نہیں کرتا۔

مشرق کے خداوند سفیدانِ فرنگی!
مغرب کے خداوند درخشندہ فِلِزات!

علامہ اقبال کے نزدیک سرمایہ دار لوگ غریبوں کا خون چوس رہے ہیں اور اب اس بات کا احساس مزدور کو ہوگیا ہے اس احساس کی بدولت سرمایہ داری کی عمارت متزلزل ہوگئی ہے اور اس انقلاب سے سرمایہ دار پریشان ہیں۔ ان کے چہروں پر جو سرخی ہے وہ نقلی ہے۔ لینن قانون مکافات کا

عمل اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اُسے روز مکافات کا یقین بھی ہو چکا ہے۔اس لئے وہ اس بات کی پیشن گوئی کرتا ہے کہ ؎

آثار تو کچھ کچھ نظر آتے ہیں آخر
تدبیر کو تقدیر کے شاطر نے کیا مات
میخانے کی بنیاد میں آیا ہے تزلزل
بیٹھے ہیں اسی فکر میں پیران خرابات
چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سرِ شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات[6]

علامہ اقبال نے اس نظم میں ایک حقیقت کو بیان کرتے ہوئے لینن کی زبانی اس حقیقت کا اظہار کروایا ہے۔ جو اشترا کی نظام اور اس کے اثرات کے علاوہ مغرب کے تمام حالات و واقعات کی نقاب کشائی کرتی ہے۔ اس نظم میں کردار کے ساتھ علامہ نے جو ہمدردی ظاہر کی ہے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

''ایک سپاس نظم میں شاعری کی جتنی تصویریں اور ترنم کی جتنی تانیں جمع ہو گئی ہیں تفکر کو تخلیق بنانے کے لئے کافی ہیں۔ کردار نگاری میں حقیقت پسندی مکالمہ نگاری میں نکتہ وری، مناسب تمہید مربوط ارتقا موزوں خاتمہ سب اجزا مل کر ایک کل کی ترتیب کرتے ہیں۔ اس کل کی نتیجہ خیز تشکیل میں موضوع کی مکمل آگاہی کے ساتھ کردار کے لیے ہم دردی بھی ایک موثر رول ادا کرتی ہے''[7]

علامہ اقبال نے لینن کے کردار کو اس نظم میں خود لینن کے ہی ماحول اور حالات میں پیش کیا ہے۔ جیسا کہ ڈاکٹر عبدالغنی لکھتے ہیں:

"لینن نے مغربی سامراج کے لادین استبداد کے خلاف جو بغاوت کی وہ بالکل بجا تھی اور اس نے وقت کی ایک اہم ضرورت پوری کی، لیکن ایک انسان ہونے کے سبب اس کے ذہن کی کچھ حدود تھیں، چناں چہ وہ اپنے ماحول سے آگے نہ دیکھ سکا۔ بلکہ ماحول کے خلاف ردِ عمل میں اتنا محو رہا کہ اس نے کسی مثبت تصور پر غور نہیں کیا اور ساری عمر اپنے معاشرے کے نقائص کی نفی میں لگا رہا۔ کلیسا، سامراج اور سرمایہ داری۔ مغرب کے مذہبی سیاسی اور معاشی اداروں ...... نے مل کر لینن کو اپنے سماج سے مایوس کر دیا اور اس نے پوری شدت، غلو اور انتہا پسندی کے ساتھ اس انقلاب کا بیڑہ اٹھایا۔ لینن کا پورا مکالمہ اسی انقلابی موقف سے ہے اور بالکل مطابق کردار ہے نظم کے آخری دو شعر اسی لینن کے بالکل موزوں اور مناسب حال واقوال ہیں" [۸]

علامہ اقبال نے لینن کے کردار کو اس نظم میں پیش کر کے مغربی نظام پر پوری تنقید کر کے ان نظریات کو واضح کر دیا ہے۔ سرمایہ داری نظام اور اس کا زوال، اشتراکی نظام، مزدور کی بے کسی اور سرمایہ داروں کی مکاری، غرض تمام تر چیزوں کو نظم میں ایک ہی کردار کے ذریعہ پیش کیا۔

آخر میں خدا سے اس آرزو کے ساتھ نظم کا خاتمہ کیا گیا ہے کہ کب مزدور کو مزدوری کا پھل مل جائے اور اس سرمایہ داری کا زوال ہوگا۔ اس

لئے صرف روز مکافات کا انتظار ہے۔

کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر روزِ مکافات

اقبال نے ''پیامِ مشرق'' کی ایک نظم میں بھی لینن کا ذکر کیا ہے۔ یہاں لینن اور قیصر ولیم کے درمیان گفتگو کو پیش کر دیا گیا اور انسان کی غلامی کا ذکر کیا گیا ہے۔

موسولینن و قیصر ولیم موضوع کے تحت لکھی گئی اس نظم میں لینن کہتا ہے کہ مزدور نے آخر اپنے ظالم آقاؤں کو ختم کر دیا مگر قیصر ولیم اس بات سے متفق نظر نہیں آتے۔ ان کے مطابق مزدور کی حالت وہی ہے صرف آقا بدل جاتے ہیں۔ اور غلامی انسان کی فطرت میں ہے۔ انسان کی حالت بدل نہیں گئی۔

بسے گزشت کہ آدم درین سرائے کہن
مثال دانہ تہ سنگ آسیا بود است
فریب زاری و افسونِ قیصری خورد است
اسیر حلقہ دام کلیسا بود است
غلام گر سینہ دیدی کہ بر درید آخر
قمیض خواجہ کہ رنگین ز خونِ مابود است
شرارِ آتش جمہور کہنہ سامان سوخت
روئے پیر کلیسا قبائے سلطان سوخت

قیصر ولیم اس کا جواب دیتے ہیں۔

زِ جورِ رہزنان کم گو کہ رہرو
متاعِ خویش را خود راہزن ہست
اگر تاج کئی جمہور پوشد
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست
ہوس اندر دلِ آدم نہ میرد
ہماں آتش میانِ مرزغن ہست
عروسِ اقتدارِ سحرِ فن را
ہماں پیچاک زلف پُر شکن ہست
نماند نازِ شیریں بے خریدار
اگر خسرو نہ باشد کوہ کن ہست[9]

❁❁❁

علامہ اقبالؒ اور مسولینی

علامہ اقبال نے مسولینی کی شخصیت کا ذکر ''بالِ جبریل'' اور ''ضرب کلیم'' کی دو نظموں میں کیا ہے۔ انہوں نے ان کی زندگی اور ان کے کردار وعمل کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ موصوف اطالیہ کا ایک آمر تھا جس نے مزدوروں کی حمایت کر کے سوشلزم کی حمایت کی۔

مسولینی کی شخصیت بھی نپولین کی طرح ایک ایسی شخصیت تھی جو جدت کردار، ندرت فکر وعمل، ذوق انقلاب، جرأت، جفاکشی اور سوزِ آرزو جیسے اوصاف سے پُر تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال بھی ان کے اوصاف سے متاثر تھے۔ اس لئے انہوں نے مسولینی کا ذکر کر کے انہیں خراج تحسین پیش کیا۔ علامہ اقبال کو جہاں کہیں بھی اپنے نکتہ نظر کی تائید ملی اسے قبول کرلیا۔ انہیں مسولینی کا حرکت وعمل کا نظریہ بہت پسند تھا۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے علی سردار جعفری لکھتے ہیں:

''اقبال کا بھی وہی خیال ہے جو مسولینی کہا کرتا تھا یعنی ''جنگ لہو گرم رکھنے کا ایک بہانہ''[1]

اقبالؔ حرکت اور محنت کے علاوہ کردار پر بھی زور دیتے ہیں اور ایک ایسے شخص کی تلاش میں ہیں جو اپنے لئے خود اپنی منزل تلاش کرے۔ چنانچہ

اختر حسین رائے پوری لکھتے ہیں۔

''یہ فیض مسولینی کا ہے جو اطالیہ کی بہبودی کے لئے ساری دنیا کو فنا کر سکتا ہے۔ جو اطالیہ کے سرمایہ داروں کا سپہ سالار ہے جو جنگ کو انسانیت کے لیے شیرِ مادر بتاتا ہے۔ اقبال ایسے ڈکٹیٹر کو ہی اسلامی پاکستان کا ضامن سمجھتا ہے'' [2]

اسی طرح عزیز احمد کے نزدیک بھی علامہ کو سکندر اور مسولینی کی جو چیز پسند آئی وہ اُن کا ذوق حرکت وانقلاب ہے۔

علامہ اقبال نے مسولینی کا ذکر کر کے مسولینی کی زندگی، کردار اور عمل کے علاوہ اُن کی عظیم شخصیت کو ابھارا ہے۔ جس کی بہادری نے ساری دنیا کو چیلنج کیا۔

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کُشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ ''ضرب کلیم'' اور ''بال جبریل'' میں مسولینی پر اقبال کی دو نظمیں موجود ہیں ایک نظم کا عنوان ''مسولینی'' (اپنے مشرقی و مغربی حریفوں سے) اور دوسری نظم کا عنوان ''مسولینی'' ہے۔ اس کے علاوہ اقبال نے ایک نظم بعنوان ''ابی سینا'' میں مسولینی کے اس جابرانہ اور ظالمانہ رویہ کی مذمت کی ہے جب اطالیہ نے ابی سینا پر حملہ کیا تھا۔ علامہ اقبال نے بڑی خوش اسلوبی اور غیر معمولی شعری صلاحیتوں کے ساتھ مسولینی کی آمرانہ شخصیت کو اس نظم میں پیش کیا ہے۔ علامہ نے پہلے ہی

شعر میں مسولینی کے کردار کے ذریعہ مغرب کے اس ظالمانہ اور جابرانہ کردار کی نقاب کشائی کی ہے۔جس کے پیچھے وہ تمام برائیاں چھپی ہوئی ہیں جو مغرب والے راز میں رکھ کران کوتہذیب کا نام دیکر دنیا پر ظلم کرتی ہیں۔اور تمام دنیا کو مظلوم اور محکوم بنانے کی کوشش کر کے غریبوں اور مزدوروں کا خون چوستے ہیں اور انہیں تباہ و برباد کر کے چھوڑتے ہیں۔ اس لئے مسولینی خود اپنے حریفوں سے اعلانیہ یہ راز فاش کر دیتا ہے اور کہتا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم؟
بے محل بگڑا ہے معصومان یورپ کا مزاج
میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو بُرا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج
میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج
یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج
آلِ سیزر چوب نے کی آب یاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوو بے خراج
تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشت دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آری کشی
کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج [۳]

یہ اشعار اقبال نے ۲۲ راگست ۱۹۳۵ء کو بھوپال (شیش محل) میں لکھے ہیں۔

علامہ اقبال نے یورپ اور اس کے حکمرانوں کی کردار کی اصلیت ظاہر کی ہے۔ مذکورہ نظم میں اقبال نے اسی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے کہ یورپ کے حکمران تہذیب کے پردہ کے اندر لوگوں پر کتنا ظلم وستم کرتے ہیں۔ مسولینی کی زبان سے محکوم اور مظلوم اقوام کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ان قوموں کو جابرانہ اور ظالمانہ طور پر محکوم اور مظلوم بنا دیا گیا ہے۔ نظم میں ان بادشاہوں کا ذکر بھی ہے جن کا تخت و تاج لوٹ کر ان کا نام ونشان مٹا دیا گیا۔ مسولینی کی زبانی یہ بات واضح کر دی گئی ہے کہ یورپ والے بنجر زمین سے بھی ٹیکس وصول کرتے ہیں جبکہ اٹلی والے اس کو آباد کرتے ہیں۔ اسلئے مسولینی صاف الفاظ میں یہ بات کہتے ہیں کہ کل تک تم نے جس کام کو روا رکھا آج میں اسے روا رکھتا ہوں۔

اقبال نے ''بال جبریل'' میں بھی مسولینی پر ایک نظم لکھی ہے۔ مذکورہ نظم سات اشعار پر مشتمل ہے۔

ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے؟ ذوق انقلاب
ندرت فکر و عمل کیا شئے ہے؟ ملت کا شباب
ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی
ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعل ناب

رومتہ الکبری دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر
اینکہ می بنیم بہ بیداری است یارب یا بخواب
چشم پیران کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجوان تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب
یہ محنت کی حرارت یہ تمنا یہ نمود
فصل گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیر حجاب
نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رُباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے
وہ کی جس کی نگہ مثل شعاعِ آفتاب[۴]

مندرجہ بالا نظم میں علامہ اقبال نے مسولینی کی ندرت فکر وعمل ، ذوق انقلاب ،سوز آرزو اور جفاکشی جیسی خصوصیات کو ظاہر کرکے مسولینی کی شخصیت کوخراج تحسین ادا کیا ہے۔

علامہ اقبال مسولینی کے ان اوصاف کو سراہاتے ہیں اور اس وجہ سے وہ ان سے متاثر بھی نظر آتے ہیں۔ علامہ اقبال اور مسولینی کی ملاقات ۲۷ رنومبر ۱۹۳۱ء کو ہوئی۔ چنانچہ علامہ اقبال نے مسولینی کی دعوت قبول کی۔ یہ ملاقات اقبال اور مسولینی کے درمیان ایک عظیم الشان ہال میں ہوئی۔ اس ملاقات میں کئی مسئلوں پر بحث ہوئی۔ مسولینی اپنے کام میں اس وقت اس درجہ منہمک تھا کہ جب علامہ ہال میں داخل ہوئے تو

انہوں نے آنکھ آٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ جب علامہ نزدیک پہنچے تو مسولینی نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے بڑھایا۔ علامہ اقبال اس کے حسنِ اخلاق، شان وشوکت، اس کے مضبوط جسم کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ رسمی مزاج پرسی کے بعد مسولینی نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا: ''میری فاشٹ تحریک کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟'' اقبال نے جواب دیا'' آپ نے ڈسپلن کے اصول کا بڑا حصہ اپنالیا ہے۔ جیسے اسلام انسانی نظامِ حیات کے لیے ضروری سمجھتا ہے لیکن اگر آپ اسلام کے نظریۂ حیات کو پوری طرح اپنالیں تو سارا یورپ آپ کے تابع ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی بات تھی جو مسولینی کو ذرا کم سمجھ آسکتی تھی۔ مسولینی نے علامہ سے اٹلی کے قیام کے تاثرات پوچھے۔ اس پر علامہ نے بتایا:

''میں اطالیوں کے متعلق سمجھتا ہوں کہ وہ ایرانیوں سے کافی حد تک مشابہت رکھتے ہیں اور بڑے ذہین وفطین ہیں۔ خوب رو اور فن پرست ہیں۔ ان کے پیچھے تمدن کی کتنی ہی صدیاں ہیں مگر ان میں خوں نہیں ہے''[۵]

مسولینی نے حیرت سے پوچھا تو علام نے وضاحت کی:

''ایرانیوں کو ایک فائدہ میسر رہا ہے جو اطالیوں کو میسر نہیں اور وہ یہ ہے کہ ان کے اردگرد مضبوط اور توانا قومیں افغان، کرد اور ترک آباد ہیں جن سے وہ تازہ خون حاصل کرسکتے ہیں۔ آپ اطالوی ایسا نہیں کرسکتے''[۶]

اس پر مسولینی نے پوچھا: اچھا ہم اطالیوں کو کیا کرنا چاہیے۔ علامہ نے جواب دیا:

''یورپ کی تقلید سے منہ موڑ کر مشرق کا رخ کرو اس لئے یورپ کا اخلاق ٹھیک نہیں۔ مشرق کی ہوا تازہ ہے اس میں سانس لو''[ے]

اس ملاقات میں بہت سارے مشورے طلب کئے گئے۔ چنانچہ آبادی کے بارے میں علامہ نے مشورہ یوں دیا:

''شہر کی آبادی جس قدر بڑھتی ہے اس کی تہذیب اور اقتصادی توانائی بھی کم ہوتی ہے۔ اور ثقافتی توانائی کی جگہ محرکات شر لے لیتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی مشورہ نہیں بلکہ میرے پیغمبرؐ نے آج سے تیرہ سو سال پہلے یہ مصلحت آمیز ہدایت جاری فرمائی تھی جبکہ مدینہ منورہ کی آبادی ایک حد سے تجاوز کر جائے تو مزید لوگوں کو بسانے کے بجائے دوسرا شہر تعمیر کیا جائے''۔

یہ حدیث قدسی ہے۔ مسولینی اٹھ کھڑا ہوا اور دونوں ہاتھ میز پر زور سے مارے What an Excellent Idea کتنا خوبصورت خیال؟''[۸]

علامہ نے اس بات پر زور دیا کہ اطالیہ کے نوجوانوں کو اخلاقیات بنانے اور سنوارنے کے لئے مشرق کا رخ کرنے چاہیے اور ان کو مشرق کی تازہ ہوا میں سانس لینی چاہیے۔ علامہ اور مسولینی کے تعلقات کے پیش نظر عبدالغنی لکھتے ہیں:

''مسولینی سے اقبال کے تاثر کے سلسلے میں بعض دلچسپ خیال آرائیاں ہوئی ہیں۔ محض اس الزام میں انہیں فاشی تک قرار دیا گیا لیکن اس پر مذاق تخیل میں سنجیدگی اور حقیقت کو کہاں تک دخل ہے اس کا اندازہ دو باتوں سے ہوسکتا ہے۔ اقبال نے اطالیہ کے پُر شور ایام میں جب کہ مسولینی کی آمریت اپنے عروج پر تھی اس سے ملاقات کی۔ وہ ان کے نظریۂ خودی سے بہت متاثر تھا۔ چنانچہ ملاقات کے دوران اس نے اقبال سے درخواست کی کہ وہ اسے اطالیہ کے نوجوان کے متعلق کچھ نصیحت کریں۔ جو جواب انہوں نے دیا وہ آج بھی بالخصوص اہل مغرب کیلئے سرمایہ عبرت وبصیرت ہے۔ اس کا خلاصۂ مفہوم یہ ہے کہ اطالیہ جیسی ابھرتی ہوئی قوم کو اپنے صحیح واستوار وارتقاء کے لئے مشرق کی روحانیت اور اس قوت وحیات کی ضرورت ہے جو اس سرزمین کی فطری سادگیوں میں پوشیدہ ہے۔ اور کہا کہ اطالیہ کا موجودہ مادی رجحان اس کے عزائم کی برآری کے لیے چنداں مفید نہیں''[9]

علامہ اقبال کہتے ہیں کہ ندرت فکر وعمل سے ہی قوم میں شباب ہے اور اسی عمل کے ذریعہ ہی قوم معجزات اور ترقی کی راہیں ڈھونڈ سکتی ہے۔ اس لئے علامہ کو اطالوی قوم میں ایک قسم کا انقلاب نظر آتا ہے جو صرف انہیں مسولینی ہی کی شخصیت کے ذریعے نصیب ہوئی۔

رومۃ الکبریٰ! دگرگوں ہوگیا تیرا ضمیر
اینکہ می بینم بہ بیداری است یا رب یا بخواب

چشم پیران کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجوان تیرے ہیں سوز آرزو سے سینہ تاب
یہ محبت کی حرارت ، یہ تمنا ، یہ نمود
فصل گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

علامہ کہتے ہیں کہ جب کسی قوم میں بیداری کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے تو وہ قوم ترقی کی راہ پر گامزن ہو کر گمنامی کی حالت میں نہیں رہ سکتی اور سر فروشی سے سر بلندی حاصل کر سکتی ہے۔ انسان کے اندر خودی کا جذبہ ہونا چاہیے اور خودداری سے جینا ہی زندگی کا اعلیٰ مقصد ہے۔ اطالیہ قوم کو یہ بلندی دراصل مسولینی کی ہی بدولت نصیب ہوئی ہے۔

نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا مخمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب
فیض یہ کس کی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے
وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاع آفتاب

اطالیہ کا کونہ کونہ ترقی کے نعروں سے معمور ہے۔ اور ہر انسان کے دل میں تیری بلندی کا جذبہ موجزن ہے۔ دراصل یہ اسی شخصیت کی وجہ سے ہے جس کی نگاہ شعاع آفتاب کی طرح ہے۔

علامہ اقبال مسولینی کی متحرک اور خوددار شخصیت کا اسلامی ممالک اور اسلامی دنیا میں ہونا لازمی سمجھتے تھے۔ مسولینی کی یہی وہ خصوصیات ہیں جنکی وجہ سے اُن کی شخصیت باعث رشک ہے اور جن کی بدولت اطالیہ

ایک زِندہ قوم بن گئی۔

علامہ نے مسولینی کے جبر وقہر اور ظلم کے علاوہ اس کی جوع الارض کی حرص کی مذمت ایک اور نظم میں کی، جو انہوں نے ۸/اگست ۱۹۳۵ء کو ابی سینا میں لکھی۔ مسولینی نے حبشہ پر چڑھائی کر کے وہ بات ثابت کر دی کہ ہر ظالم اور جابر حکمران مزدوروں اور غریبوں کا کس طرح استحصال کرتا ہے جب اٹلی نے بلا وجہ ابی سینا پر حملہ کر دیا تو علامہ کو اس بات کا بے حد افسوس ہوا۔ اور انہوں نے مسولینی کی اس حرکت پر یورپ والوں کو اس کی مذمت نہ کرنے پر کہا۔

یورپ کے کرگسوں کو نہیں ہے ابھی خبر
ہے کتنی زہرناک ابی سینا کی لاش
ہونے کو ہے یہ مردۂ دیرینہ قاش قاش
تہذیب کا کمال شرافت کا ہے زوال
غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش
ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش
اے وائے آبروئے کلیسا کا آئینہ
روما نے کر دیا سرِ بازار پاش پاش
پیر کلیسا! یہ حقیقت ہے دلخراش [۱]

مندرجہ بالا نظم میں علامہ نے یورپ کے کرگسوں کو ابی سینا کی لاش کے زہریلے اثرات سے باخبر کر کے ثابت کر دیا کہ اس واقعہ کے کچھ مدت

بعد ہی یورپ کا تماشا بھی دنیا نے دیکھا۔ مسولینی کی موت بُری طرح ہوئی۔ مغربی تہذیب نے دنیا میں وہی طور طریقے اختیار کیئے ہیں جو ایک بھیڑیا معصوم بکرے کے لیئے روا رکھتا ہے۔

مندرجہ بالا تینوں نظموں میں علامہ نے مسولینی کے مختلف روپوں کا منظر پیش کر کے اس کی حقیقت اور اصلیت کو ابھار کر مسولینی کی شخصیت کا خوب نقشہ کھینچا ہے۔ دراصل علامہ کو مسولینی کی شخصیت میں رحمانی اور شیطانی دونوں صفات نظر آئیں، اس بارے میں عبدالمجید سالک روایت کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کسی نے علامہ کو لکھا کہ آپ نے مسولینی کے متعلق دو نظمیں لکھی ہیں دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اس کی کیا وجہ ہے۔ اس پر آپ نے مختصر سا جواب دیتے ہوئے کہا:

> ''اگر اس بندۂ خدا میں رحمانی اور شیطانی صفات موجود ہوں تو اس کا میرے پاس کیا علاج ہے''[11]

مسولینی کے بارے میں علامہ اقبالؒ ۱۲/ مارچ ۱۹۳۷ء کو آل احمد سرور کے نام ایک خط کے جواب میں لکھتے ہیں:

> مسولینی کے متعلق جو کچھ میں نے لکھا ہے اس میں آپ کو تناقص نظر آتا ہے۔ آپ درست فرماتے ہیں لیکن اگر اس بندۂ خدا میں (Devil) شیطانی اور (Sad) ولی دونوں کی خصوصیات جمع ہوں تو اس کا میں کیا علاج کروں۔ مسولینی سے اگر آپ کی ملاقات ہو تو آپ اس بات کی تصدیق کریں گے کہ اس کی نگاہ میں ایک ناممکن البیان

تیزی ہے جس کو شعاع آفتاب سے تعبیر کر سکتے ہیں کم از کم مجھ کو اس کا احساس ہوا''۔[۱۲]

غرض علامہ نے مسولینی کی شخصیت کو پوری طرح سے دیکھا اور پرکھا تھا۔ اس شخصیت میں اقبال کو جہاں کہیں بھی اپنے نکتہ نظر کی تائید ملی، علامہ نے اسے اپنایا۔ انہیں مسولینی کی شخصیت میں وہ صفات نظر آئے جن کو وہ اپنی قوم کے اندر دیکھنا چاہتے تھے۔ مسولینی کی شخصیت میں سخت کوشی کی صفت موجود تھی جو زندگی کے لئے ضروری ہے اور زندگی جدوجہد کا دوسرا نام ہے بقول اقبال ؎

جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

جھپٹنا پلٹنا مراد ہے سخت کوشی سے نہ کہ جبر و ظلم سے

وہ فریب خوردہ شاہین کہ پلا ہو کرگسوں میں
اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی

علامہ اقبال اور آرنلڈ

علامہ اقبال نے دیگر مشاہیر کی طرح انگریزی اور فلسفہ کی ممتاز شخصیت اور اپنے اُستادِ مشفق سرٹامس آرنلڈ کو بھی اپنی شاعری میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ سرٹامس آرنلڈ پر انہوں نے ایک نظم لکھی ہے جو ''نالۂ فراق'' کے عنوان سے بانگِ درا میں موجود ہے۔ مذکورہ نظم علامہ نے سرٹامس آرنلڈ کی یاد میں کہی ہے۔ ۱۸۹۷ء میں سرٹامس آرنلنڈ گورنمنٹ کالج لاہور آئے اور یہاں اقبال کو ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہوا۔ آرنلڈ اور اقبال کے جو تعلقات استاد اور شاگرد کے رشتے سے شروع ہوئے تھے، انہوں نے بالآخر دوستی کی صورت اختیار کر لی۔ اقبال کے متعلق آرنلڈ نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ ''ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے''[1]۔ آرنلڈ جب ۱۹۰۴ء میں انگلستان واپس گئے تو اقبال نے ''نالۂ فراق'' لکھ کر اپنے استاد سے قلبی تعلق کا اظہار کیا۔

بنیادی طور پر علامہ کے یہاں فکر و فلسفہ کی تشکیل میں اُن کے استاد سرٹامس آرنلڈ کا ہاتھ اور اپنا طبی میلان شامل ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر عبدالحق اس بارے میں لکھتے ہیں:

''اقبال کے ذہن وفکر کی تعمیر وتشکیل میں تیسرا مدرسہ پروفیسر آرنلڈ کا ہے جن کی صحبت سے اقبال نے استفادہ کیا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ ایک متبحر عالم اور فلسفے کے استاد تھے۔اقبال نے باقاعدہ فلسفہ انہیں سے پڑھا ہے۔اقبال کس حد تک پروفیسر موصوف سے فیضیاب ہوئے ہیں۔ان کی نظم صاف بتا رہی ہے۔اقبال نے کتنے پُر درد الفاظ میں ان کا ماتم کیا ہے۔وہ بھی اس اشارے کی وضاحت کر رہا ہے۔ پروفیسر آرنلڈ محض استاد نہ تھے بلکہ ایک رفیق دوست، شفیق استاد بھی تھے۔ پروفیسر آرنلڈ کی صحبت نے اقبال کے ذہن وفکر میں ایک جلا پیدا کی،''[۲]

علامہ اقبال اور آنلڈ کے جو آپسی تعلقات تھے وہ غیر معمولی تھے۔ایک طرف استاد اور شاگردی کا رشتہ پھر آگے بڑھ کر یہ تعلقات دوستی میں تبدیل ہوگئے۔اتنا ہی نہیں بلکہ اقبال کو اگر کبھی کہیں مشکلات کا سامنا ہوا تو آرنلڈ صاحب نے ان کی کافی مدد کی تاکہ مشکلات دور ہو جائیں۔ ایک دفعہ جب علامہ ہسپانیہ کی مسجد قرطبہ میں نماز اور اذان پڑھنے کی اجازت چاہتے تھے چونکہ قانون کی رُو سے اس مسجد میں نماز اور اذان دونوں کو ممنوع قرار دیا گیا تھا، اس وقت علامہ کی یہ مشکل سر ٹامس آرنلڈ ہی کی کوشش سے دور ہوگئی اور علامہ کی یہ آرزو بھی پوری ہوگئی۔انہیں مسجد میں اذان دینے اور نماز پڑھنے کی اجازت اس شرط پر دی گئی کہ وہ مسجد کے اندر داخل ہوتے ہی اندر سے دروازہ مُقفّل کر دیں۔

علامہ کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آ گیا جب انہوں نے شاعری ترک کرنے کا مصمم ارادہ کیا تھا مگر سر عبدالقادر کے اصرار پر انہوں نے یہ فیصلہ آرنلڈ پر چھوڑ دیا اور یہ طے پایا گیا کہ اگر ٹامس آرنلڈ شاعری ترک کرنے کو کہیں گے تو ویسا ہی ہوگا۔ اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے سر عبدالقادر لکھتے ہیں:

"...........آخر یہ قرار پایا کہ آرنلڈ صاحب کی رائے پر آخری فیصلہ چھوڑا جائے۔ اگر وہ مجھ سے اتفاق کریں تو شیخ صاحب اپنے ارادۂ ترک شعر بدل دیں، اور اگر وہ شیخ صاحب سے اتفاق کریں تو ترکِ شعر اختیار کیا جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ علمی دنیا کی خوش قسمتی تھی کہ آرنلڈ صاحب نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور فیصلہ یہی ہوا کہ اقبال کے لیے شاعری کو چھوڑنا جائز نہیں" [۳]

علامہ اور آرنلڈ دونوں کے درمیان قریبی تعلقات تھے اور علامہ اپنے شفیق استاد کی بڑی قدر و منزلت کرتے تھے۔ اقبال ان کے تبحر علمی سے کافی مستفید ہوئے۔ انہوں نے آرنلڈ سے فلسفہ کی تعلیم حاصل کی۔ اس تعلیم نے اقبال کے لیے دنیا کے تمام فلسفوں سے آگاہی حاصل کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا۔ سر عبدالقادر اقبال اور سر ٹامس آرنلڈ کے متعلق لکھتے ہیں:

"سیالکوٹ کالج میں ایف۔ اے کے درجے تک تعلیم تھی۔ بی۔ اے کے لئے شیخ محمد اقبال کو لاہور آنا پڑا۔ انہیں علم و فلسفہ کی تحصیل

کا شوق تھا اور انہیں لاہور کے اساتذہ میں ایک نہایت شفیق استاد ملا۔ جس نے فلسفہ کے ساتھ ان کی مناسبت دیکھ کر انہیں خاص توجہ سے پڑھانا شروع کیا۔ پروفیسر آرنلڈ صاحب جو اب سرٹامس آرنلڈ ہوگئے ہیں اور اب انگلستان میں مقیم ہیں، غیر معمولی قابلیت کے شخص ہیں۔قوت تحریر ان کی بہت اچھی ہے اور وہ علمی جستجو اور تلاش کے طریق جدید سے خوف واقف ہیں۔ انہوں نے چاہا کہ اپنے شاگرد کو اپنے مذاق اور اپنے طرزِ عمل سے حصہ دیں اور وہ اس ارادے میں بہت کچھ کامیاب ہوئے............اب انہیں یہاں ایک اور قابل جوہر نظر آیا۔ جس کے چمکانے کی آرزو ان کے دل میں پیدا ہوئی اور جو دوستی اور محبت استاد اور شاگرد میں پہلے دن سے پیدا ہوئی وہ آخرش شاگرد کو استاد کے پیچھے پیچھے لے گئی اور وہاں یہ رشتہ اور بھی مضبوط ہوگیا، اور آج تک قائم ہے۔آرنلڈ خوش قسمت ہے کہ میری محنت ٹھکانے لگی اور میرا شاگرد علمی دنیا میں میرے لئے باعث شہرت افزائی ہوا، اور اقبال معترف ہے کہ جس مذاق کی بنیاد سید حسن نے ڈالی تھی اور جسے درمیان میں داغ کے غائبانہ تعارف نے بڑھایا تھا اس کے آخری مرحلے آرنلڈ کی شفیقانہ رہبری سے طے ہوئے'' [۴]

یہی وہ بنیادی باتیں ہیں جن سے دونوں کے تعلقات مستحکم ہوئے ،اور یہی وجہ ہے کہ علامہ نے اپنے اس شفیق استاد اور قریبی دوست ٹامس آرنلڈ کی یاد میں وہ نظم کہی جو ''بانگ درا'' میں ''نالۂ فراق'' کے عنوان

سے موجود ہے۔علامہ نے مذکورہ نظم ۱۹۰۴ء میں لکھی جب آرنلڈ انگلستان روانہ ہوئے۔علامہ نے اس نظم میں ان جذبات کی عکاسی کی ہے جواُن کے دل میں اپنے استاد کے لئے موجود تھے۔علامہ اقبال کے مطابق ان کی رخصت کے وقت بہت سے الوداعی جلسے کئے گئے، اقبال کو آرنلڈ سے جو محبت اور عقیدت تھی اس کا اظہار آرنلڈ سے جدائی پر نظم کی صورت میں ہوا۔ یہ نظم علامہ کے ان قلبی تاثرات کا اظہار کرتی ہے جو علامہ پر آرنلڈ کی جدائی سے اثر پزیر ہوئے۔آرنلڈ کے انگلستان جانے سے علامہ کے دل میں جو درد وغم پیدا ہوا تھا اور انہیں جس بے چینی اور بے قراری سے گذرنا پڑا اس کی شدت کا احساس اس نظم کے اس نوٹ یا شذرہ سے ہوتا ہے جو علامہ اقبال نے مخزن ۱۹۰۴ء کے مئی کے شمارے میں نظم کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ چنانچہ انہی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ لکھتے ہیں:

''استاد ذی قبلہ مسٹر آرنلڈ کے ولایت تشریف لے جانے کے بعد ان کی جدائی نے اقبال کے دل پر کچھ اس قسم کا اثر کیا کہ کئی دنوں تک مسکنت قلبی کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ایک روز زورِ تخیل نے ان کے مکان کے سامنے لا کھڑا کر دیا اور یہ چند اشعار بے اختیار زبان پر آگئے جن کی اشاعت پر احباب مجبور کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی رخصت کے موقعہ پر بہت سے الوداعی جلسے کئے گئے اور ان میں بہت سی نظمیں پڑھی گئیں اور یہ نظم اس وقت لکھی بھی جا چکی تھی تاہم اس

خیال سے کہ اس میں میرے ذاتی تاثرات کا ایک درد آمیز اظہار تھا، کسی عام جلسے میں اس کا پڑھنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ آپ کی تشریف بری کے بعد دلی تاثرات کی شدت اور بھی بڑھ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نظم میں بہت سی تبدیلی ہوگئی''[5]

نظم ملاحظہ کیجئے:

جا بسا مغرب میں آخر اے مکاں تیرا مکیں
آہ! مشرق کی پسند آئی نہ اس کو سر زمین
آگیا آج اس صداقت کا مرے دل کو یقین
ظلمتِ شب سے ضیائے روزِ فرقت کم نہیں
''تازِ آغوشِ و داعش داغِ حیرت چیدہ است
ہمچو شمعِ کشتہ در چشمم نگہ خوابیدہ است''

کشتۂ عُزلت ہوں، آبادی میں گھبراتا ہوں میں
شہر سے سودا کی شدت میں نکل جاتا ہوں میں
یادِ ایامِ سلف سے دل کو تڑپاتا ہوں میں
بہرِ تسکیں تیری جانب دوڑتا آتا ہوں میں
آنکھ گو مانوس ہے تیرے در و دیوار سے
اجنبیت ہے مگر پیدا مری رفتار سے

ذرہ میرے دل کا خورشید آشنا ہونے کو تھا
آئینہ ٹوٹا ہوا عالم نما ہونے کو تھا
نخل میری آرزوؤں کا ہرا ہونے کو تھا
آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا!
ابرِ رحمت دامن از گلزارِ من برچید و رفت
اند کے بر غنچہ ہائے آرزو بارید و رفت

تو کہاں ہے اے کلیمِ ذروۂ سینائے علم!
تھی تیری موجِ نفس بادِ نشاط افزائے علم
اب کہاں وہ شوقِ رہ پیمائی صحرائے علم
تیرے دم سے تھا ہمارے سر میں بھی سودائے علم
"شورِ لیلیٰ کو کہ باز آرائشِ سودا کند
خاکِ مجنوں را غبارِ خاطرِ صحرا کُنُد"

کھول دیگا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو
دیکھتا ہے دیدۂ حیراں تری تصویر کو
کیا تسلی ہو مگر گرویدۂ تقریر کو؟
"تابِ گویائی نہیں رکھتا دہن تصویر کا
خامشی کہتے ہیں جس کو ہے سخن تصویر کا"

یہ نظم آٹھ بندوں پر مشتمل تھی اور مخزن کے ۱۹۰۴ء کے مئی کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ مگر ''بانگ درا'' کی ترتیب کے وقت تین بند حذف کیے گئے۔ حذف کیے گئے تین بند یوں ہیں:

ہوگئی رخصت مسرت غم مرا ہمدم ہوا
دفترِ صبر و شکیبائی جو تھا ، برہم ہوا
کچھ عجب اس کی جدائی میں مرا عالم ہوا
دل مرا منت پذیرِ نالۂ پیہم ہوا
حاضراں از دور چوں محشر خروشم دیدہ اند
دیدہ ہا باز است لیک از راہ گوشم دیدہ اند

دجلہ ریزی کر رہا ہے دیدۂ پر خوں مرا
صورتِ سیماب مضطر ہے مخزوں مرا
درد فرقت سے ہے رنگین نالۂ موزوں مرا
داغ حرماں ہے سراپا ہر گل مضموں مرا
آہ! وہ حاصل نہیں اوروں کی مدحت میں مجھے
لطف جو ملتا تھا کچھ تیری ملامت میں مجھے

زندگانی کا دامن انسان میں گویا خار ہے
آرزو کا دِل میں سینہ میں نفس کا خار ہے
یوں تو اس عالم کے ہر ذرّے سی اگتا خار ہے
خار فرقت کا مگر سب سے نکیلا خار ہے
''زندگانی در جگر خار است و دریا سوزن است

تا نفس باقی است در پیرہن ما سوزن است''[۶]

مندرجہ بالا نظم میں علامہ نے اپنے استاد مشفق سے جو عقیدت ظاہر کی ہے وہ دونوں کے باہمی تعلقات کا بین ثبوت پیش کرتی ہے۔ مذکورہ نظم میں سرٹامس کے انگلستان واپس جانے سے علامہ کو جو دکھ ہوا تھا اس کا اظہار کرتے ہوئے انہیں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اُن کی دنیا تاریک ہوگئی ہو۔ علامہ مایوسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تنہائی میں مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا اور جب یاد کافی ستاتی ہے تو میں اس مکان کی طرف واپس آتا ہوں جہاں میرا محبوب رہتا تھا۔ مگر محبوب کی عدم موجودگی میں مکان ایک اجنبی سا مقام لگتا ہے۔ اور خود کو ایک اجنی تصور کرتا ہوں۔

اگلے بند میں علامہ نے اپنے اس شدید جذبے کی عکاسی کی ہے جسمیں علامہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آرنلڈ سے وہ اب جس علم سے فیضیاب ہونا چاہتے تھے وہ ناممکن ہے۔ اقبال کا یہ کہنا ع

آہ! کیا جانے کوئی میں کیا سے کیا ہونے کو تھا

اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے اور علامہ پروفیسر آرنلڈ کی رُخصتی سے علمی محرومی کا رونا روتے ہیں۔ چنانچہ آرنلڈ کی فیض رساں صحبت اور رہنمائی میں علامہ کی علمی تکمیل کی جو صورت پیدا ہو رہی تھی وہ اُن کے انگلستان روانہ ہونے سے ادھوری رہ گئی۔

استاد کی محبت اقبال کی اس جذباتی کیفیت اور علمی تشنگی کا اظہار کرتے

ہوئے پروفیسر صدیق جاوید لکھتے ہیں:

''اقبال کی جذباتی کیفیت اور علمی تشنگی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ اگر مالی مجبوریاں یا کوئی دوسرے اسباب اقبال کے سدِ راہ نہ ہوتے تو عین ممکن ہے کہ اقبال آرنلڈ کے ساتھ ہی عازم انگلستان ہو جاتے۔ اقبال کے دل میں علم کی جو بے پناہ خواہش تڑپنے لگی تھی اس کی تکمیل ولایت میں آرنلڈ کے حضور میں ہوسکتی تھی۔ استاد کی محبت اور علمی اشتیاق نے اقبال کی جو اعتماد اور یقین بخشا، وہ دیکھنے کے قابل ہے

کھول دے گا دستِ وحشت عقدۂ تقدیر کو
توڑ کر پہنچوں گا میں پنجاب کی زنجیر کو

............آرنلڈ صاحب کے سال سوا سال بعد علامہ اقبال ۱۹۰۵ء میں انگلستان پہنچے اور وہاں کیمبرج یونیورسٹی کے ٹرینٹی کالج میں اپنے اعلیٰ تعلیمی سلسلے کا آغاز کیا'' [۷]

آرنلڈ کے تئیں اقبال کے والہانہ لگاؤ نے کبھی انہیں علم کا سمندر اور کبھی ذروۂ سینا علم کہہ کر پکارا۔ اقبال کی زندگی کے تعمیر و تشکیل میں آرنلڈ کا پورا دخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے عقیدے کے طور پر کہدیا:

آہ! وہ حاصل نہیں اوروں کی مدحت میں مجھے
لطف جو ملتا تھا کچھ تیری ملامت میں مجھے

آرنلڈ کی سیرت اور ان کی سادگی کا ذکر کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی

لکھتے ہیں ''ان کو کامل مسلمان نہ سہی تو نیم مسلمان ضرور ہی ماننا پڑیگا'' [8]

اس کے علاوہ مولوی عبدالحق ان کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار یوں کرتے ہیں:

''میں نے کالج میں انہیں (آرنلڈ کو) کبھی انگریزی لباس میں نہ دیکھا۔ وہ کالج میں عربی لباس میں آتے تھے۔ سر پر عمامہ، بدن پر عبا وقبا اور پیروں میں سلیم شاہی جوتا اور ہاتھ میں موٹے دستے کی چھتری لئے جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے ٹھیک وقت پر آجاتے۔ راستے میں کوئی دیکھے تو یہ معلوم ہو مُلاّ جی کسی مسجد میں درس دینے جارہے ہیں'' [9]

علامہ اقبال پروفیسر آرنلڈ سے کافی متاثر ہوئے اور اقبال کو ان سے کافی عقیدت تھی جس کا اظہار انہوں نے لیڈی آرنلڈ کے نام ایک خط میں یوں کیا ہے۔ چونکہ یہ خط اقبال نے آرنلڈ کی وفات پر ۱۶/جولائی ۱۹۳۰ء کو لکھا۔ اس میں آرنلڈ کی عظمت کا اعتراف میں لکھتے ہیں:

مائی ڈیر لیڈی آرنلڈ

جب سر ٹامس آرنلڈ کی بے وقت موت کی خبر ہندوستان پہنچی، ہم سب کو کس قدر شدید صدمہ ہوا۔ میرے لئے نینسی Nancy اور آپ کو یہ بتانا ممکن نہیں؛ جیسا کہ آپ جانتی ہیں کہ ان کے شاگرد اور وہ سب جنہیں ان کے ساتھ کسی طور پر بھی واسطہ پڑا ان سے محبت کرتے تھے۔ میں جانتا ہوں اظہار غم کے الفاظ آپ کے لیے کچھ زیادہ تسلی کا باعث نہیں

ہو سکتے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ انگلستان، ہندوستان اور تمام ملکوں کے لوگ جہاں ان کا کام ایک عظیم مستشرق کے متعارف ہے آپ کے غم میں شریک ہیں بلاشبہ ان کی موت جس طرح برطانوی سکالرشپ کے لئے عظم نقصان ہے اسی طرح دنیائے اسلام کے لئے بھی ہے جس کے فلسفہ اور ادب کی پُر جوش خدمت انہوں نے اپنی حیاتِ ارضی کے آخری لمحہ تک سرانجام دی۔ میرے لئے یہ ذاتی نقصان ہے کیونکہ میرا ان کے ساتھ تعلق رہا تھا جس نے میری شخصیت کی تشکیل کی اور ایسے علم کے راستے پر ڈالا بے شک ہمارے نقطۂ نظر سے وہ زندگی کا منور شعلہ بجھ گیا ہے لیکن یہ میرا پختہ یقین ہے کہ ان لوگوں کے ہاں، جو ان کی طرح اپنی زندگیاں محبت اور خدمت کے لیے وقف کرتے ہیں موت کے معنی مزید روشنی کے ہوتے ہیں۔

میں خلوص دل سے دعا کرتا ہوں کہ خط ان کی روح کو ابدی سکون بخشے اور نینسی اور آپ کو خدا اتنی طاقت عطا فرمائے کہ ان کی بے وقت موت سے واقع ہونے والے نقصان کو صبر سے برداشت کرسکیں۔

آپ کا مخلص

محمد اقبال[1]

حواشی

علامہ اقبال اور مرزا اسد اللہ خان غالب

١۔غلام رسول مہر۔کلیات غالب فارسی (احوال) ص ا

٢۔ مولانا الطاف حسین حالی۔یادگار غالب۔ص ٢٦۔

٣۔مولانا الطاف حسین حالی۔یادگار غالب۔ص١٢١۔

۴۔غلام رسول مہر۔احوال غالب۔کلیات غالب فارسی۔ص ٧

۵۔صابر کلوری۔اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر سے شاہی مسجد لاہور تک (تلخیص از احمد مصطفیٰ صدیقی) مشمولہ، ماہ اقبال صدی نمبر ١٩٧٧ء ص ١٠۴۔

٦۔عبد الحق۔اقبال اور غالب۔مشمولہ اوصاف اقبال۔مرتبہ بہار اللہ آبادی ص ٢۴٨۔

٧۔شذرات فکر اقبال۔ص١٠٢۔

٨۔ایضاً۔ص ١٠۵۔

٩۔عبد الحق۔اقبال اور غالب۔مشمولہ اوصاف اقبال مرتبہ بہار اللہ آبادی ص ٢۵٢۔

١٠۔ڈاکٹر سید عبد اللہ۔غالب پیشرو اقبال مجموعہ اوصاف اقبال مرتبہ بہار اللہ آبادی ص ١۴٧۔

١١۔ایضاً ص ١٦٦۔

۱۲۔ ڈاکٹر نصرت اندرانی۔ پیامی شاعری حالی، اکبر اور اقبال۔ ایک تقابلی مطالعہ۔ص ۲۶۶۔
۱۳۔ احسن عبدالشکور۔ اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ۔ص ۴۳۷۔
۱۴۔ عبدالمغنی۔ اقبال اور غالب مشمولہ اقبال اور مشاہیر مرتبہ طاہر تونسی ص ۶۸۔
۱۵۔ علامہ اقبال: کلیات اقبال فارسی (حصہ پیام مشرق) ص ۱۷۵۔

حواشی

علامہ اقبال اور مولانا حالی و مولانا شبلی

۱۔ رشید حسین خان۔ (تعارف) مقدمہ شعروشاعری۔ص ۵۔
۲۔ مولانا حالی۔ یادگار غالب۔ مقدمہ۔
۳۔ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ہفتم ص ۸۳۶
(۴) ایضاً ص ۸۳۸۔
۵۔ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد ہفتم۔ص ۸۳۸۔
۶۔ مقدمہ شعروشاعری۔ تعارف رشید حسین خان۔ص ۵۔
۷۔ سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی۔ص ۶۸۔
۸۔ ایضاً ص ۲۸۔
۹۔ ایضاً ص ۶۲۔
۱۰۔ اردو دائرۃ المارف اسلامیہ۔ جلد ۱۱۔ص ۶۰۱۔
۱۱۔ سید سلیمان ندوی۔ حیات شبلی۔ص ۲۵۷۔

۱۲۔اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ۔جلد ۱۱۔ص ۶۵۴۔
۱۳۔محمد عبداللہ قریشی۔معاصرین اقبال کی نظر میں۔ص ۸۶۔
۱۴۔ باقیات اقبال۔سید عبدالواحد معینی ترمیم و اضافہ محمد عبداللہ قریشی۔ص ۲۴۶۔
۱۵۔سلیم اختر۔اقبال اور حالی۔مشمولہ مشاہیر اقبال مرتبہ طاہر تونسوی ص ۱۵۰۔
۱۶۔ایضاً ص ۱۶۰۔
۱۷۔محمد امین اندرانی۔حالی کے اثرات اقبال پر مشمولہ اقبال اور غزل مرتب محمد امین اندرابی۔ص ۱۳۹۔
۱۸۔باقیات اقبال۔ص ۲۴۶۔
۱۹۔عبدالغفار شکیل۔نوادر اقبال۔ص ۳۳۰۔
۲۰۔محمد عبداللہ قریشی۔معاصرین اقبال کی نظر میں۔ص ۸۸۔
۲۱۔ ڈاکٹر محمد ریاض۔ اقبال اور شبلی مشمولہ اقبال اور مشاہیر، طاہر تونسوی۔ص ۱۲۷۔
۲۲۔ایضاً ص ۱۲۹۔
۲۳۔اقبال نامہ (شیخ عطاء اللہ (مرتب) (حصہ اول) ص ۸۵
۲۴۔ایضاً ص ۸۰۔
۲۵۔ایضاً ص ۱۴۳۔
۲۶۔کلیات اقبال اردو۔(حصہ بانگ درا) ص ۲۲۲۔

علامہ اقبال اور داغ دہلوی

۱۔مہتاب داغ۔ص ۲۶۔
۲۔ایضاً (بحوالہ آئینہ داغ ص ۸۶)
۳۔مہتاب داغ ص ۲۶۔
۴۔اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ۔جلد ۹۔ص ۱۶۲۔
۵۔ایضاً
۶۔مہتاب داغ ص ۸۷۔
۷۔ایضاً ص ۸۸۔
۸۔اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ۔جلد ۹۔ص ۱۶۲۔
۹۔اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ۔جلد ۹۔ص ۱۶۲۔
۱۰۔ایضاً۔ص ۱۶۴۔
۱۱۔عبدالقادر سروری۔جدید اردو شاعری۔ص ۲۱۔۲۲۔
۱۲۔سر عبدالقادر (دیباچہ بانگ درا مشمولہ کلیات اقبال اردو) ص:۱۱
۱۳۔باقیات اقبال۔ص ۳۴۱۔
۱۴۔جگن ناتھ آزاد، داغ اور اقبال کی غزل مشمولہ اقبال اور غزل مرتبہ محمد امین اندرابی، ص ۱۲۹۔
۱۵۔غلام رسول مہر۔سرود رفتہ۔ص ۲۱۷۔
۱۶۔اقبال نامہ جلد اول ص ۴۰۳۔
۱۷۔محمد امین اندرابی۔مطالعہ مکاتیب اقبال۔ص ۶۵۔

علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی

۱۔ طالب الہ آبادی۔ اکبر الہ آبادی۔ ص ۱۸۔

۲۔ اردو انسائیکلو پیڈیا ص ۱۴۰۔

۳۔ طالب الہ آبادی۔ اکبر الہ آبادی۔ ص ۳۹۴۔

۴۔ محمد عبداللہ قریشی۔ (اکبر الہ آبادی) معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۱۲۶۔

۵۔ ایضاً

۶۔ سر عبدالقادر: دیباچہ بانگ درا (کلیات اقبال اردو) ص ۱۲۔

۷۔ غلام حسین ذوالفقار، اکبر پیش رو اقبال، مجلّہ اقبال لاہور، اپریل ۱۹۶۳ء جلد ۱۱، شمارہ ۴، ص ۲۲۔

۸۔ شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ (حصہ دوم) ص ۳۴۔۳۵۔

۹۔ ایضاً ص ۳۵۔

۱۰۔ خطوط اکبر بنام اقبال۔ قاضی افضل حق قریشی۔ نقوش اقبال نمبر ۲۔ ص ۵۰۴۔

۱۱۔ شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ حصہ دوم۔ ص ۴۸۔

۱۲۔ محمد عبداللہ قریشی (اکبر الہ آبادی) معاصرین اقبال کی نظر میں۔ ص ۱۲۸۔

۱۳۔ ایضاً بحوالہ ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر۔

۱۴۔ شیخ عطاء اللہ۔ اقبال نامہ۔ حصہ دوم۔ ص ۲۸۔

۱۵۔ ایضاً ص ۴۴۔

۱۶۔ محمد عبداللہ قریشی۔ اکبر الہ آبادی۔ معاصرین اقبال کی نظر میں۔ ص ۱۳۰۔

۱۷۔ ایضاً ص ۱۳۲۔

۱۸۔ مکتوب اکبر بنام مرزا سلطان احمد۔ ص ۶۸۔۶۹۔ مشمولہ معاصرین اقبال کی نظر میں محمد عبداللہ قریشی ص

۱۹۔ اقبال نامہ۔ جلد دوم ص ۵۲۔

۲۰۔ اقبال نامہ جلد دوم۔ ص ۵۴۔

۲۱۔ایضاً۔ص ۵۵۔
۲۲۔خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی۔ص ۳۶۔
۲۳۔ایضاً ص ۹۔۱۰۔
۲۴۔محمد عبداللہ قریشی۔اکبرالہ آبادی۔معاصرین اقبال کی نظر میں،ص ۱۵۰۔
۲۵۔باقیات اقبال۔ص ۳۶۴۔
۲۶۔محمد عبداللہ قریشی۔معاصرین اقبال کی نظر میں۔ص ۱۵۱۔
۲۷۔ایضاً بحوالہ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد۔ص ۴۴۔۴۵۔
۲۸۔مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد ۲۴ جنوری ۱۹۱۳ء۔
۲۹۔محمد عبداللہ قریشی۔معاصرین اقبال کی نظر میں ص ۱۵۲،بحوالہ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد ص ۵۴۔
۳۰۔ایضاً بحوالہ خطوط مشاہیر ص ۴۸۔
۳۱۔خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی۔ص ۱۱۱۔
۳۲۔خطوط اکبر بنام اقبال۔قاضی افضل حق قریشی۔نقوش اقبال نمبر ۲،ص ۵۰۴۔
۳۳۔خطوط اکبر بنام اقبال۔قاضی افضل حق قریشی۔نقوش اقبال نمبر ۲۔ص ۵۰۴۔
۳۴۔ایضاً۔ ص ۵۰۴۔
۳۵۔اقبال نامہ۔جلد ۲۔ص ۴۰۔۴۱۔
۳۶۔اکبر پیش رو اقبال۔غلام حسین ذوالفقار۔مجلّہ اقبال لاہور ۱۹۶۳ء بحوالہ مکتوبات اکبر بنام مرزا سلطان احمد۔
۳۷۔ایضاً۔بحوالہ رقعات اکبر شیخ ہمایوں ص ۱۲۸۔
۳۸۔قطعات رباعیات حصہ اول مرتبہ احسان الحق شائع کردہ بزم اکبر کراچی، ص ۳۸۹۔مشمولہ معاصرین اقبال کی نظر میں۔محمد عبداللہ قریشی ص ۱۶۱۔
۳۹۔اقبال نامہ جلد ۲۔ص ۴۷۔۴۹۔
۴۰۔ایضاً۔ص ۴۹۔۵۱۔
۴۱۔اقبال نامہ۔جلد ۲۔ص ۶۸۔۷۰۔

۴۲۔محمد عبداللہ قریشی۔اکبرالہ آبادی۔معاصرین اقبال کی نظر میں،ص ۱۷۵۔
۴۳۔باقیات اقبال۔سعید عبدالواحد معینی ص ۲۳۹۔
۴۴۔غلام حسین ذوالفقار۔اکبر پیش رو اقبال مجلّہ اقبال لاہور،اپریل ۱۹۶۳ء۔
۴۵۔مذکورہ خط انوار اقبال اور حیات اکبر میں شامل ہے دونوں میں یہ جملہ اس فرق کے ساتھ درج ہے۔
انوار اقبال: زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب جا کے ایک اکبر ہاتھ آتا ہے۔ص ۱۹۷۔
حیات اکبر: زمانہ سینکڑوں سال گردش کھاتا رہتا ہے جب آ کے اسے ایک اکبر ہاتھ آتا ہے۔ص ۱۶۴۔رحیم بخش شاہین اوراق گم گشتہ۔
۴۶۔کلیات مکاتیب اقبال۔سید مظفر حسین۔جلد ۲،ص ۲۷۳،۲۷۴۔
۴۷۔مکاتیب اقبال۔بنام گرامی۔ص ۱۷۷۔
۴۸۔کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا) ص ۲۸۲۔

علامہ اقبال اور سر عبدالقادر

۱۔پروفیسر یوسف سلیم چشتی۔شرح بانگ درا۔ص ۳۳۸۔
۲۔سر عبدالقادر۔کلیات اقبال اردو (دیباچہ بانگ درا) ص ۹
۳۔سر عبدالقادر۔کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا) ص ۱۷۔
۴۔ایضاً۔ص ۱۶۔
۵۔سر عبدالقادر۔کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا) ص ۱۳۔
۶۔سر عبدالقادر۔کلیات اقبال اردو (دیباچہ بانگ درا) ص ۱۶۔
۷۔صابر کلوری۔اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر سے شاہی مسجد لاہور تک۔

تلخیص احمد مصطفیٰ صدیقی ہما اقبال صدی نمبر ۱۹۷۷ء۔ص ۸۴۔

۸۔سر عبدالقادر (کلیات اقبال اردو) دیباچہ بانگ درا۔ص ۱۶۔

۹۔کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا) ص ۱۳۲۔

۱۰۔ایضاً ص ۱۳۴۔

علامہ اقبال اور مولانا سید میر حسن سیالکوٹی

۱۔پروفیسر سید محمد عبدالرشید۔اقبال اور عشق رسول ﷺ۔ص ۱۳۔بحوالہ حیات اقبال،ص ۱۱۔

۲۔سر عبدالقادر۔کلیات اقبال اردو (دیباچہ بانگ درا) ص ۱۲۔

۳۔ایضاً

۴۔قاضی افضل حق قریشی۔مولانا سید میر حسن اور اقبال۔اقبال کے ممدوح علماء،ص ۲۲۔

۵۔غلام رسول مہر،شمس العلماء علامہ سید میر حسن سیالکوٹی کا انتقال،نقوش اقبال نمبر ۲،ص ۶۴۹۔

۶۔صابر کلوری،اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر شاہی مسجد لاہور تک،اقبال صدی نمبر ۶۱۔

۷۔غلام رسول مہر،شمس العلماء سید میر حسن کا انتقال،نقوش اقبال نمبر ۲،ص ۶۴۹۔

۸۔ایضاً

۹۔فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر حصہ اول ص ۵۸۔

۱۰۔عبدالمجید سالک۔ ذکر اقبال۔ص ۱۱۔
۱۱۔محمد عبداللہ قریشی۔مکاتیب اقبال بنام گرامی۔ص ۱۶۲۔
۱۲۔خطوط اقبال۔مرتب شیخ عطاء اللہ۔ص ۳۷۔
۱۳۔فقیر سید وحیدالدین۔روزگار فقیر۔جلد اول۔ص ۲۶۔
۱۴۔قاضی افضل حق قریشی۔مولانا سید میر حسن اور اقبال مشمولہ (اقبال کے ممدوح علماء)ص ۲۶۔
۱۵۔ملک حسن اختر۔(اطراف اقبال)ص ۱۴۔
۱۶۔غلام رسول مہر شمس العلماء سید میر حسن سیالکوٹی کا انتقال۔نقوش اقبال نمبر ۲،ص ۶۴۹۔
۱۷۔ایضاً
۱۸۔قاضی افضل حق قریشی،مولانا میر حسن اور اقبال مشمولہ،اقبال کے ممدوح علماء،ص ۲۸۔
۱۹۔سرود رفتہ۔ص ۲۱۲/ ذکر اقبال ص:۲۷۱
۲۰۔فقیر سید وحیدالدین۔روزگار فقیر جلد ۲۔ص ۵۰۳۔
۲۱۔پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔داغ اور اقبال کی غزل۔مشمولۂ اقبال اور غزل مرتب پروفیسر محمد امین اندرابی ص ۱۱۹۔
۲۲۔فقیر سید وحیدالدین روزگار فقیر حصہ اول ص ۲۱۱۔
۲۳۔ڈاکٹر عبدالحق۔اقبال کے ابتدائی افکار۔ص ۷۰۔۶۹۔

❁

فارسی زبان وادب کے اعلام ومشاہیر

علامہ اقبال اورغنی کاشمیری

۱۔ مفتی محمد سعادت نے ۱۰۴۰ھ لکھا ہے۔

۲۔ محمد امین دارب نے ۱۰۲۰ھ لکھا جو درست نہیں ہے۔

۳۔ علی جواد زیدی مقدمہ دیوانی غنی، ترتیب جدید محمد امین دارب کشمیری، جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر۔ ص: ۴۰

۴۔ دیوانِ غنی بہ کوشش احمد کرمی پیش گفتار، ص: ۳۹۲

۵۔ دیوان غنی، ترتیب جدید محمد امین دارب کشمیری (مقدمہ) علی جواد زیدی، ص: ۴۵

۶۔ پروفیسر محمد عبداللہ شیدا، غنی کاشمیری، مشمولۂ مشاہیر نمبر ہمارا ادب ۷۷۔۱۹۷۶ء، جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر، ص: ۳۴۴

۷۔ پروفیسر عبداللہ شیدا، غنی کاشمیری مشمولہ مشاہیر نمبر ہمارا ادب ۷۷۔۱۹۷۶ء جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر، ص: ۳۴۴

۸۔ سید وقار عظیم 'معاصرین اقبال کی نظر میں' ص: ۳۷۴

۹۔ پروفیسر محمد عبداللہ شیدا 'غنی کشمیری مشمولۂ 'مشاہیر نمبر ہمارا ادب، ص: ۳۵۶

۱۰۔ ملک حسن اختر، 'دائرۃ المعارف اقبال' ص: ۳۵۳

۱۱۔ پروفیسر محمد عبداللہ شیدا 'اقبال اور غنی کا ایک تقابلی مطالعہ' مشمولۂ چشمۂ خیال، اقبال اکیڈیمی سرینگر کشمیر

۱۲/ علامہ اقبال کلیات اقبال فارسی حصہ پیام مشرق، ص: ۱۰۷

۱۳/ محمد اقبال کلیات اقبال اردو ص: ۱۸۰

۱۴/ محمد اقبال کلیاتِ اقبال اردو ص: ۱۸۰

۱۵/ ایضاً ۱۶/ ایضاً ....

۱۷/ ڈاکٹر محمد ریاض اقبال اور فارسی شعراء، ص: ۲۴۵

۱۸/ محمد عبداللہ قریشی اقبال اور کشمیر مجلّہ لاہور، اکتوبر ۱۹۵۶ء، ص: ۵۶

۱۹/ ڈاکٹر محمد ریاض اقبال اور فارشی شعراء، ص: ۲۴۷

۲۰/ سلطان شہاب الدین کا اصلی نام مرزا شیر شا مک تھا۔ شہاب الدین سلطان شمس الدین کا تیسرا بیٹا تھا۔ اپنے بھائی علاو الدین کی وفات کے بعد ۷۵۵ھ مطابق ۱۳۵۴ء میں تخت نشین ہوا۔ یہ نہایت شجاع اور حوصلہ مند تھا۔ اس کی سطوت کا یہ عالم تھا کہ غزنوی قندہار کے حکمران اس سے خائف تھے۔ یہ کشمیر کے عظیم بادشاہوں میں شمار ہوتے ہیں۔ اس کے دور میں کشمیر کی سلطنت اپنے انتہائی عروج کو پہنچی۔ کشمیر کے علاوہ لداخ، گلگت، کافرستان، چھوٹا تبت بلتستان، کاشغر، پشاور، سندھ اور پنجاب سب صوبے اس کے زیر نگین آ گئے۔ عورتوں سے اس کی کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ ہر وقت فوج کشی اور تعمیر و ترقی میں مصروف رہے۔ اس کی محبوبہ ملکہ رانی لکشمن بائی تھی۔ جس کے نام پر اس نے ہری پربت کے دامن میں لکشمی نگر آباد کیا۔ اس کی وفات سے ایک سال پہلے شاہ ہمدان کشمیر آئے۔ چونکہ وہ دیندار اور درویش دوست تھے اس نے شاہ صاحب کو بڑے احترام کے ساتھ اپنا مہمان بنایا۔ شہاب الدین نے ۷۷۵ھ میں وفات پائی وہ فاتح اعظم سلطانوں میں شمار ہوتے

ہیں جس روز ان کو اطراف زمین میں سے کسی نئے ملک کو فتح کرنے کی خبر نہ ملتی اس روز کو زندگی میں شمار نہیں کرتے تھے۔

۲۱/محمد اقبال کلیات اقبال فارسی حصہ جاوید نامہ ص:۱۵۰
۲۲/ایضاً ص:۱۵۱
۲۳/ایضاً ص:۱۵۲
۲۴/اقبال کلیات اقبال فارسی، حصہ جاوید نامہ، ص:۱۵۴
۲۵/سید عبدالواحد نقشِ اقبال ص:۱۴۸

علامہ اقبال اور خواجہ حافظ شیرازی

۱/ڈاکٹر رضازادہ شفق تاریخ ادبیات ایران ص:۴۰۹
۲/دیوان حافظ (مترجم) قاضی سجاد حسین (پیش لفظ ڈاکٹر سعید انصاری) ص:۱
۳/ڈاکٹر رضازادہ شفق تاریخ ادبیات ایران، ص:۴۰۹
۴/دیوان حافظ مولانا قاضی سجاد حسین (پیش لفظ از سعید انصاری)، ص:۲
۵/رضازادہ شفق تاریخ ادبیات ایران ص:۴۰۹
۶/دیوان حافظ (مترجم) مولوی قاضی سجاد حسین (پیش لفظ سعید انصاری) ص:۲
۷/دیوان حافظ (مترجم) قاضی سجاد حسین (پیش لفظ سعید انصاری) ص:۲
۸/ایضاً ص:
۹/ڈاکٹر رضازادہ شفق تاریخ ادبیات ایران ص:۴
۱۰/رضازادہ شفق تاریخ ادبیات ایران ص:۴۲۶

۱۱/ دیوان حافظ مترجم قاضی سجاد حسین ص:۹۶

۱۲/ ملک حسن اختر دائرۃ المعارف اقبال ص:۱۶۶

۱۳/ ماہنامہ ادبی دنیا لاہور اپریل و مئی ۱۹۷۰ء، ص:۱۱

۱۴/ ڈاکٹر محمد ریاض اقبال اور فارسی شاعری، ص:۱۸۰

۱۵/ خلیفہ عبدالحکیم فکرِ اقبال ص:۴۷۴

۱۶/ محمد منور ،علامہ اقبال کی فارسی غزل، مشمولہ صحیفہ اقبال نمبر، حصہ دوم، مرتب وحید قریشی، جنوری ۱۹۷۴ء ص:۵۷

۱۷/ پروفیسر نذیر احمد پیش لفظ حافظ اور اقبال، یوسف حسین خان، ص:۴

۱۸/ ایضاً ص:۴

۱۹/ یوسف حسین خان حافظ اور اقبال ص:۷

۲۰/ ڈاکٹر محمد ریاض اقبال اور فارسی شاعری ص:۱۷۹

۲۱/ احسن عبدالشکور، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص:۳۹۰

۲۲/ فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر (جلد دوم) جنوری ۱۹۹۲ء، ص:۴۲۲

۲۳/ یوسف حسین خان، حافظ اور اقبال ص:۱۵

۲۴/ ایضاً ص:۱۸

۲۵/ یوسف حسین خان حافظ اور اقبال ، ص:۱۷، بحوالہ خطوط اکبر بنام خواجہ حسن نظامی

۲۶/ اقبال نامہ جلد اول ص:۵۳

۲۷/ایضاً ص:۵۵۔۵۴

۲۸/اقبال نامہ جلد اول ص:۵۴۔۵۳

۲۹/ایضاً ص:

۳۰/اقبال عطیہ بیگم فیضی، ترجمہ برنی اقبال اکیڈیمی کراچی، ص:۱۱۔۱۰

۳۱/فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر (جلد دوم)، ص:۴۲۳

۳۲/فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر (جلد دوم)، ص:۴۲۵، ۴۲۴

۳۳/سید محمد عبداللہ، حافظ اور اقبال کے ذہنی فاصلے، صحیفۂ لاہور، دسمبر ۱۹۵۷ء،
ص:۱۰، دوسرا شمارہ

۳۴/نظم قرب سلطان (بانگ درا) کلیاتِ اقبال اردو، ص:۲۰۹

۳۵/بانگ درا (ایک خط کے جواب میں) ص:۲۳۸

۳۶/بانگ درا ص:۲۸۸

۳۷/بانگ درا (نظم اسیری) ص:۲۵۳

۳۸/یوسف حسین خان، حافظ اور اقبال، ص:۴۱۲

۳۹/ایضاً

علامہ اقبال اور حکیم سنائی

۱/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد:۱۱ ص:۳۱۴

۲/بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوش اقبال نمبر شمارہ:۱۲۱، ستمبر ۷۷ء، ص: ۱۵۴،۱۵۳

۳/دیوان حکیم سنائی مدرس رضوی، شش و چہار، بحوالۂ تاریخ مجمل فصیحی خوانی، ص: ۱۶۶،۲۱۲ چاپی، ج:۲

۴/ایضاً، ج:۲، ص: پنجاہ و چہار

۵/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد:۱۱، ص:۳۱۶

۶/ بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوش اقبال نمبر، شمارہ:۱۲۱، ستمبر ۷۷ء، ص: ۱۵۴،۱۵۳

۷/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد:۱۱، ص:۳۱۴

۸/رضا زادہ شفق، تاریخ ادب ایران، ص: ۱۵۵

۹/بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوش اقبال نمبر شمارہ:۱۲۱، ستمبر ۷۷ء، ص: ۱۵۵

۱۰/ایضاً

۱۱/مثنوی روم (ترجمہ قاضی سجاد حسین) دفتر سوم، ص: ۳۵۸

۱۲/بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوش اقبال نمبر، شمارہ:۱۲۱، ستمبر ۷۷ء، ص: ۱۵۷

۱۳/دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد:۱۱، ص:۳۱۶

۱۴/ایضاً ص:۳۱۷

۱۵/ایضاً ص:۳۱۷

۱۶/رضا زادہ شفق   تاریخ ادبیات ایران،ص:۱۵۴

۱۷/دیوان حکیم سنائی مدرس رضوی،ص:۵۱

۱۸/ڈاکٹر ریاض، اقبال اور فارسی شعراء،ص:۶۶،بحوالہٴ سید سلیمان ندوی سفر افغانستان

۱۹/علامہ اقبال،کلیات اقبال اردو، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس،فروری/۱۹۸۱ء،ص: ۳۱۴

۲۰/محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو) اعتقاد پبلشنگ ہاؤس فروری ۱۹۸۱ء، ص:۳۱۴،۳۱۵،۳۱۶،۳۱۸

۲۱/ایضاً،ص:۳۱۵،۳۱۶

۲۲/دیوان حکیم سنائی،مدرس رضوی،ص:۵۱

۲۳/ڈاکٹر محمد ریاض،اقبال اور فارسی شعراء،ص:۶۷

۲۴/بشیر احمد ڈار،سنائی اور اقبال نقوش اقبال نمبر،شمارہ:۱۲۱،ستمبر ۷۷ء،ص:۱۶۰

۲۵/اقبال نامہ،جلد دوم،ص:۱۶۲

۲۶/محمد عبداللہ قریشی،مکاتیب اقبال بنام گرامی،ص:۱۴۳

۲۷/علامہ اقبال،کلیات فارسی،ص:۸۹۷

۲۸/بشیر احمد ڈار،سنائی اور اقبال،نقوش اقبال نمبر،شمارہ:۱۲۱،ستمبر ۷۷ء،ص:۱۶۰

۲۹/ایضاً

۳۰/محمد اقبال (ضرب کلیم) کلیاتِ اقبال (اردو) ص:۵۸۱

۳۱/ایضاً،ارمغان حجاز،ص:۷۷

۳۲/احسن عبدالشکور اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ

۳۳ر محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی حصہ، مثنوی پس چہ باید کرد و مسافر، ص:۱۴

۳۴ر یوسف سلیم چشتی، شرح مثنوی پس چہ باید کرد و مسافر، ص:۲۷

۳۵ر بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوش اقبال نمبر، شمارہ:۱۲۱، ص:۱۶۶

۳۶ر ایضاً

۳۷ر علامہ اقبال کلیات فارسی حصہ، مثنوی پس چہ باید کرد و مسافر، ص:۱۵

۳۸ر احسن عبدالشکور، اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ص:۴۱۳

۳۹ر ڈاکٹر محمد ریاض، اقبال اور فارسی شعراء، ص:۷۰، ۶۹

۴۰ر بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوشِ اقبال نمبر، شمارہ:۱۲۱، ص:۱۶۸

۴۱ر بال جبریل، ص:۶۴

۴۲ر بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوش اقبال نمبر، شمارہ:۱۲۱، ص:۱۶۸

۴۳ر علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی حصہ، مثنوی مسافر، ص:۱۵

۴۴ر بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوش اقبال نمبر، شمارہ:۱۲۱، ص:۱۶۷

۴۵ر بشیر احمد ڈار، سنائی اور اقبال، نقوش اقبال نمبر، شمارہ: ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء
ص:۱۷۳

۴۶ر ایضاً، ص:۱۷۴

علامہ اقبال اور شیخ سعدی شیرازی

۱/ رضا زادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، ص:۳۳۱

۲/ اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد:۱۱ ص:۴۶

۳/ محمد علی فروغی، کلیات سعدی، ص: چہار

۴/ رضا زادہ شفق ،تاریخ ادبیات ایران ص:۳۳۲

۵/ ایضاً

۶/ ایضاً ص:۳۴۱

۷/ ایضاً ص:۳۳۴

۸/ ایضاً ص:۳۴۹

۹/ متحدہ ہندوستان کے شعبۂ وزارتِ خارجہ کے ایک آفیسر ....

۱۰/ بشیر احمد ڈار انوارِ اقبال (مرتب) ص:۱۵۱،۱۵۲

۱۱/ گفتارِ اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل: ص:۱۴۶

۱۲/ محمد ریاض، اقبال اور سعدی، اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۰ء، جلد:۱۱،ص:۲۸

۱۳/ کلیاتِ اقبال (اردو) حصہ (بانگ درا) اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۱ء، ص:۲۴۵

۱۴/ محمد ریاض، اقبال اور سعدی، اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۰ء، جلد:۱۱،ص:۳۱

۱۵/ سید عبد اللہ، سرسید احمد خان اور ان کے نامور رفقاء، ص:۱۰۰،۹۹

۱۶/ مولانا حالی، مقدمۂ شعر و شاعری، ص:۱۵۵

۱۷/ محمد ریاض، اقبال اور سعدی، اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۰ء، جلد:۱۱،ص:۲۹

۱۸/ بانگ درا مشمولہ کلیاتِ اقبال، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۸۱ء، ص: ۹۰،۹۱

۱۹/ محمد ریاض، اقبال اور سعدی، اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۰ء، جلد: ۱۱، ص: ۳۲

۲۰/ محمد علی فروغی، کلیات سعدی، درباب تواضع، ص: ۳۰۹

۲۱/ محمد اقبال، کلیات اقبال فارسی حصہ، پیام مشرق، ص: ۳۲۷

۲۲: محمد ریاض، اقبال اور سعدی، اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۰ء جلد: ۱۱ص: ۳۳

۲۳/ کلیات سعدی (ستائش بغرض) محمد علی فروغی، ص: ۲۲۱

۲۴/ محمد ریاض، اقبال اور سعدی، اقبال ریویو جولائی ۱۹۷۰ء جلد: ۱۱ص: ۴۵

علامہ اقبال اور مولانا جلال الدین رومی

۱/ ڈاکٹر رضازادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، ص: ۳۵۵
۲/ ایضاً ص: ۳۵۶
۳/ ڈاکٹر رضازادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، ص: ۳۵۶
۴/ ایضاً ص: ۳۵۷، ۳۵۸
۵/ ڈاکٹر رضازادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، ص: ۳۶۲
۶/ ایضاً ص:
۷/ ایضاً ص: ۳۶۳
۸/ اعجاز الحق قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیاء، ص: ۱۶۳، بحوالہ سوانح مولانا روم از شبلی نعمانی، ص: ۳۸-۴۱
۹/ ایضاً ص: ۱۶۳
۱۰/ ڈاکٹر رضازادہ شفق، تاریخ ادب ایران، ص: ۳۶۳
۱۱/ فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر، جلد اول، ص: ۳۳

۱۲/محمود الرحمان، اقبال مسجد قرطبہ میں، ھما اقبال صدی نمبر ۱۹۷۷ء، ص:۳۰۵،۳۰۶
۱۳/محمد اقبال، کلیات اقبال اردو (بال جبریل)، ص:۴۲۷،۴۳۰،۴۳۲
۱۴/ایضاً ص:۴۲۶
۱۵/محمد اقبال، کلیاتِ اقبال اردو حصہ (ضرب کلیم) ص:۵۸۳
۱۶/میاں بشیر احمد مولانا روم اور اقبال مشمولۂ اوصاف اقبال مرتبہ بہار الہ آبادی، ص:۵۰
۱۷/یوسف سلیم چشتی، شرح جاوید نامہ اول، ص:۱۱
۱۸/علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی حصہ، (جاوید نامہ) ص:۷
۱۹/علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی حصہ، جاوید نامہ، ص:۱۹۱
۲۰/ڈاکٹر سید عبداللہ، مطالعۂ رومی کی تاریخ میں اقبال کا مقام، مشمولۂ اوصاف اقبال، مرتب بہار الہ آبادی، ص:۲۴۲
۲۱/ایضاً، ص:۲۳۱
۲۲/علامہ اقبال، کلیات اقبال فارسی حصہ، پیام مشرق، ص:۷۷
۲۳/علامہ اقبال، کلیات اقبال (اردو)، بال جبریل: ص:۳۳۱
۲۴/ایضاً ص:۳۰۲
۲۵/رفیق خاور مرشد روم، مشمولۂ اوصاف اقبال، مرتبہ بہار الہ آبادی، ص:۱۰۷
۲۶/علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال حصہ، بال جبرئیل ص:۳۰۹
۲۷/محمد اقبال، کلیاتِ اقبال اردو حصہ ضرب کلیم، ص:۴۸۵
۲۸/کلیاتِ اقبال فارسی حصہ (اسرارِ خودی) ص:۸
۲۹/ایضاً: ص:۸۔ ۳۰/ایضاً ''پس چہ باید کرد، ص:۳۳
۳۱/کلیاتِ اقبال حصہ فارسی ارمغان حجاز، ص:۴۴،
۳۲/ایضاً۔ ص:۶۱،
۳۳،۳۴/ایضاً ارمغانِ حجاز، ص:۶۲
۳۵/کلیاتِ اقبال اردو حصہ ضرب کلیم، ص:۴۸۵

علامہ اقبال اور مرزا عبدالقادر بیدل

۱/ یوسف سلیم چشتی، بانگ درا (شرح)۔ص:۶۵۲
۲/ رضا زادہ شفق، تاریخ ادبیات ایران، ص:۴۷۱
۳/ یوسف سلیم چشتی، شرح (بانگ درا) ص:۶۵۲
۴/ عبدالغنی، بیدل اور اقبال (ایک سرسری مطالعہ) مجلۂ اقبال جلد، ۲۳ شمارہ ۱۲/ اپریل۔ ۱۹۷۲ء
۵/ عبدالغنی، بیدل اور اقبال۔ مشمولۂ اقبال اور مشاہیر، طاہر تونسوی، ص:۱۱۹، ۱۱۸
۶/ محمد اقبال، بانگ درا (نظم تصویرِ درد)
۷/ ایضاً
۸/ عبدالغنی، بیدل اور اقبال۔ مشمولۂ اقبال اور مشاہیر، طاہر تونسوی، ص:۱۱۷
۹/ ڈاکٹر محمد ریاض، مرزا عبدالقادر بیدل مطالعہ اقبال کی روشنی میں۔ اقبال ریویو جنوری ۷۲، ص:۱۷
۱۰/ کلیات اقبال، ضرب کلیم اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۱ء، ص:۱۲۲
۱۱/ عبدالغنی، اقبال اور بیدل، مشمولۂ اقبال اور مشاہیر، طاہر تونسوی، ص:۱۱۹
۱۲/ ایضاً، ص:۱۱۹
۱۳/ ایضاً
۱۴/ ایضاً ص:۱۲۱
۱۵/ ڈاکٹر ریاض، مرزا عبدالقادر بیدل مطالعۂ اقبال کی روشنی میں، اقبال ریویو، جنوری، ۷۲، ص:۱۷
۱۶/ عبدالغنی، اقبال اور بیدل مشمولہ اقبال اور مشاہیر مرتب طاہر ثولنوی، ص:۱۳۴
۱۷/ ایضاً ص:۱۱۶
۱۸/ ابواللیث صدیقی، اقبال اور بیدل مشمولۂ اوصاف اقبال مرتبہ بہار الہ آبادی، ص:۳۲۵
۱۹/ مکاتیب اکبر بنام مرزا سلطان احمد، ص:۴۷، ۴۸

تاریخ اور فلسفہ کے اعلام ومشاہیر
علامہ اقبال اور سید جمال الدین افغانی

۱/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد: ہفتم، دانشگاہ پنجاب لاہور، ص:۳۷۳

۲/محمد نعیم صاحب ندوی صدیقی، سید جمال الدین افغانی (واقعات کی روشنی میں) اسلام اور عصر جدید (سہ ماہی) جلد:۴، جولائی ۱۹۷۲ء، شمارہ:۳، ص:۷۹

۳/عبدالحلیم اثر افغانی، جمال الدین افغانی کا وطن، المعارف مئی ۱۹۷۱ء، ص:
۳۹

۴/شاہد حسین رزاقی، افغانستان کے پہلے مردِ مجاہد سید جمال الدین افغانی، حیات وافکار، ص:۵

۵/محمد نعیم ندوی صدیقی، سید جمال الدین افغانی، (واقعاتِ کی روشنی میں) اسلام اور عصر جدید، جولائی ۱۹۷۲ء، ص:۸۲

۶/اردو دائرۃ المعارف، جلد:۷، ص:۳۷۴

۷/ایضاً ص:۳۷۵

۸/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد:۷، ص:۳۷۸

۹/ایضا ص:۳۷۸

۱۰/ایضاً ص:۳۷۹

۱۱/ایضاً ص:۳۷۲

۱۲/معین الدین، عقیل۔ سید جمال الدین افغانی اور اقبال، صحیفہ لاہور (اکتوبر

۱۹۷۷ء،ص:۱۹۵،

۱۳/ایس۔ایم۔فاروق۔طواسین اقبال، حصہ دوم وسوم،ص:۵۳

۱۴/ڈاکٹر معین الدین عقیل، اقبال اور سید جمال الدین افغانی، صحیفۂ لاہور، اکتوبر ۷۷ء،ص:۱۹۵

۱۵/حرفِ اقبال، مرتب لطیف اللہ شیروانی،ص:۱۴۹

۱۶/علامہ اقبال۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ، ترجمہ سید نذیر نیازی،ص:۱۷۸

۱۷/علامہ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، (حصہ جاوید نامہ)ص:۵۵

۱۸/ایضاً ص:۵۷

علامہ اقبال اور امام غزالیؒ

۱/علامہ شبلی، الغزلی:ص:۱

۲/ایضاً ص:۳

۳/ایضاً ص:۷

۴/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ، جلد:۱۲،ص:۴۸۲

۵/اعجاز الحق قدوسی، اقبال کے محبوب صوفیاء،ص: ۸۵، بحوالۂ سید ابوالحسن ندوی، تاریخ دعوتِ عزیمت سے (ماخوذ،ص:۱۱۱۔۱۴۵)

۶/علامہ شبلی، الغزلی:ص:۲۵

۷/ایضاً، ص:۳۴، بحوالۂ شرح احیاء بحوالہ ابن جوزی،ص:۱۱

۸/ایضاً ص:۳۴

۹/علامہ شبلی نعمانی   الغزلی   ص:۳۸

۱۰/اعجاز الحق قدوسی   اقبال کے محبوب صوفیاء   ص:۸۶ (بحوالہٗ سید ابوالحسن ندوی، تاریخ عزیمت، حصہ اول، ص:۱۱۱ تا ۱۴۵ (ماخوذ)

۱۱/علامہ شبلینعمانی   الغزلی   ص: ۵۸

۱۲/شیخ محمد اکرام، الغزالی، المعارف لاہور، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص:۱۸

۱۳/علامہ شبلی، الغزلی:ص:۲۷

۱۴/شیخ محمد اکرام، الغزالی، المعارف، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص:۱۹

۱۵/ علامہ شبلی، الغزلی:ص:۱۱۰،۱۱۱

۱۶/ایضاً   ص:۱۱۲

۱۷/ایضاً   ص:۱۱۲

۱۸/شیخ محمد اکرام الغزالی المعارف لاہور، دسمبر ۱۹۶۹ء، ص:۲۳

۱۹/علامہ شبلی، الغزلی:ص:۲۳۵

۲۰/علامہ شبلی، الغزلی:ص:۱۹۱

۲۱/ایضاً   ص:۲۵۰

۲۲/بال جبریل   غزل نمبر:۳۴

۲۳/کلیات اقبال اردو (حصہ بانگ درا)   ص:۲۰۳

۲۴/کلیات اقبال اردو (حصہ ارمغانِ حجاز)   ص:۳۳۳

۲۵/تشکیل جدید الٰہیات اسلام، مترجم نذیر نیازی:۱۹۹۲ء، ص:۴۸

۲۶/سید وقار عظیم، اقبال معاصرین کی نظر میں   ص:۳۴۶

علامہ اقبال اور سعید حلیم پاشا

۱۔محمد ریاض   اقبال اور سعید حلیم پاشا   اقبال ریویو ۔ جنوری ۱۹۷۱ء، ص:۴۹

۲۔ایضاً   ص:۵۱

۳۔ایضاً   شمارہ:۲   ص:۵۱

۴۔ڈاکٹر محمد ریاض، اقبال اور سعید حلیم پاشا، اقبال ریویو، جنوری ۷۱ء، ص:۵۱

۵۔ایضاً   ـــــ   ـــــ   ـــــ

۶۔تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ (ترجمہ نذیر نیازی)، ص:۲۵۶

۷۔معین الدین عقیل بعض شخصیات وتحریکات سے اقبال کی دلچسپی مشمولۂ اقبال ۸۶، مرتبہ ڈاکٹر وحید عشرت، ص:۱۸۱

۸۔محمد ریاض، اقبال اور سعید حلیم پاشا، اقبال ریویو، جنوری ۷۱ء، ص:۵۳

۹۔کلیات اقبال فارسی   حصہ جاوید نامہ (فلک عطارد) ص:۵۴

۱۰۔ایضاً   ص:۵۴

۱۱۔کلیات اقبال فارسی (حصہ جاوید نامہ فلک عطارد) ص:۶۰

۱۲۔ایضاً   ص:۶۸۔۶۹

۱۳۔ایضاً   ص:۷۰

علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان

۱/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد:۷،ص:۹۷۸

۲/ایضاً ص:۹۸۳

۳/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد:۷،ص:۹۸۳

۴/ایضاً ص:۹۸۳

۵/ایضاً ص:۹۹۲

۶/ایضاً ص:۹۹۲

۷/اردو دائرۃ المعارف اسلامیہ جلد:۷،ص:۹۹۳

۸/ایضاً ص:۹۹۳

۹/علامہ اقبال،کلیاتِ اقبال اردو حصہ ضرب کلیم،ص:۲۷

۱۰/علامہ اقبال کلیات اقبال اردو،ارمغانِ حجاز،ص:۲۷

۱۱/علامہ اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،حصہ جاوید نامہ،ص:۱۵۸

۱۲/ایضاً ص:۱۶۶

۱۳/علامہ اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،حصہ جاوید نامہ،ص:۱۶۷

۱۴/ایضاً

۱۵/ایضاً

۱۶/ایضاً ص:۱۶۸

۱۷/ پروفیسر یوسف سلیم چشتی ، علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان شہید، اقبال ریویو

جنوری ۱۹۶۳ء، ص: ۳۳،۳۴
۱۸ر کلیاتِ اقبال فارسی (حصہ جاوید نامہ) ص: ۱۷۰
۱۹ر کلیاتِ اقبال فارسی (حصہ جاوید نامہ) ص: ۱۷۰
۲۰ر کلیاتِ اقبال فارسی (حصہ جاوید نامہ) ص: ۱۷۰
۲۱ر پروفیسر یوسف سلیم چشتی، علامہ اقبال اور ٹیپو سلطان شہید، اقبال ریویو جنوری ۱۹۶۳ء، ص: ۳۳،۳۴

علامہ اقبال اور نادر شاہ افغان

۱ر اختر راہی۔ اقبال اور نادر شاہ، المعارف اگست، ستمبر ۷۵ء، ص: ۵۳
۲ر صابر کلوری۔ اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر سے شاہی مسجد لاہور تک۔ اقبال صدی نمبر ۱۹۷۱ء، ص: ۱۰۱، (تلخیص احمد مصطفیٰ صدیقی)
۳ر صابر کلوری۔ اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر سے شاہی مسجد لاہور تک۔ ھما اقبال صدی نمبر ۱۹۷۱ء، ص: ۱۰۱، (تلخیص احمد مصطفیٰ صدیقی)
۴ر ایضاً ص: ۱۰۲
۵ر اختر راہی۔ اقبال اور نادر شاہ، المعارف اگست ستمبر ۷۵ء، ص: ۹۷۔۹۶
۶ر اکبر علی خان۔ چند نوادر بسلسلہ اقبالیات، تقاریر بہ سفر افغانستان، اقبال ریویو جولائی ۱۹۶۲ء، ص: ۹۱۔۹۰
۷ر علامہ اقبال۔ (کلیاتِ اقبال اردو) بال جبریل، ص: ۱۵۳

۸/ایضا،ضرب کلیم ص:۱۶۴
۹/کلیات اقبال (فارسی) حصہ،مثنوی مسافر،ص:۵۔۶
۱۰/ایضاً ص:۱۱
۱۱/ایضاً (حصہ جاوید نامہ) ص:۱۶۵

❀❀❀

مذہب کے اعلام ومشاہیر
علامہ اقبال حضور رسالت مآب میں

۱/سید وقار عظیم،اقبالیات کا مطالعہ،ص:۲۱۶
۲/جمیلہ شوکت۔علامہ اقبال اور حبِ رسول،المعارف نومبر،۷۷،شمارہ:۱۱،ص:۴
۳/رسید عبدالرشید،اقبال اور عشق رسول،ص:۱۴،بحوالہ حیات اقبال،ص:۱۲
۴/عبدالسلام ندوی،اقبال کامل ص:۴
۵/کلیات اقبال (اردو) ص:۹۷
۶/ایضاً ص:۲۲۹
۷/کلیات اقبال (اردو) ص:۹۷
۸/جمیلہ شوکت۔اقبال اور حب رسولؐ المعارف نومبر ۷۷،ص:۶
۹/کلیات اقبال (فارسی) ص:۹۲۹
۱۰/بشیر احمد ڈار انوارِ اقبال ص:۱۷۶
۱۱/کلیات اقبال (اردو) ص:
۱۲/کلیات مکاتیب اقبال،سید مظفر حسین برنی،جلد اول،ص:۴۱۵
۱۳/کلیات اقبال فارسی (اسرار خودی) ص:۱۵
۱۴/ایضاً (رموز بے خودی)،ص:۹۲

۱۵/کلیات اقبال (فارسی، پیام مشرق) ص:۱۰۷
۱۶/ایضاً (حصہ جاوید نامہ) ص:۶۳
۱۷/کلیات اقبال فارسی حصہ مثنوی مسافر ص:۶۷
۱۸/غلام مصطفیٰ خان، علامہ اقبال، بارگاہِ رسالت مآبؐ میں مشمولہ تغیر اقبال۔
مرتبہ بہار الہ آبادی، ص:۴۷
۱۹/محمد اقبال (بانگ درا) کلیاتِ اقبال (اردو) ص:۱۹۷
۲۰/باقیات اقبال ص:۳۶۵
۲۱/کلیاتِ اقبال (اردو) ص:۲۰۲، ۲۰۸
۲۲/کلیات اقبال ص:۲۹۸
۲۳/کلیاتِ اقبال اردو ص:۳۱۶_۳۱۹_۳۸۶
۲۴/سید افتخار حسین شاہ، اقبال پیروی شبلی، ص:۱۳۰
۲۵/ڈاکٹر مصطفیٰ خان۔علامہ اقبال بارگاہِ رسالت مآبؐ میں۔مشمولہ تفسیر اقبال
مرتب بہار الہ آبادی، ص:۸۳
۲۶/کلیاتِ اقبال فارسی حصہ (ارمغانِ حجاز بحضور رسالت مآبؐ)، ص:۲۲ تا ۴۹
۲۷/فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر، حصہ اول۔ص:۹۴_۹۶

علامہ اقبال اور میر سید علی ہمدانیؒ

۱/ڈاکٹر محمد ریاض۔اقبال اور شاہ ہمدان، اقبال ریویو جنوری ۶۹ء، ص:۶۹

۲/تذکرہ اولیائے کشمیر۔تاریخ حسن کا تیسرا حصہ۔ص:۱۱

۳/اعجاز الحق قدوسی۔اقبال کے محبوب صوفیاء۔ص:۳۲۴

۴/ایضاً ص:۳۱۰

۵/تذکرہ اولیائے کشمیر۔تاریخ حسن کا تیسرا حصہ۔ص:۱۱

۶/محمد طیب صدیقی، حضرت میر سید علی ہمدانی۔ مشاہیر نمبر ہمارا ادب۔ ۷۷۔۱۹۷۶ء، کلچرل اکیڈمی سرینگر۔ص:۱۵۹

۷/ڈاکٹر محمد ریاض۔اقبال اور شاہ ہمدان۔اقبال ریویو ۱۹۶۹ء۔ص:۱۷

۸/اعجاز الحق قدوسی۔اقبال کے محبوب صوفیاء۔ص:۳۲۱

۹/محمد طیب صدیقی، حضرت میر سید علی ہمدانی۔مشاہیر نمبر ہمارا ادب۔۱۹۷۷ء، کلچرل اکیڈمی سرینگر۔ص:۱۵۶

۱۰/محمد طیب صدیقی، حضرت میر سید علی ہمدانی۔ مشاہیر نمبر ہمارا ادب۔ ۷۷۔۱۹۷۶ء، کلچرل اکیڈمی سرینگر۔ص:۱۵۶

۱۱/اعجاز الحق قدوسی۔اقبال کے محبوب صوفیاء۔ص:۳۲۷

۱۲/ایضاً

۱۳/محمد طیب صدیقی، حضرت میر سید علی ہمدانی مشمولہ مشاہیر نمبر (ہمارا ادب) کلچرل اکیڈیمی سرینگر، ۷۷۔۱۹۷۶ء، ص:۱۵۶

۱۴/ پروفیسر ڈاکٹر علی اصغر حکمت۔ میر سید علی ہمدانی از ہمدان تا کشمیر۔(ترجمہ و توضیحات ڈاکٹر ریاض)۔المعارف دسمبر ۱۹۶۹ء، ص:۳۰

۱۵/کلیات اقبال فارسی (جاوید نامہ)ص:۱۴۶

۱۶/ایضاً ص:۱۴۷

۱۷/ڈاکٹر محمد ریاض۔اقبال اور شاہ ہمدان، ریویو جنوری ۱۹۶۹ء ص:۷۷

۱۸/ پروفیسر جگن ناتھ آزاد۔ شاہ ہمدان کے حضور میں۔ شیرازہ ، اقبال نمبر، جلد:۱۶، شمارہ:۳،۴،۵،۶۔جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر

۱۹/کلیاتِ اقبال فارسی (جاوید نامہ) ص:۱۵۰

۲۰/ایضاً ص:۱۵۱

۲۱/ایضاً ص:۱۵۱

۲۲/کلیاتِ اقبال فارسی (حصہ جاوید نامہ)ص:۱۵۲

علامہ اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ

۱/سید محمد قیصر از ہر شاہ۔حیات انور۔ص:۹

۲/عبدالرحمان کوندو۔علامہ انور شاہ کاشمیریؒ، مشاہیر نمبر ہمارا ادب، جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی ۷۷۔۱۹۷۶ء، مرتب رشید نازکی۔ص:۳۸۷

۳/کلیم اختر۔اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ۔المعارف ۱۹۷۷ء۔ص:۲۷

۴/ایضاً ص:۲۸

۵/ایضاً ص:۲۷

۶/ایضاً ص:۲۸

۷ر محمد الدین فوق ۔ مشاہیر کشمیر
۸ر کلیم اختر ۔ اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ ۔ المعارف ۱۹۷۷ء ۔ ص: ۲۹
۹ر عبدالرحمان کوندو ۔ انور شاہ کاشمیریؒ، ہماراادب، مشاہیر نمبر ۔ جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر ۔ ص: ۳۹۶
۱۰ر کلیم اختر ۔ اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ ۔ المعارف ۱۹۷۷ء ۔ ص: ۲۹
۱۱ر سید محمد از ہر شاہ قیصر ۔ حیات انور ۔ حالات زندگی اور دینی کمالات ۔ ص: ۳۰
۱۲ر سید سلیمان ندوی ۔ شذرات معارف اعظم گڑھ ۔ جولائی ۱۹۳۲ء، ص: ۲
۱۳ر کلیم اختر ۔ اقبال اور مولانا انور شاہ کشمیریؒ ۔ المعارف ۱۹۷۷ء ۔ ص: ۲۹ ۔
۱۴ر ایضاً ص: ۳۱
۱۵ر ایضاً، بحوالۂ مولانا عبدالصمد صارم، سیرت انور شاہ کاشمیری ۔ ص: ۴۰
۱۶ر ایضاً ۔ بحوالۂ ضیاء الرحمان فاروقی ۔ دیوبند کی عہد ساز شخصیتیں دارالعلوم دیوبند ۱۹۷۶ء
۱۷ر عبدالرحمان کوندو ۔ الانور ۔ ص: ۲۷۵ بحوالۂ چٹان لاہور پاکستان
۱۸ر عبداللہ چغتائی ۔ پادشاہی مسجد لاہور ۔ لاہور کتب خانہ ۔ نورس ۱۹۷۲ء ۔ ص: ۳۷
۱۹ر شیخ عطاء اللہ ۔ اقبال نامہ (دوم) ص: ۴۸
۲۰ر انجمن اسلامیہ پنجاب اور انجمن حمایت اسلام لاہور
۲۱ر عبداللہ چغتائی ۔ پادشاہی مسجد لاہور ۔ لاہور کتب خانہ ۔ نورس ۱۹۷۲ء ۔ ص: ۳۸
۲۲ر قاضی افضل حق قریشی ۔ اقبال کے ممدوح علماء ۔ ص: ۳۲
۲۳ر علامہ اقبال ۔ اقبال نامہ (حصہ دوم) مرتب شیخ عطاء اللہ ۔ ص: ۲۵۷
۲۴ر سید اکبر آبادی ۔ اے کہ مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم ۔ مشمولۂ حیاتِ انور از سید از ہر شاہ قیصر ۔ ص: ۱۹۳ ۔ (دیوبند ۱۹۵۵ء)
۲۵ر محمد طیب ۔ نور الانور مشمولۂ حیات انور از سید محمد از ہر شاہ قیصر ۔ ص: ۲۵۱

۲۶ر سعید اکبر آبادی۔ اے تو مجموعہ خوبی بچہ تامت بات:۶۔ مشمولہ حیات انور مرتب سید از ہر شاہ قیصر دیوبند ۵۵ء۔ ص:۱۶۴

۲۷ر مولانا محمد شاہ انوری۔ حضرت علامہ انور شاہ اور ڈاکٹر اقبال مشمولۂ اقبال کے ممدوح علماء۔ قاضی افضل افضل حق قرشی۔ ص:۴۴

۲۸ر بشیر احمد ڈار۔ انوار اقبال۔ ص:۲۵۵

۲۹ر قاضی افضل حق قرشی۔ ڈاکٹر محمد اقبال اور انور شاہ کاشمیری مشمولۂ حیاتِ انور ۔مرتب سید محمد از ہر شاہ قیصر۔ ص:۲۹ (دیوبند ۱۹۵۵ء)

۳۰ر مولانا محمد شاہ انوری۔ حضرت علامہ انور شاہ اور ڈاکٹر اقبال حیات انور۔ ص:۵

۳۱ر قاضی افضل قریشی۔ اقبال کے ممدوح علماء۔ بحوالۂ ابن انور سید محمد از ہر شاہ قیصر ایڈیٹر رسالہ دیوبند۔

علامہ اقبال اور گورونانک

۱ر پروفیسر حفیظ ملک۔ اقبال کی شاعری میں گورونانک کا مقام۔ اسلام اور عصر جدید دہلی۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء۔ ص:۴۲

2.Khushwant Singh. A History of Sikhs Vol.I, P.17

۳ر پروفیسر حفیظ ملک۔ اقبال کی شاعری میں گورونانک کا مقام۔ اسلام اور عصر جدید دہلی۔ اکتوبر ۱۹۶۹ء۔ ص:۴۱

4. The Holy Quran__ Maulana Mohammad Ali, Lahore 1951, p.1219

5.Guru Nakis Ga pJi by Gurusarn Singh, p.29

6. The Holy Quran__ Maulana Mohammad Ali, Lahore 1951, Chapter 57 Iron, p.1028

۷/ڈاکٹر عبدالحق۔اقبال کے ابتدائی افکار۔ص:۹۹

۸/ایضاً

۹/محمد اقبال۔ (حصہ بانگ درا) کلیات اقبال اردو۔اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، فروری ۱۹۸۱،ص:۲۴۰

۱۰/فقیر سید وحید الدین روزگار فقیر۔جلد دوم،ص:۵۹۴

۱۱/ پروفیسر حفیظ ملک۔اقبال کی شاعری میں گرونانک کا مقام۔اسلام اور عصر جدید، دہلی، اکتوبر ۱۹۶۹ء،ص:۴۹۔۴۸

۱۲/علامہ اقبال۔اردو کلیات (۱۹۸۱ء) ص:۵۷

۱۳/ پروفیسر حفیظ ملک۔اقبال کی شاعری میں گرونانک کا مقام۔اسلام اور عصر جدید ،دہلی، اکتوبر ۱۹۶۹ء،ص:۵۳

۱۴/ایضاً ص:۵۷

۱۵/ پروفیسر حفیظ ملک۔اقبال کی شاعری میں گرونانک کا مقام۔اسلام اور عصر جدید، دہلی، اکتوبر ۱۹۶۹ء،ص:۵۴

۱۶/محمد اقبال۔ (حصہ بانگ درا) کلیات اقبال اردو۔اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، فروری ۱۹۸۱،ص:۲۷۳

۱۷/ایضاً ص:۲۷۳

۱۸/ پروفیسر حفیظ ملک۔اقبال کی شاعری میں گرونانک کا مقام۔اسلام اور عصر جدید ،دہلی، اکتوبر ۱۹۶۹ء،ص:۵۴۸

۱۹/ایضاً ص:۵۴

❀❀❀

حواشی

کلام اقبال کے مغربی و دیگر اعلام و مشاہیر

کارل مارکس اور علامہ اقبالؒ

نمبر	مصنف/مرتب	نام کتاب	صفحہ
۱۔	جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی مفکرین	۶۴
۲۔	پروفیسر یوسف سلیم چشتی	شرح پیامِ مشرق	۵۸۹
۳۔	جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی مفکرین	۶۲
۴۔	ڈاکٹر اعجاز حسین	مشمولہ ''اقبال اور مغربی مفکرین'' (جگن ناتھ آزاد)	۶۲
۵۔	پروفیسر آل احمد سرور	مشمولہ ''اقبال اور مغربی مفکرین'' (جگن ناتھ آزاد)	۶۲
۶۔	مضامین اقبال	ص:۱۸۲، مشمولہ جگن ناتھ آزاد، اقبال اور مغربی مفکرین	۶۳
۷۔	اقبال نامہ (حصہ اول)		۱۸
۸۔	مضامین اقبال		۱۹۶
۹۔	کلیات اقبال اردو	(حصہ ضرب کلیم) نظم اشتراکیت	۵۹۸
۱۰۔	ایضاً	بال جبریل	۴۰۱
۱۱۔	کلیات اقبال (فارسی)	جاوید نامہ (نظم اشتراکیت وملوکیت)	۶۴
۱۲۔	ملک حسن اختر	اطراف اقبال	۲۴۷
۱۳۔	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی مفکرین	۹۲

۱۴۔	کلیات اقبال	ضرب کلیم کامل، (کارل مارکس کی آواز)	۵۹۹
۱۵۔	کلیات اقبال	ارمغان حجاز، ابلیس کی مجلس شوریٰ	۶۵۵
۱۶۔	ایضا	ایضاً	۶۵۵
۱۷۔	ایضاً	ایضاً	۶۵۶
۱۸۔	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی مفکرین	۹۸
۱۹۔	اسلوب احمد انصاری	اقبال کی تیرہ نظمیں	۳۰۳

حواشی: علامہ اقبال اور حکیم نطشے

۱۔	پروفیسر یوسف سلیم چستی	شرح جاوید نامہ (حصہ دوم)	۲۱۹
۲۔	کلیات اقبال (فارسی)	پیامِ مشرق (نظم شوپن ہار و نطشے)	۱۹۴
۳۔	ایضاً	ایضاً	۱۹۸
۴۔	ایضاً	ایضاً	۱۹۸
۵۔	کلیات اقبال اردو	ضرب کلیم (نظم حکیم نطشے)	
۶۔	علامہ اقبال مشمولہ	اقبال اور مغربی مفکرین (جگن ناتھ آزاد)	۱۰۱
۷۔	جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی مفکرین	۱۱۰
۸۔	کلیات اقبال (فارسی)	جاوید نامہ	۱۵۱
۹۔	ایضاً	ایضاً	۱۵۲
۱۰۔	ایضاً	ایضاً	۱۵۲
۱۱۔	ایضاً	ایضاً	۱۵۳
۱۲۔	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی مفکرین	۱۰۸۔۱۰۷
۱۳۔	ایضاً	ایضاً	۱۱۱

حواشی: علامہ اقبال اور لینن

نمبر	مصنف/مرتب	نام کتاب/عنوانِ مضمون	صفحہ
۱۔	کلیات اقبال (اردو)	نظم ''لینن خدا کے حضور میں''	۳۹۹
۲۔	پروفیسر جگن ناتھ آزاد	اقبال اور مغربی مفکرین	
۳۔	کلیات اقبال	نظم: لینن خدا کے حضور میں	۳۹۹
۴۔	ڈاکٹر عبدالغنی	اقبال کا نظام فن	۳۴۴
۵۔	کلیات اقبال اردو	نظم: لینن خدا کے حضور میں	۳۹۹
۶۔	ایضاً	ایضاً	۳۹۹
۷۔	ڈاکٹر عبدالغنی	اقبال کا نظام فن	۳۴۸
۸۔	ایضاً	ایضاً	ایضاً
۹۔	کلیات اقبال فارسی	حصہ پیامِ مشرق (نظم: مسولینی وقیصر ولیم)	۲۰۹

حواشی: مسولینی اور اقبال

۱۔	علی سردار جعفری	ترقی پسند ادب: ص:۴۹ مشمولہ اقبال کے اثراتی افکار (عبدالحق، ص:۳۵
۲۔	اختر حسین رائے پوری	ادب اور انقلاب، ص:۶۲ ،ایضاً
۳۔	کلیات اقبال اردو (ضرب کلیم)	مسولینی (مشرق و مغربی حریفوں سے) ص:۸۴۹
۴۔	ایضاً	بال جبریل نظم مسولینی، ص:۴۴۲
۵۔	احمد مصطفیٰ صدیق	(اقبال کی کہانی خاندانی پس منظر سے شاہی مسجد لاہور تک) مشمولہ ھُما اقبال صدی نمبر اگست ۷۷، ص:۸۷
۶۔	ایضاً	ایضاً

۷۔	ایضاً	ایضاً
۸۔	ایضاً	ایضاً
۹۔	عبدالغنی	اقبال اور شخصیتیں مشمولہ اردو ادب جلد :۲، جون ۱۹۵۷ء،ص:۵۴۰
۱۰۔	کلیات اقبال	ضربِ کلیم،نظم :ابی سینا،ص:۶۰۷
۱۱۔	احمد مصطفیٰ صدیقی	اقبال کی کہانی ، خاندانی پس منظر سے شاہی مسجد لاہور تک، مشمولہ ھما اقبال صدی نمبر ۷۷،ص:۸۹
۱۲۔	ملک حسن اختر	دائرۂ معارف اقبال،ص:۴۸۹

حواشی : اقبال اور آرنلڈ

ذکر اقبال،ص:۱۷

۱۔		
۲۔	ڈاکٹر عبدالحق	اقبال کے ابتدائی افکار،ص:۲۷
۳۔	سرعبدالقادر	دیباچہ بانگِ درا،ص:۱۵
۴۔	ایضاً	ایضاً،ص:۱۳،۱۲
۵۔	علامہ اقبال	نظم (نالہ فراق)مشمولہ مخزن مئی ۱۹۰۴ء، جلد:۶،ص:۴۵
۶۔	ایضاً	ایضاً،ص:۴۵
۷۔	پروفیسر صدیق جاوید	اقبال اور آرنلڈ مشمولہ اقبال اور مشاہیر مرتبہ طاہر تونسوی،ص:۲۳۰
۸۔	رسالہ معارف اعظم گڑھ	جولائی ۱۹۳۱ء شذرات مشمولہ اقبال اور مشاہیر، طاہر تونسوی،ص:۲۳۱
۹۔	ذکر عبدالحق	مولفہ ڈاکٹر سید معین الدین، مشمولہ،ص:۲۳
۱۰۔	لیٹر یز اینڈ رائٹنگز آف اقبال	انگریزی ص:۱۱۵ مشمولہ ایضاً

❀❀❀

کتابیات

نام کتاب	نام مصنف/مرتب	ناشر/سنہ اشاعت
اردو انسائیکلو پیڈیا	ڈاکٹر سید عبد الوحید (چیف ایڈیٹر)	فیروز سنز لمیٹڈ لاہور ۱۹۶۲ء
اردو دائرہ معارف اسلامیہ	جلد ۷، ۹، ۱۱	دانشگاہ پنجاب ۱۹۸۹ء
اطراف اقبال	ملک حسن اختر	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، اگست ۱۹۷۶ء
افغانستان کے مرد مجاہد جمال الدین افغانی	شاہد حسین رزاقی	اسلامک فاؤنڈیشن دہلی
اقبال اور عالمی ادب	عبدالمغنی	لاہور اقبال اکادمی ۱۹۹۰ء
اقبال اور عشق رسول ﷺ	سید عبدالرشید	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۷ء
اقبال اور غزل	محمد امین اندرابی (مرتب)	سرینگر اقبال انسٹی ٹیوٹ، کشمیر یونیورسٹی ۱۹۸۸ء
اقبال اور مشاہیر	طاہر تونسوی	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، جولائی ۱۹۸۱ء
اقبال اور مغربی مفکرین	جگن ناتھ آزاد	مکتبہ علم و دانش لاہور ۱۹۸۶ء
اقبال پیروی شبلی	سید افتخار حسین شاہ	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، فروری ۱۹۷۸ء
اقبال درون خانہ	خالد نظر صوفی	لاہور بزم اقبال ۱۹۷۱ء

اقبال شناسی	علی سردار جعفری	لاہور پیپر پبلشنگ ہاؤس ۱۹۷۷ء
اقبال کا ادبی مقام	خواجہ محمد زکریا	لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۷۷ء
اقبال کامل	عبدالسلام ندوی	دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء
اقبال کا نظام فن	عبدالمغنی	دہلی اردو بک فاؤنڈیشن ۱۹۸۵
اقبال کی تیرہ نظمیں	اسلوب احمد انصاری	دہلی غالب اکیڈمی ۱۹۷۷ء
اقبال کی فارسی شاعری	محمد ریاض	لاہور اقبال اکادمی ۱۹۷۷ء
اقبال کی فارسی شاعری کا تنقیدی جائزہ	احسن عبدالشکور	لاہور اقبال اکادمی ۱۹۷۷ء
اقبال کے ابتدائی افکار	عبدالحق	جمال پرنٹنگ پریس دہلی ۱۹۶۹ء
اقبال کے محبوب صوفیاء	اعجاز الحق قدوسی	اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۷۷ء
اقبال کے ممدوح علماء	افضل حق قریشی	مکتبہ دانش دیوبند (ب ت)
اقبال معاصرین کی نظر میں	سید وقار عظیم	لاہور مجلس ترقی اردو ۱۹۷۳ء
اقبال نامہ	شیخ عطاءاللہ (مرتب)	لاہور شیخ محمد اشرف 1951ء
اقبالیات کا مطالعہ	سید وقار عظیم	لاہور ۱۹۷۷ء
اکبر الہ آبادی	طالب الہ آبادی	مطبوعہ مطبع انوار احمد الہ آباد (رفعہ دوم)
اکبر اور اقبال	غلام حسین ذوالفقار	لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۷۷ء
اکبر کی نظریہ اور ظریفانہ شاعری	محمد زاہد	ایجوکیشنل بک ہاؤس ۱۹۷۹ء
الغزالی	علامہ شبلی نعمانی	شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۱۹۹۷ء
انوار اقبال	بشیر احمد ڈار (مرتب)	اقبال اکادمی لاہور مارچ ۱۹۷۷ء
اوصاف اقبال	بہار الہ آبادی (مرتب)	دہلی چمن بک ڈپو ۱۹۸۱ء

باقیات اقبال	سید عبد الواحد معنوی (ترمیم و اضافہ محمد عبداللہ قریشی)	آئین ادب لاہور ۱۹۷۸ء
پیامی شاعری (حالی، اکبر، اقبال: ایک تقابلی مطالعہ)	نصرت اندرابی	سرینگر تابش پبلکیشنز دسمبر ۱۹۹۱ء
تاریخ ادبیات ایران	رضازادہ مشفق	حیدرآباد دکن مئی ۱۹۴۹ء
تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ	(ترجمہ نذیر نیازی)	اسلامک بک سینٹر دہلی ۱۹۹۲ء
تصورات اقبال	صلاح الدین احمد	علی گڑھ ایجوکیشنل بک ہاؤس ۱۹۷۴ء
تفسیر اقبال	بہار الہ آبادی (مرتب)	گلشن پبلیکیشنز سرینگر کشمیر ۱۹۸۲ء
جدید اردو شاعری	عبدالقادر سروری	امرتسر آزاد بک ڈپو (ب ت)
حافظ اور اقبال	یوسف حسین خان	غالب اکیڈمی ۱۹۷۶ء
حیات انور	محمد ازہر شاہ قیصر	دیوبند ۱۹۵۵ء
خطوط اکبر بنام حسن نظامی	حسن نظامی	دہلی طبع سوم اپریل ۱۹۵۳ء
دائرہ معارف اقبال	ملک حسن اختر	لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۷۷ء
دیوان حافظ (مترجم)	قاضی سجاد	سب رنگ کتاب گھر دہلی ۱۹۶۲ء
دیوان حکیم سنائی	مدرس رضوی	تہران ۱۹۶۳ء
دیوان غنی	ترتیب جدید محمد امین دارب	جموں و کشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر ۱۹۸۴ء
ذکر اقبال	عبدالمجید سالک	دہلی چمن بک ڈپو (ب ت)
روزگار فقیر (حصہ اول و دوم)	فقیر سید وحید الدین	اسلامک بک فاؤنڈیشن نئی دہلی جنوری ۱۹۹۷ء
شرح ارمغان حجاز	یوسف سلیم چشتی	دہلی اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۲ء

شرح اسرار خودی	ایضاً	ایضاً جنوری ۱۹۹۸ء
شرح بال جبریل	ایضاً	ایضاً ۱۹۸۳ء
شرح بانگ درا	ایضاً	ایضاً ۱۹۷۵ء
شرح پیام مشرق	ایضاً	ایضاً ۱۹۹۳ء
شرح جاوید نامہ (اول و دوم)	ایضاً	ایضاً ۱۹۹۳ء
شرح رموز بے خودی	یوسف سلیم چشتی	دہلی اعتقاد پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۷ء
شرح ضرب کلیم	ایضاً	ایضاً ۱۹۷۶ء
طواسنین اقبال حصہ اول و دوم	ایس۔ایم۔فاروق	اقبال اکادمی پاکستان ۱۹۹۰ء
شذرات فکر اقبال	مرتبہ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال	لاہور ۲۹ ردسمبر ۱۹۷۳ء
علامہ انور شاہ کشمیری شخصیت اور کمالات	سید محمد فاروق بخاری	العمر سنٹر فار کشمیر سٹڈیز اینڈ پبلیشرز سرینگر ۱۹۸۵ء
فکر اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ۱۹۷۷ء
کلیات اقبال اردو	محمد اقبال	دہلی اعتقاد پبلشنگ ہاؤس فوری ۱۹۸۱ء
کلیات اقبال فارسی	محمد اقبال	مکتبہ نذیر دہلی ۱۹۷۱ء
کلیات سعدی	محمد علی فروغی	چھاپ اول ۱۳۲۵ء
کلیات غالب	فارسی	لاہور ۱۹۶۵ء
کلیات مکاتیب اقبال (اول، دوم، سوم)	سید مظفر حسین برنی	دہلی اردو اکادمی ۱۹۹۱ء
مطالعہ مکاتیب اقبال	محمد امین اندرابی	تابش پبلکیشنز سرینگر دسمبر ۱۹۹۱ء

معاصرین اقبال کی نظر میں	محمد عبداللہ قریشی	لاہور مجلس ترقی اردو ادب ۱۹۷۷ء
مقدمہ شعروشاعری	مولانا حالی	مکتبہ جامعہ دہلی مارچ ۱۹۸۳ء
مکمل تاریخ کشمیر	محمد الدین فوق	چنار پبلشنگ ہاؤس ۱۹۹۲ء
مہتاب داغ	نواب مرزا خان داغ	لاہور مجلس ترقی اردو ۱۹۹۲ء
نقش اقبال	سید عبدالواحد	آئینہ ادب انارکلی لاہور
نوادر اقبال بانسخہ نوادرات	عبدالغفار شکیل	سرسید بک ڈپو علی گڑھ ۱۳۷۷ھ
ھما اقبال صدی نمبر	عبدالوحید صدیقی مرتب	دہلی اگست ۱۹۷۷ء
یادگار غالب	مولانا الطاف حسین حالی	۱۹۷۷ء
English Books		
A History of Sikhs	Khuswant Singh	Vol.1. 1963 London
Guru Nanks Jap Ji by	Gursarn Singh	1972 Atma Ram & Sons Delhi
The Holy Quran	Mohammad Ali	Lahore 1951

رسائل

نمبر شمار	نام رسالہ	ماہ و سال	نام مضامین	مصنف	صفحات
۱	اقبال (مجلّہ)	اکتوبر ۱۹۶۳ء	اقبال افغانستان میں	عباداللہ فاروقی	ص ۷۸۔۹۲
۲	ایضاً	اپریل ۱۹۷۶ء	اقبال اور رومی	بشیر احمد ڈار	ص ۱۔۳۵
۳	ایضاً	اکتوبر ۱۹۵۴ء	اقبال اور کشمیر	محمد عبداللہ قریشی	ص ۵۶
۴	ایضاً	اپریل ۱۹۷۴ء جلد نمبر: ۲،۳	اقبال اور مولانا انور شاہ کاشمیری	قاضی افضل حق قریشی	ص ۹۱۔۹۸
۵	ایضاً	اکتوبر ۱۹۶۳ء جلد ا، نمبر ۴	اکبر پیش رو اقبال	غلام حسین ذوالفقار	ص ۲۷۔۳۲
۶	ایضاً	اپریل ۱۹۷۶ء	بیدل اور اقبال: ایک سرسری جائزہ	ڈاکٹر عبدالمغنی	ص ۳۱۔۴۸
۷	ایضاً	اکتوبر ۱۹۷۱ء جلد ۱۹، نمبر ۲	جمال الدین افغانی اور اقبال	محمد ریاض	ص ۱۔۳۹
۸	ایضاً	اپریل جولائی	علامہ اقبال اور اکبر الہ آبادی	رحیم بخش شاہین	ص ۱۶۱۔۲۰۴

اقبال ریویو

۹	اقبال ریویو جلد ا ش ۶	جولائی ۱۹۷۰ء	اقبال اور سعدی	محمد ریاض	ص ۲۵۔۵۴
۱۰	ایضاً	جولائی ۱۹۷۱ء جلد ۱۲ ش ۴	اقبال اور سعید حلیم پاشا	محمد ریاض	ص ۴۸۔۶۲
۱۱	ایضاً	جنوری ۱۹۶۹ء جلد ۹ نمبر ۴	اقبال اور شاہ ہمدان	محمد ریاض	ص ۶۸۔۸۰
۱۲	ایضاً	جنوری ۱۹۸۵ء	بعض شخصیات و تحریکات سے اقبال کی دلچسپی	معین الدین عقیل	ص ۱۸۱
۱۳	ایضاً	جنوری ۱۹۷۱ء	سید علی ہمدانی اور اقبال مسئلہ خیرو شر اور معرکۂ روح و بدن	بشیر احمد ڈار	ص ۳۵۔۴۷
۱۴۔	ایضاً	جنوری ۱۹۷۲ء	ایضاً	ایضاً	ص ۱۳۔۴۵
۱۵	ایضاً	جنوری ۶۲ جلد ۳ نمبر ۴	علامہ اقبال اور سلطان ٹیپو شہید	یوسف سلیم چشتی	ص ۳۲۔۵۰
۱۶	ایضاً	جنوری ۱۹۷۶ء جلد ۱۶، نمبر ۴	علامہ اقبال کا سفر افغانستان	اختر راہی	ص ۳۸۔۵۴
۱۷	ایضاً	جنوری ۱۹۷۶ء جلد ۱۶، ش ۴	میرزا عبدالقادر بیدل مطالعہ اقبال کی روشنی میں	محمد ریاض	ص ۴۷۔۶۷

۱۸	اردو ادب	جون ۱۹۵۷ء	اقبال اور شخصیتیں	عبدالغنی	ص:۵۴
۱۹	اسلام اور عصر جدید دہلی	جنوری اپریل ۱۹۷۲ء جلد۴ ش۳	سید جمال الدین افغانی واقعات کی روشنی میں	محمد نعیم صدیقی	ص۹۷_۷۹
۲۰	ایضاً	اکتوبر ۱۹۶۹ء جلد:۳	اقبال کی شاعری میں گورونانک کا مقام	حفیظ ملک	ص ۴۰_۴۵
۲۱	اقبال اور غزل	۱۹۸۸ء	مرتب محمد امین اندرابی اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی	حالی کے اثرات اقبال پر	محمد امین اندرابی ص ۱۳۶_۱۴۳
۲۲	اقبالیات سرینگر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی	مرتب آل احمد سرور شمارہ ۱، ستمبر ۱۹۸۱ء	سید علی ہمدانی کی مدح علامہ اقبال کے قلم سے	سید کمال الدین	
۲۳	چشمہ آفتاب ۱۹۹۴ء	مرتب غلام رسول ملک بشیر احمد نحوی سرینگر	اقبال شاہ ہمدان کے حضور میں	محمد امین بچھ	۱۳۴_۱۴۱
۲۴	شیرازہ	اقبال، نمبر جلد ۱۶ ش۳ تا ۶ جموں و کشمیر کلچرل اکادمی	اقبال شاہ ہمدان کے حضور میں	جگن ناتھ آزاد	۳۱

۲۵	صحیفہ لاہور	جولائی اکتوبر ۱۹۷۷ء	سید جمال الدین افغانی اور اقبال	معین الدین عقیل	۱۹۰۔۲۳۱
۲۶	ایضاً	ستمبر ۱۹۵۷ء شمارہ۲	حافظ اور اقبال کے ذہنی فاصلے	ڈاکٹر سید عبد اللہ	۹۔۲۴
۲۷	مشاہیر نمبر	۱۹۷۶۔۷۷ء ہمارا ادب جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر	حضرت میر سید علی ہمدانی	پروفیسر محمد طیب صدیقی	۱۴۲
۲۸	ایضاً	۱۹۷۶۔۷۷ء	غنی کاشمیری	محمد عبداللہ شیدا	۳۴۱
۲۹	المعارف	نومبر ۱۹۷۷ء ش ۱۱	اقبال اور انور شاہ کاشمیری	کلیم اختر	۲۷۔۳۹
۳۰	ایضاً	ایضاً	اقبال اور حب رسولؐ	جمیلہ شوکت	۴۔۱۵
۳۱	ایضاً	اگست ستمبر ۱۹۷۵ء	اقبال اور نادر شاہ	اختر راہی	۵۳۔۹۷
۳۲	ایضاً	دسمبر ۱۹۶۹ء	الغزالی	شیخ محمد اکرام	۱۵۔۲۷
۳۳	ایضاً	مئی ۱۹۷۲ء	جمال الدین افغانی کا وطن	عبدالحلیم اثر افغانی	۳۹۔۴۹
۳۴	ایضاً	دسمبر ۱۹۶۹ء	میر سید علی ہمدانی از ہمدان تا کشمیر	ڈاکٹر علی اصغر حکمت ترجمہ و توضیحات ڈاکٹر محمد ریاض	۳۔۱۴

۳۵	مخزن	مئی ۱۹۰۴ء جلد:۶	نالۂ فراق	علامہ اقبال	ص:۴۵
۳۶	مشاہیر نمبر	۷۷-۱۹۷۶ء ہمارا ادب جموں وکشمیر کلچرل اکیڈمی سرینگر	حضرت میر سید علی ہمدانی	پروفیسر محمد طیب صدیقی	۱۴۲
۳۷	ایضاً	۷۷-۱۹۷۶ء	غنی کاشمیری	محمد عبداللہ شیدا	۳۴۱
نقوش اقبال نمبر ۱،۲		۱۹۳۲ء	ادارہ فروغ اردو لاہور		
۳۸	نقوش اقبال نمبر		اقبال اور اکبر الٰہ آبادی	قاضی افضل حق قرشی	ص ۵۰۲
۳۹	ایضاً		اقبال کے استاد میر حسن کا انتقال	غلام رسول مہر	ص ۶۴۸
۴۰	ایضاً		رومی نطشے اور اقبال	خلیفہ عبدالحکیم	ص ۲۱
۴۱	ایضاً		سنائی اور اقبال	بشیر احمد ڈار	۱۰۲-۱۷۴
۴۲	ایضاً		علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء میر حسن	شیخ آفتاب احمد	ص ۴۱